اخلاقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم
کی سماجی وسیاسی زندگی
اخلاق کے آئینہ میں

تالیف

حضرت مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی
اُستاذ و مہتمم جامعہ رحیمیہ مہدیان میر درد روڈ دہلی

ایچ ایم سعید کمپنی
ادب منزل
پاکستان چوک کراچی

وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ

اخلاقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

کامل

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سماجی وسیاسی زندگی
اخلاق کے آئینہ میں

تالیف
حضرت مولانا حافظ اخلاق حسین صاحب قاسمی الدہلوی
استاذ ومہتمم جامعہ رحیمیہ مہندیان میر درد روڈ دہلی

حسب اجازت وعنایت خصوصی حضرت مؤلف مدظلہ العالی

ناشر
سعید ایچ ایم کمپنی ★ ادب منزل
پاکستان چوک کراچی

اگست ۱۹۸۶ء (مطبوعہ ایجوکیشنل پریس کراچی) قیمت روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تالیف کا مقصد

خدا کے ان بندوں تک اتمامِ حجّت کی حد تک دین کا پیغام پہنچانا جو دینِ حق کی روشنی سے محروم ہیں، ہم مسلمانوں کا اہم فریضہ ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے لکھا ہے کہ غیر مسلم طبقہ پر اتمامِ حجّت کے ۲ دو طریقے ہیں:

ایک طریقہ یہ ہے کہ ہم مسلمان اپنی علمی زندگی کو اسلام کی صداقت کا عملی نمونہ (گواہ وشاہد) بنا کر پیش کریں اور ہماری عملی زندگی میں لوگ اسلام کی برکتیں اور رحمتیں دیکھ کر اسلام کو نجات وہدایت کا راستہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقی کمالات اور معجزانہ کیریکٹر کو لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے اور ہر طبقہ کو اسکی زبان، اسکی سمجھ اور اسکی استعداد کے مطابق سمجھانے کی کوشش کیجائے تاکہ رحمۃ للعالمین اور صاحبِ خلقِ عظیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبّت لوگوں کے دلوں میں اُتر جائے اور پھر اس محبوب، شفیق، رحمدل اور محسنِ انسانیت کی زبان سے نکلی ہوئی ہر بات کو لوگ سچّا ماننے پر اپنے آپ کو مجبور پانے لگیں (فتاویٰ عزیزیہ ص ۱۴۱)

اتمامِ حجّت کے دوسرے طریقہ کے مطابق فریضۂ دعوت ادا کرنے کی غرض سے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقی کمالات پر یہ کتاب پیش کی جا رہی ہے۔

یہ معلوم ہو کر خوشی ہوئی کہ ایچ ایم سعید کمپنی کراچی کے اہتمام میں ناچیز کی تالیف اخلاقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اشاعت اچھے معیارِ کتابت وطباعت کے ساتھ ہو رہی ہے دعا ہے کہ خداوندِ عالم اس کتاب کو قبولِ عام عطا کرے اور اُمّتِ مسلمہ کو اطاعتِ رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی توفیق عطا فرمائے۔

خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے مکارمِ اخلاق کے اس مجموعہ کو قبولِ عام عطا فرمائے اور یہ مجموعہ ہر زبان میں خدا کے ہر بندے کے ہاتھ میں پہنچ جائے اور خدا تعالیٰ ہر مسلمان کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ اس کتاب کی اشاعت میں حصّہ لیکر دعوتِ دین کے اس بنیادی فریضہ کی ادائیگی میں شریک ہو اور سعادتِ دارین حاصل کرے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝

اخلاق حسین قاسمی دہلوی
حالِ مقیم، ضیاء منزل برنس روڈ کراچی
۲۳ اپریل ۸۶ء مطابق ۱۳ شعبان ۱۴۰۶ھ

ادارہ رحمت عالم
شیخ چاند اسٹریٹ ۱۸۳۸ لال کنواں۔ دہلی

فہرست مضامین اخلاقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حصہ اول و دوم

تمت بالخیر

حصہ اول سماجی زندگی

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی عظمت

دُنیا میں جب سے انسان کا وجود ہے اسی وقت سے اخلاقی تعلیم کا وجود بھی ہے، اپنے جسم کی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے انسان روٹی، پانی کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور پھر اس کے لئے محنت کرتا ہے، اسی طرح اپنی انسانیت کو زندہ رکھنے کے لئے اسے اخلاقی تعلیم اور اس پر عمل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ شروع زندگی سے لے کر آج تک سینکڑوں اخلاقی معلم اخلاقی ہدایات لے کر آتے رہے اور انھوں نے آسمانی تعلیمات کے مطابق دنیا کو اچھے اخلاق کا راستہ بتایا اور اس پر چلایا۔

اسی طرح عقل و دانش کی روشنی میں اخلاقیات کا سبق دینے والے حکمائے اخلاق بھی ہر دور میں پیدا ہوتے رہے اور اپنے اخلاقی فلسفہ سے دنیا کو اخلاق حسنہ کی روشنی پہنچاتے رہے۔

علم اخلاق کے آسمانی رہنماؤں اور معلموں میں حضرت آدمؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک بڑے بڑے اخلاقی معلم نظر آتے ہیں جن کی اخلاقی عظمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور سقراط، افلاطون اور ارسطو جیسے حکمائے اخلاق کی فلسفیانہ کاوشوں کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ آج کی دنیا کے سامنے ایسا اخلاقی معلم کون ہے جس کے پاس اخلاق حسنہ کی تعلیم اور اعلیٰ اخلاقیات کا نظام بھی مکمل طور پر موجود ہو اور اس تعلیم و فلسفہ کے مطابق عملی زندگی کے ہر شعبے کے لیے اعلیٰ اخلاق کا نمونہ بھی دُنیا کے سامنے بے نقاب ہو۔

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہندوستان، ایران اور چین میں بڑے بڑے اخلاقی معلم آئے اور تورات، و انجیل کے ہادیانِ مقدس نے بھی جو اخلاقی روشنی پھیلائی اس کے اثرات آج تک زندہ ہیں۔ لیکن بحث تو ایک اعلیٰ اور مکمل نمونہ کی ہے اور سوال تو یہ ہے کہ وہ اخلاقی معلم کون ہے جس نے زندگی کے

ہر شعبہ اور حیاتِ انسانی کے ہر گوشہ کے لئے اعلیٰ اخلاق کا نمونہ چھوڑا ہو اور تاریخ نے اس کے ایک ایک اخلاقی کردار کو پوری احتیاط سے محفوظ رکھا ہو۔

تاریخ نے ایسے کامل اخلاقی معلّم کے طور پر اگر کسی کو پیش کیا ہے تو وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اس سے کسی اخلاقی معلّم کے مرتبہ میں کمی کا خیال نہ کیا جائے، حضرت موسیٰؑ ہوں یا حضرت عیسیٰؑ ہندوستان کے کرشن جی ہوں یا مہاتما بدھ یا ایران کے زرتشت، یہ سب اخلاقی پیشوا اپنے اپنے دور میں اپنے اپنے حالات کے مطابق اپنی اپنی قوموں اور بستیوں کو اخلاقی روشنی پہنچانے کا کام پورا کر کے اس دنیا سے چلے گئے لیکن اخلاق کی تکمیل کے لئے آخر میں آنے والے اخلاقی معلّم (رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذمہ یہ کام چھوڑ گئے کہ جب انسانی زندگی اپنے پورے پھیلاؤ کے ساتھ درجۂ کمال کو پہنچنے لگے تو اس وقت وہ آخری رسول اپنی مکمل تعلیم اور مکمل سیرت کے ساتھ دنیا پر ظاہر ہو جائے اور انفرادی زندگی سے لے کر سماجی، اجتماعی اور سیاسی زندگی کے ہر گوشہ میں اعلیٰ اخلاق کا عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر دے۔

رسولِ پاک صلّی اللہ علیہ وسلّم کے متعلّق قرآنِ کریم کا اعلان

قرآن کریم نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی عظمت کے متعلق آسمانی اعلان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (سورہ ن: ۱) (اے محمدؐ!) بے شک تم اخلاق کے بڑے درجہ پر قائم ہو۔

اعلیٰ اخلاق کی تشریح کرتے ہوئے دوسرے مقام پر اعلان فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (سورۂ انبیاء) (اے محمدؐ) ہم نے تمہیں جہان والوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

اعلیٰ اور بلند اخلاق کا کمال یہ ہے کہ آپؐ کی ذاتِ گرامی تمام عالم کے لئے، تمام قوموں کے لئے اور تمام زندگی کے لئے رحمت وکرم ہے، زندگی کے ہر گوشہ کے لئے رحمت ومہر ہے۔

اس مقام کی وضاحت کرتے ہوئے سورہ آل عمران میں فرمایا ہے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران) ــــــ "خدا تعالیٰ کے کرم سے اے رسول! (صلی اللہ علیہ وسلم) تم ان لوگوں کے لئے نرم دل ہو اور اگر تم سخت مزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمہیں چھوڑ کر بھاگ جاتے، پس ان کے ساتھ عفو ودرگذر کا معاملہ کرو، ان کے لئے دعا کرو اور معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرو۔"

نرم مزاج اور نرم دل ہونا، لوگوں کے ساتھ معافی کا برتاؤ کرنا، لوگوں کے حق میں بھلائی کی دعا کرنا اور ان سے مشورہ کر کے ان کی حوصلہ افزائی اور عزت بڑھانا اخلاقِ حسنہ کی اصل روح ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی مقام "رحمۃ للعالمین" کی یہی تشریح ہے اور اسی صفت کو اعلیٰ اخلاق کی بنیاد کہا جاتا ہے۔

صاحبِ خلقِ عظیم، کامل معلمِ اخلاق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اخلاقی احساس ایک فطری احساس ہے جسے خالقِ کائنات نے ہر انسان کی فطرت میں الہام کیا ہے۔ انسانی فطرت سچائی، پاسِ عہد، امانت، رحم وہمدردی جیسی صفتوں کو پسند کرتی ہے اور ان کے مقابلہ میں ظلم، عہد شکنی، خیانت اور جھوٹ کو ناپسند کرتی ہے۔

فطرتِ انسانی کے پسندیدہ اور محبوب کاموں کا درس دینے اور ان پر خود عمل کر کے دکھانے کے لئے خدا کی طرف سے معلمینِ اخلاق ہمیشہ آتے رہے، ہر قوم اور ہر ملک میں آتے رہے۔

ان معلمینِ اخلاق میں سب سے آخری معلم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا:

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق (کنز العمال ج ۲ ص ۵) ــــــ "میں اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں" خدا تعالیٰ نے آپ کے لئے جو سب سے زیادہ پسندیدہ صفت اختیار کی اور اس صفت سے آپ کو یاد کیا وہ صفت "خلقِ عظیم" اور "رحمۃ للعالمین" کی صفت ہے۔

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (سورہ ن) ــــــ "بیشک تم اے نبی! بلند ترین اخلاق کے مالک ہو"

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (سورۃ انبیاء) ــــــ "اور ہم نے تمہیں سارے جہانوں کے لئے رحمت کا سامان بنا کر بھیجا ہے۔"

تمام معلمینِ اخلاق میں رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم "اخلاق کو مکمل کرنے والے" کا مقام کس بنا پر رکھتے ہیں اور آپ کو ایک لاکھ چوبیس ہزار رسولوں اور بیشمار مصلحین اور فلاسفۂ اخلاق اور حکماء میں یہ امتیازی مقام کس سبب سے حاصل ہوا ہے؟ اس کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان، عبادت، رضائے الٰہی، جنّت اور آخرت کی کامرانی کا دارومدار اعلیٰ اخلاق پر رکھا اور صاف صاف فرمایا:

احسنکم احسنکم اخلاقًا (حدیث) "تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہیں"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے ہر انسان کو یہ بتایا کہ خدا تعالیٰ کسی انسان سے اسی وقت راضی ہو سکتا ہے اور کوئی انسان اسی وقت عبادت گذار کہلایا جا سکتا ہے اور کسی مرد و عورت کو آخرت کی فلاح و کامرانی اسی وقت نصیب ہو سکتی ہے جب وہ خدا کی مخلوق کے حقوق اچھی طرح ادا کرے اور اسی کا نام اعلیٰ اخلاق ہے۔

یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک انسان اپنے ہم جنسوں، بھائی بندوں، پڑوسیوں اور شہریوں کیساتھ تو بُرا سلوک کرے، ان کی مصیبتوں میں ان کے کام نہ آئے، ان کے دُکھ درد میں شریک نہ ہو اور اسے خدا کی محبت اور رحمت حاصل ہو جائے؟ یہ نہیں ہو سکتا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی وہ اخلاقی کارنامہ ہے جو آپؐ سے پہلے کہیں نظر نہیں آتا اسلام سے پہلے ایک انسان اپنے ہم جنسوں اور بھائی بندوں سے بالکل کنارہ کش اور بے تعلق ہو کر جنگلوں میں رہتا تھا اور وہ خدا کی محبت کا حق دار بن جاتا تھا۔

حضرت عیسیٰؑ کے راہبوں، مہاتما بدھ کے بھکشوؤں اور جوگیوں کا یہی خیال تھا اور یہی انکی تعلیم تھی۔ اخلاقِ انسانی کی یہ تعلیم اپنے دور کے لحاظ سے درست ہو گی لیکن انسانی ترقی اور انسانی تعلقات کی وسعت اور پھیلاؤ کے دور میں اسی تعلیم کی ضرورت تھی جو آخری معلّمِ اخلاق نے پیش کی۔

اور یہی تکمیلِ اخلاق کا مطلب ہے۔

۲۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیم کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ آپؐ نے اخلاقِ حسنہ

کا اصل مقصود خدا کی خوشنودی حاصل کرنا قرار دیا اور فرمایا:

اخلصوا اعمالکم فان اللہ لا یقبل الا من خالص لہ (حدیث) ——— "اپنے نیک اعمال میں اخلاص پیدا کرو کیونکہ خدا تعالیٰ وہی نیکیاں قبول کرتا ہے جو اس کی رضامندی کے لیے کی جاتی ہیں۔"

مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کے ساتھ نیک اخلاق اختیار کرو اور اس سے تمہارا مقصد صرف یہ ہو کہ تمہارا خدا تم سے خوش ہو جائے۔ کسی پر احسان رکھنے اور اس سے بدلہ چاہنے کے لئے کسی کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا اعلیٰ اخلاق کی روح کے خلاف ہے۔

اخلاص وللّٰہیت کی یہ وہ تعلیم ہے جس سے اخلاقی ترقی کے امکانات کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

قرآنِ کریم کی سب سے پہلی وحی اور پہلے فرمانِ الٰہی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی گئی تھی۔

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (سورۂ مدثر) ——— "اے نبی! (صلی اللہ علیہ وسلم) تم کسی پر اس لئے احسان نہ کرو کہ اس سے زیادہ بدلہ چاہو۔"

اسی حکم کی تعمیل میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام زندگی اخلاص، سچائی اور بے غرضانہ انسانی محبت کا مکمل نمونہ نظر آتی ہے۔

۳۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیم کی تیسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آپؐ نے خدا اور آخرت کے خوف سے لوگوں میں اخلاقِ حسنہ پر چلنے کی رغبت اور آمادگی پیدا کی، پولیس اور فوج کا خارجی دباؤ ہر وقت انسان پر قائم نہیں رہ سکتا لیکن خدا کا خوف اور آخرت کا یقین ہر لمحہ انسان کے اندر موجود رہتا ہے اور انسان کو ظلم و زیادتی سے بچا کر رحم و انصاف پر آمادہ کرتا ہے۔ قرآنِ کریم لوگوں سے کہتا ہے:

مَا يَكُونُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَا اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا (سورۂ مجادلہ: ۷) ——— "تین آدمی جب آپس میں سرگوشی کرتے ہیں تو چوتھا ان میں خدا ہوتا ہے اور جب پانچ آدمی کانا پھوسی کرتے ہیں تو چھٹا ان میں خدا ہوتا ہے اور اس سے کم ہوتے ہیں یا اس سے زیادہ، ہر حال میں اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔"

دوسری جگہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ (سورۂ ق) ——— "کوئی لفظ ان کے منہ سے نہیں نکلتا مگر اس کی نگہبانی کرنے والا محافظ موجود رہتا ہے"۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے ہر انسان کے قول و عمل کی دیکھ بھال، ہر برائی اور بھلائی پر جزا اور سزا کا اعلان، انسان کے دل میں ہر وقت، رات ہو یا دن، جلوت ہو یا خلوت، اندھیرا ہو یا اجالا، اپنے علیم و خبیر مالک کا خوف قائم رکھتا ہے۔ اور یہی خوف و تقویٰ اخلاق کے لئے قوتِ نافذہ ہے جو کسی خارجی دباؤ کے بغیر انسان سے اس کی پابندی کراتی ہے اور اسے زندگی میں نافذ اور جاری کراتی ہے۔

اور پھر اس خوفِ خدا کے ذریعے اس کے اخلاقی احساس میں اتنی تازگی اور قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ ذرا سی تنبیہہ سے اس کا اخلاقی ضمیر جاگ اٹھتا ہے اور معمولی سی برائی سے اس کے دل میں ندامت چٹکیاں لینے لگتی ہے، قرآنِ کریم نے اخلاقی احساس کی اسی کیفیت کے متعلق کہا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۝

(سورۂ اعراف) ——— "بے شک متقی اور ڈرنے والے وہ لوگ ہیں کہ جب کوئی شیطان انہیں چھوتا بھی ہے تو وہ چونک اٹھتے ہیں اور اسی وقت ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں"۔

۴۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چوتھی اور سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انفرادی اور سماجی تعلقات کے ساتھ ساتھ اجتماعی اور سیاسی معاملات میں اخلاق و شرافت کا اعلیٰ معیار قائم کیا۔

گھر والوں کے ساتھ، پڑوسیوں کے ساتھ اور بے ضرر شہریوں کے ساتھ اچھے اخلاق کا معاملہ کرنا زیادہ مشکل نہیں ہے لیکن سیاسی دشمنوں کے ساتھ اور حملہ آور معاندوں کے ساتھ رحم و کرم اور شرافت و انسانیت کا اعلیٰ برتاؤ کرنا بہت بڑے ظرف اور بہت اعلیٰ فطرت کی بات ہے۔ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اخلاق و شرافت کے اسی مشکل ترین کام کو آسان بنا کر دکھایا اور جس طرح خون کے رشتہ داروں کے ساتھ پیار و محبت کا برتاؤ کیا اسی طرح خون کے پیاسوں پر رحم و کرم کی بارش فرمائی۔

رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اخلاقی تعلیمات

جود و کرم، صدقہ، خیرات، مالی امداد

۱۔ السخی قریب من اللہ، قریب من الناس، قریب من الجنۃ والبخیل بعید من اللہ، بعید من الناس، بعید من الجنۃ، قریب من النار[۱] ——— "سخاوت کرنے والا، خدا سے قریب ہے، لوگوں سے قریب ہے اور جنت سے بھی قریب ہے اور کنجوسی کرنے والا، خدا سے دُور ہے، لوگوں سے دُور ہے، جنت سے دُور ہے اور دوزخ سے قریب ہے۔"

۲۔ من کان عندہ فضل ظھر فلیعد بہ علی من لا ظھر لہ ومن کان عندہ فضل زادٍ فلیعد بہ علی من لا زاد لہ حتی ظننا انہ لا حَقَّ لِاَحَدٍ منا فی الفضلِ[۲] ——— "جس شخص کے پاس سواری زائد ہو تو وہ اسے دے دے جس کے پاس سواری نہ ہو اور جس کے پاس ضروریاتِ زندگی کا سامان زائد ہو تو وہ اسے دے دے جس کے پاس سامانِ زندگی نہ ہو حدیث کے راوی حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ آپ کی اس ہدایت سے ہم نے یہ خیال کیا کہ ہم میں سے کسی کو اپنے زائد از ضروریات سامان پر کوئی حق نہیں۔"

زہد، ایثار، قناعت اور سادگی:

علیکم بالقناعۃ فان القناعۃ مال لا یَنفَدُ[۳] ——— "قناعت کو لازم پکڑلو، کیونکہ قناعت ایسی دولت ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی۔"

طوبیٰ لمن ھدی الاسلام وکان عیشہ کفافاً وقَنَعَ[۴] ——— "خوشخبری ہے اُس شخص کے لیے جسے اسلام کی ہدایت دی گئی اور اس کی زندگی بقدرِ ضرورت ہے اور وہ قناعت اختیار کرتا ہے۔"

---

[۱] تیسیر الوصول ج ۲ ص ۸۸، [۲] ایضاً ج ۲ ص ۹۱ و المنتخب من السنہ ج ۲، ص ۲۲۴ عن مسلم و مسند احمد

[۳] کنز العمال ج ۲ ص ۸۰ [۴] احیاء العلوم ج ۳ ص ۲۰۶

عفت، نیک چلنی، کیریکٹر کی بلندی:

لیس المؤمن بالطعان ولا اللعان ولا الفاحش ولا البذی[1] (ترجمہ) "وہ شخص مومن نہیں جو کسی کو عیب لگائے، چغل خوری کرے یا کسی کو طعنہ دے اور نہ وہ شخص مومن ہے جو کسی کو گالیاں دے، کسی کو شرمندہ کرے، کسی کو دھتکارے اور نہ وہ مومن ہے جو بدزبانی کرے، بے حیائی کرے، بدکاری کرے، اور نہ بداخلاق، بدزبان اور بدچلن"

صدق، سچائی:

تحروا الصدق وان رأیتم فیه الهلکة فان فیه النجاة واجتنبوا الکذب و ان رأیتم فیه النجاة فان فیه الهلکة[2] —— "سچائی کا ارادہ کرو، سچائی پر قائم رہو اگرچہ تمہیں اس میں ہلاکت نظر آئے، کیونکہ اس میں نجات ہے اور جھوٹ سے دور رہو اگرچہ اس میں تمہیں نجات نظر آئے، بے شک اس میں ہلاکت ہے۔"

لا یحل الکذب الا فی ثلاث، یُحدِّثُ الرجلُ امرأته لیرضیها والکذبُ فی الحربِ وفی الاصلاح بین الناس[3] —— "تین موقعوں پر جھوٹ بولنے کی اجازت ہے، شوہر اپنی بیوی کو راضی کرنے کے لئے بولے، میدانِ جنگ میں اور لوگوں کے درمیان صلح صفائی کرانے کے لئے۔"

امانت و دیانت:

لا ایمان لمن لا امانة له ولا دین لمن لا صلاة له[4] —— "اس شخص کے پاس کمالِ ایمان نہیں جو امانت والا نہیں اور اس کا دین کامل نہیں جو نماز پڑھنے والا نہیں۔"

صبر و تحمل:

الصبر من الایمان بمنزلة الروح من الجسد[5] —— "ایمان کیلئے صبر ایسا ہے جیسے جسم کے لئے روح۔"

الصبر نصف الایمان[6] —— "صبر آدھا ایمان ہے۔"

---

[1] احیاء ج ۳، ص ۱۰۴ [2] کنز العمال ج ۲، ص ۴۲ [3] فتح الباری ج ۶، ص ۱۱۹ [4] کنز العمال ج ۲، ص ۱۵ [5] کنز ج ۲، ص ۶۲ [6] کنز ج ۲، ص ۵۲

حلم وبردباری:

ان الرجل لیدرک بالحلم درجۃ الصائم القائم[۱] (ترجمہ) "بیشک ایک شخص حلم وبردباری کے سبب ہمیشہ روزہ رکھنے والے کے برابر درجہ حاصل کر لیتا ہے۔"

عفو ودرگذر:

ان اللہ عفوٌّ یحب العفو[۲] ——— "بیشک اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور درگذر کرنے والا ہے اور معاف کرنے کو پسند کرتا ہے۔"

رحم اور نرمی:

من لم یَرحم لم یُرحم[۳] ——— "جو شخص لوگوں پر رحم نہیں کرتا، اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا۔"

ان اللہ یحب الرفقَ فی الامر کلہ[۴] ——— "بے شک اللہ تعالیٰ تمام کاموں میں نرمی کو پسند کرتا ہے۔"

امن پسندی، صلح جوئی:

ایاکم وسُوءَ ذات البین فانھا الحالِقۃُ[۵] ——— "خبردار! آپس کے جھگڑے سے دور رہو، بے شک وہ برباد کرنے والا کام ہے۔"

افضل الصدقۃِ اصلاحُ ذاتِ البَیْنِ[۶] ——— "بہترین صدقہ آپس میں صلح صفائی کرانا ہے۔"

شرم وحیاء:

الحیاءُ شعبۃٌ من الایمان[۷] ——— "شرم وحیاء ایمان کا شعبہ ہے۔"

الحیاءُ خیرٌ کلہ[۸] ——— "حیاء کلی طور پر خیر وفلاح ہے۔"

تواضع وخاکساری:

مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَہُ اللّٰہُ[۹] ——— "جو شخص اللہ کی رضا کے لئے تواضع وخاکساری

---

۱ کنز ج ۲، ص ۳۵ ۲ کنز ج ۲، ص ۳۰ ۳ فتح المبدی ج ۳، ص ۳۰۳ ۴ فتح المبدی ج ۳، ص ۳۰۵ ۵ جامع الصغیر ج ۱، ص ۱۰ ۶ فتح ج ۲، ص ۲۳ ۷ کنز ج ۲، ص ۲۶ ۸ کنز ج ۲، ص ۲۵ ۹ احیاء ج ۲، ص ۱۴۱

اختیار کرتا ہے اسے خدا تعالیٰ بلند کر دیتا ہے"۔

لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ فِي قَلْبِهٖ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ مِّنْ كِبْرٍ[1] ـــــــ "وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرّہ برابر غرور ہوگا"۔

پابندی عہد:

عِدَةُ الْمُؤْمِنِ دِيْنٌ وَعِدَةُ الْمُؤْمِنِ كَالْاَخْذِ بِالْيَدِ[2] ـــــــ "مومن کا وعدہ دین ہے اور مومن کا وعدہ ایسا ہے جیسے اس نے ہاتھ پکڑ لیا"۔

دنیوی محنت وکسب:

خیرکم من لم یدع اٰخرتہ لدنیاہ ولا دنیاہ لاٰخرتہ[3] ـــــــ "تم میں سے بہترین آدمی وہ ہے جو آخرت کو دنیا کی وجہ سے نہ چھوڑے اور نہ دنیا کو آخرت کیوجہ سے ترک کرے"۔

خوش طبعی:

لا خیر فیمن لا یُطرِبُ ولا یُطرَبُ[4] ـــــــ "اس شخص میں کوئی خیر نہیں جو نہ تو خود خوش رہتا ہے اور نہ دوسروں کو خوش کرتا ہے"۔

کل معروف صدقۃ ومن المعروف ان تلقی اخاک بوجہٍ طَلِقٍ[5] ـــــــ "نیکیوں میں شامل ہے کہ تم اپنے بھائی سے ملے تو تیرا چہرہ خوش وخرم ہو اور خندہ پیشانی کیساتھ ملے"۔

عدل وانصاف:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ[6] ـــــــ "مسلمانو! کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم ان کے ساتھ بے انصافی کرنے لگو، انصاف کرو، وہ پرہیزگاری کے قریب ہے خدا سے ڈرو، بے شک خدا تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے"۔

الظلم ظلمات یوم القیامۃ[7] ـــــــ "ظلم قیامت کے دن تاریکیاں بن کر نمودار ہوگا"۔

---

[1] ج ۲ ص ۲۳۸ [2] فتح المبدی ج ۲، ص ۲۳۸ [3] کنز ج ۲ ص ۱۵۱ [4] المنتخب من السنۃ ج ۲، ص ۲۹۸ [5] ... [6] سورہ مائدہ [7] فتح المبدی

مساوات واخوت:

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ [1] ——— "اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد و عورت سے پیدا کیا اور تم کو مختلف خاندانوں اور برادریوں میں تقسیم کر دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو (تعارف کا ذریعہ بنا لو) بے شک تم میں بزرگ وہ ہے جو پرہیز گار ہے"۔

الناس کلھم سواء کاسنان المشط [2] ——— "تمام انسان آپس میں برابر ہیں جسطرح کنگی کے دانتے" (دندلنے)۔

ان ربکم واحد، وان اباکم واحد، ولا فضل لعربی علی عجمی ولا عجمی علی عربی ولا احمر علی اسود ولا اسود علی احمر الا بالتقوٰی، ان اکرمکم عند اللہ اتقکم، الا ھل بلغتُ؟ فلیبلغ الشاھد الغائب [3] ——— "لوگو! تمھارا پروردگار ایک ہے اور تمھارا باپ بھی ایک ہے اور کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر اور نہ کسی سُرخ کو کالے پر اور نہ کالے کو سُرخ پر فضیلت حاصل ہے مگر تقوٰی سے، بے شک تم میں اللہ کے نزدیک بزرگ وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے، کیا میں نے تمھیں پہنچا دیا؟ پس ہر حاضر کو چاہیے کہ وہ غیر حاضر کو میری بات پہنچا دے"۔ (آخری حج سے واپس آتے ہوئے مسلمانوں کے بہت بڑے اجتماع میں حضور ﷺ نے یہ تقریر فرمائی)۔

شجاعت وقوت:

وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ (الآیہ) ——— "جتنی قوت و طاقت تم پیدا کر سکتے ہو وہ پیدا کرو"۔

المومن القوی خیر و احب الی اللہ من المومن الضعیف افضل الجھاد کلمۃ حق عند سلطانٍ جائرٍ [4] ——— "طاقت ور مومن بہتر ہے، کمزور مومن سے، اور خدا کو پسند ہے بہترین جہاد حق بات کہنا ہے ظالم حاکم کے سامنے"۔

---

[1] سورہ حجرات [2] کنز ج ص ۲۲ [3] کنز العمال ج ۲، ص ۲۲ [4] مسلم کتاب القدر

مشورہ:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (الآیہ) ——— "اے نبی! تم اپنے رفیقوں سے مشورہ کیا کرو۔"

اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ [1] ——— "جس سے مشورہ لیا جاتا ہے وہ صاحب امانت ہوتا ہے" (پس غلط مشورہ دے کر وہ خیانت کا ارتکاب نہ کرے)۔

اذا کان امراءکم خیارکم و اغنیاءکم اسخیاءکم و امرکم شوریٰ بینکم فظهر الارض خیر من بطنها و اذا کان امراءکم شرارکم و اغنیاءکم بخلاءکم و امرکم الی نساءکم فبطن الارض خیر من ظهرها [2] ——— "جب تمہارے امیر، تم میں سے بہتر لوگ ہوں اور تمہارے مالدار سخی ہوں اور تمہارے معاملات مشورہ پر ہوں تو تمہارے لئے زمین کے اوپر زندہ رہنا، زمین کے اندر دفن ہونے سے بہتر ہے اور جب تمہارے امیر، برے لوگ ہوں اور تمہارے مالدار کنجوس لوگ ہوں اور تمہارے معاملات عورتوں پر چلیں تو تمہارے لئے زمین کے اندر کا حصہ اوپر کے حصے سے بہتر ہے۔"

اقتصادی خوشحالی:

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ [3] ——— "جب تم نماز جمعہ سے فارغ ہو جاؤ تو خدا کی زمین میں پھیل جاؤ اور خدا کا فضل (روزی) تلاش کرو۔"

نعم العون علی تقوی اللہ المال [4] ——— "بہترین مددگار تقویٰ کا مال ہے" (مال سے خیر خیرات، حج و زکوٰۃ اور اہل و عیال اور دوسرے ضرورت مندوں کی کفالت کی جاتی ہے، مال سے تعلیم و جہاد کا انتظام ہوتا ہے)۔

---

[1] البیان والتبعین [2] مشکوٰۃ [3] سورۂ جمعہ [4] کنز۔ من جابر رض

نبوّت سے پہلے چالیسؔ سالہ اخلاقی کردار

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے عام دستور کے مطابق چالیس سال کی عمر میں منصب رسالت پر فائز ہوئے نبوت سے پہلے کا یہ لمبا دور آپؐ نے کس طرح گذارا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چالیس سال کے بعد معلّم اخلاق ہو کر نمودار ہونا تھا، اس لئے اس چالیس سالہ دور میں خدا تعالیٰ نے آپؐ کو نہایت بلند اخلاقی کردار پر قائم فرمایا۔ اس دور میں آپؐ کے اخلاق میں صداقت، امانت، شرافت اور خدمت کے اوصاف اس قدر نمایاں ہوئے کہ آپؐ پوری قوم میں ایک غیر معمولی انسان نظر آنے لگے ــــــ عبداللہ کا یہ لال جب بطنِ مادر میں آیا تو اس کی قوم قحط اور خشک سالی کا شکار تھی۔ اس نورانی بچّہ کی آمد کی برکت سے مکہ کی خشک زمین سرسبز و شاداب ہو گئی۔ قریش نے اس سال کو فتح وابتہاج کا سال قرار دے دیا۔

پھر جب یہ بابرکت بچّہ عالمِ وجود میں آیا تو بی بی آمنہ نے دیکھا کہ روشنی نمودار ہوئی جس نے مشرق سے مغرب تک ساری فضا کو روشن کر دیا۔ چچا عباس نے ایک شعر میں اپنے بھتیجے کے متعلق کہا:

وانت لما ولدت اشرقت الارض واضاءت بنورك الافق ــــــ "اور جب آپؐ پیدا ہوئے تو ساری زمین روشن ہو گئی اور آپؐ کے نور سے سارا عالم منور ہو گیا۔"

آمنہ کے اس لال کو دودھ پلانے والی رضاعی ماں دائی حلیمہ کا بیان ہے کہ ہمارے قبیلہ بنی سعد میں قحط پڑا ہوا تھا اس لئے ہمارے قبیلہ کی عورتیں مکہ کے رئیس گھرانے کے بچوں کو دودھ پلانے کے لئے مکہ معظمہ آئیں۔ خود جنابہ حلیمہؓ کا دودھ خشک ہو گیا تھا اور ان کی اونٹنی کے تھن سوکھ گئے تھے جب حلیمہؓ اس دُرِّ یتیم کو ساتھ لے کر چلیں تو راستہ میں اس بچّہ کی برکتیں ظاہر ہونی شروع ہو گئیں۔ حلیمہؓ کی چھاتیاں دودھ سے بھر گئیں اور ان کے لڑکے عبداللہ اور رضاعی بیٹے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دونوں نے خوب سیر ہو کر دودھ پیا۔ حلیمہؓ جب گھر پہنچیں تو ان کے شوہر حارث نے کہا حلیمہ دیکھو!

ہماری اونٹنی کے تھن کس طرح سے بھرے ہوئے ہیں۔

رومانیہ کے نومسلم عیسائی ادیب، کونستان جارج نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر ۲۲ سال کی محنت کے بعد ایک کتاب (پیغمبر اسلام) لکھی ہے اس میں یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے۔

رضاعت کے زمانہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شق صدر کا واقعہ پیش آیا جس میں فرشتگانِ الٰہی نے اس بچّہ کا سینہ چاک کر کے اخلاقی علم و حکمت کی امانت اس بچّہ کے سپرد کی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا جناب عبد المطلب اپنی قوم کے سردار تھے۔ آپ کی مسند حرم شریف کی دیوار کے نیچے بچھائی جاتی تھی اور آپ کی ساری اولاد مسند کے چاروں طرف فرش کے اوپر بیٹھتی تھی۔ اس حالت میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے تو آپؐ بلا تکلف دادا کی گدی پر بیٹھ جاتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اس کو بے ادبی سمجھ کر آپؐ کو روکنا چاہتے مگر جناب عبد المطلب فرماتے، میرے بیٹے کو میرے پاس آنے دو، خدا کی قسم! اس کی شان ہی کچھ اور ہے۔ حضرت عباس رضؓ نے ایک قصیدہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بابرکت ذات کی تعریف میں ایک شعر یہ بھی کہا ہے۔

وابیض یستسقی الغمام بوجھہ ثمال الیتامیٰ عصمۃ للارامل (زرقانی ج ۱ ص ۲۲۲) ——— "آپؐ صاحب حسن و جمال ہیں، آپؐ کے روئے انور کے طفیل بارش کی دعا کی جاتی ہے، آپؐ یتیموں کی پناہ اور بیواؤں کے محافظ ہیں"

آخری مصرع میں آپؐ کے اخلاقی کردار کو خراجِ تحسین ادا کیا گیا ہے۔

یتیمی کا داغ:

نبوت کی تاریخ میں ایک بچّہ (موسیٰؑ) وہ تھا جو ماں باپ کی آغوشِ محبت سے جدا کر کے دشمن کی گود میں پہنچا یا گیا اور خدا تعالیٰ نے اس بچّہ کے چہرہ پر محبت بکھیر دی تاکہ اس کے دشمن اس پر ہزار جان سے عاشق ہو جائیں۔ قرآن نے کہا۔

وَاَلْقَیْتُ عَلَیْکَ مَحَبَّۃً مِّنِّیْ وَلِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ (سورہ طٰہٰ) ——— "اور میں نے اے موسیٰؑ! تجھ پر محبت کا سایہ ڈال دیا تھا تاکہ تو میری آنکھوں کے سامنے پرورش پائے"

شاہ ولی اللہؒ نے محبت کا ترجمہ قبولیت کیا ہے اور شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے لتصنع کا ترجمہ کیا ہے "تا کہ تیار ہو تو میری آنکھ کے سامنے"۔ تیار ہو، کا لفظ پرورش سے زیادہ جامع اور وسیع ہے۔ یعنی جو کام موسیٰؑ کو آگے چل کر کرنا تھا اس کی تیاری شاہی محل کے اندر ہی ہو سکتی تھی یہاں حضرت موسیٰؑ کو شاہی غذائیں ملیں جس سے موسیٰؑ کے جسم میں طاقت آئی۔ شاہی محل کا خوف دل سے نکل گیا فرعونی حکومت کی برائیاں شروع ہی سے موسیٰؑ کی آنکھوں کے سامنے آنے لگیں۔

رہا یہ سوال کہ خدا تعالیٰ نے کس پرورش کو "اپنی آنکھوں کے سامنے" سے تعبیر کیا ہے؟ تو ظاہر ہے کہ ماں کی آغوش سے دور دشمن کی گود میں جو پرورش ہونے والی تھی اس کی طرف اشارہ کر کے اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا کہ جس خاص بندے کو ہم ظاہری سہاروں سے محروم کر دیتے ہیں اسے اپنی خصوصی نگرانی میں لے لیتے ہیں اور وہ ہماری خاص رحمت کے سایہ میں پروان چڑھتا ہے۔

اسی سنت الٰہی کے تحت موسیٰؑ فرعون کی گود میں پل کر جوان ہوتے اور حضرت یوسفؑ نے زندانِ مصر میں جوانی کی سخت منزلوں کو طے کیا اور اسی قانونِ قدرت کے تحت عبداللہ کا چشم و چراغ دُرِّ یتیم بنایا گیا۔ یہ دُرِّ یتیم بی بی آمنہ کے شکم میں آیا نہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ یہ درِ یتیم چھ سال کا ہوا تو ماں کے سایۂ عاطفت سے بھی محروم ہو گیا۔ دو سال دادا نے سرپرستی کی مگر خدا کو یہ ظاہری سہارا بھی گوارا نہ ہوا اور دادا خدا کو پیارے ہو گئے۔ پھر پھوپی ام ایمن اور چچا ابو طالب نے اس دُرِّ یتیم کی خدمت کر کے اپنے لئے سعادت کا سرمایہ جمع کیا۔

یہ درِ یتیم اپنے پہلو میں حساس دل رکھتا تھا۔ پھر ماں باپ کی جدائی کا غم اسے کیوں محسوس نہ ہوتا؟ رومانیہ کا یہ نو مسلم عیسائی مؤرخ اس دُرِّ یتیم کے احساسِ غم پر لکھتا ہے "موت کے وقت جو لوگ حضرت آمنہ کے پاس موجود تھے انھوں نے دیکھا کہ کمسن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) موت کی بے ہوشی کے عالم میں اپنی ماں کے کلیجے سے لپٹے ہوئے کہہ رہے ہیں "اماں! تم جواب کیوں نہیں دیتیں، خاموش کیوں ہو گئیں؟" لیکن جنابہ آمنہ کی روح پرواز کر چکی تھی۔

اسی طرح جب لوگ حضرت آمنہ کو دفن کر کے واپس آنے لگے تو دیکھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) موجود

نہیں ہیں۔ اِدھر اُدھر تلاش کیا تو اس غم زدہ بچہ کو اپنی ماں کی قبر کے پاس روتے ہوئے دیکھا اور اس وقت آپؐ کی زبانِ مبارک سے یہ جملے نکل رہے تھے۔" اماں! تم گھر کیوں نہیں چلتیں؟ شاید تم کو معلوم نہیں کہ تمہارے سوا میرا کوئی نہیں"۔ (پیغمبر اسلام ص ۳۰)

معصوم جوانی، قوت، امانت اور خدمت:

ہونے والے رسول اور معلم اخلاق کا بچپن اپنے اندر غیر معمولی برکت رکھنے کی وجہ سے اپنے ماحول میں، الگ اور ممتاز نظر آتا ہے اور اس کی جوانی، قوت، امانت اور خدمت کا اعلیٰ نمونہ ہونے کے سبب اس کی صداقت کا کھلا نشان بنتی ہے اور نبی منصب نبوت پر سرفراز ہو کر اپنے اسی اعلیٰ کردار کو دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے۔

نبوت کی پچھلی تاریخ میں جوانی کے دو کردار بہت مشہور ہیں، ایک کردار حضرت موسیٰؑ کا اور دوسرا حضرت یوسفؑ کا۔ حضرت یوسفؑ کا اخلاقی کردار امانت اور خدمت میں نمایاں شہرت رکھتا ہے۔ یوسفؑ ایک صاحبِ جمال نوجوان ہیں اور ایک صاحبِ جمال مصری خاتون (زلیخا) کے گھر میں ایک غلام کی حیثیت سے زندگی گذار رہے ہیں اور اس عورت کے ممنونِ احسان ہیں مگر جب وہ عورت اپنے اس پروردہ غلام کو دعوتِ عیش دیتی ہے تو یوسفؑ معاذ اللہ کہہ کر وہاں سے بھاگ پڑتے ہیں۔ پھر اس کے نتیجہ میں جیل خانہ کی مشقت کا دور آجاتا ہے۔ یوسفؑ جیل خانہ میں نہایت صبر و استقلال کے ساتھ قیدیوں کی خدمت کرتے ہیں اور ان میں دعوتِ حق پھیلاتے ہیں۔ یہ امانت، شرافت اور خدمت کا اعلیٰ کردار ہے۔

دوسرا اخلاقی کردار جسے قرآنِ کریم نے نمایاں کر کے پیش کیا ہے حضرت موسیٰؑ کا ہے۔ یہ قوت، امانت اور خدمت کی تینوں صفتوں کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ حضرت موسیٰؑ جس بادشاہ کی گود میں پلے ہیں اس بادشاہ کے مظالم اپنی قوم کے اوپر دیکھ کر بیتاب ہو جاتے ہیں اور ایک موقع پر ایک قبطی کو طمانچہ مار کر بے جان کر دیتے ہیں۔ یہ قوت اور جوش و جلال تھا۔ پھر اس جوشِ حق کی پاداش میں وطن سے نکالے جاتے ہیں اور حضرت شعیبؑ کے گھرانے کی خدمت کرتے ہیں۔ شعیبؑ کی بیٹی مصری نوجوان کو کنوئیں پر

پانی پلاتا دیکھ کر باپ سے کہتی ہے۔

اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ (سورۂ قصص) ——— "اے باپ! بلاشبہ اچھا ملازم وہ ہے جو طاقت ور اور امانتدار ہو"

یہ نوجوان شعیبؑ کے گھر کی خدمت انجام دینے پر مقرر ہو جاتا ہے اور اس طرح پیغمبر کی تربیت میں رہ کر اپنے اخلاقی کردار کو پختہ کرتا ہے۔

اب نوجوان ہاشمی کو دیکھو! یہ کس ماحول میں آنکھیں کھولتا ہے؟ ایک تاریک ماحول ہے، چوری، شراب اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے، قومی شاعر اپنی بہنوں سے عشق بازی کرتے ہیں اور اس پر شاعری کرتے ہیں۔ بیٹا اپنی سوتیلی بیوہ ماں سے شادی کرتا ہے۔ اس گندے معاشرے میں یہ ہاشمی نوجوان طاقت اور حسن و جمال کا پیکر ہے اور پھر تہذیب و شائستگی کا پتلا ہے۔ اس کا دل، اس کی نگاہ اور اس کے جذبات بے داغ ہیں، اس کا بہترین مشغلہ خلقِ خدا کی خدمت اور تلاشِ حق ہے۔

یوسفؑ کی شرافت اور موسیٰؑ کا جلال اس کے اعلیٰ اخلاقی کردار پر قربان ہے۔ قوم اسے "الامین" کہہ کر پکارنے لگتی ہے اور اس کے اعلیٰ اخلاقی کردار کو خراجِ تحسین پیش کرتی ہے۔

شرم وحیا:

یہ بے حیا معاشرہ ہے۔ یہ لوگ کعبہ کے اندر ننگے ہو کر طواف کرنے کو عبادت شمار کرتے ہیں، لیکن یہ ہاشمی بچہ کس قدر حیادار طبیعت رکھتا ہے۔ کعبہ کی تعمیر کے موقع پر یہ اپنے بزرگوں کے ساتھ سر پر پتھر اٹھا اٹھا کر لا رہا تھا، نرم و نازک جسم تھا، چچا عباس کو ترس آیا کہ کہیں اس جسم نازک پر خراش نہ آجائے، اس خیال سے اس باحیا بچہ کا تہبند کھول کر اس کے سر پر باندھ دیا تاکہ سر کی حفاظت رہے، بس کیا تھا، ستر کھلتے ہی یہ بچہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا، اس کی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں، چند منٹ کے بعد ہوش آیا تو آنکھیں کھولتے ہی فرمایا، میرا تہبند، میرا تہبند، چچا دوڑے اور بھتیجے کے تہبند باندھ دیا۔ (فتح الملہم جلد ۱ ص ۴۸۳)

ابو طفیل کا بیان ہے کہ آپؐ کو غیب سے آواز سنائی دی "یا محمد عورتان"، محمد! اپنی شرم گاہ کا خیال رکھو، ستر کی حفاظت کرو۔ عالمِ غیب کی یہ پہلی آواز تھی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سُنی۔

جوانی میں ضبطِ نفس اور پاکبازی:

اس ہاشمی نوجوان نے جوانی میں نفسانی خواہش پر ضبط اور کنٹرول کی جو مثال قائم کی وہ یوسفؑ کی پاکبازی سے زیادہ حیرت انگیز ہے۔ ۲۵ سال کی عمر تک کا زمانہ جوانی کی رنگین اُمنگوں اور حسین ولولوں کا زمانہ ہوتا ہے۔ یہ سارا دور اس جوان نے مجرد رہ کر گذارا اور اخلاقی کریکٹر اس قدر پاکیزہ رکھا کہ کسی دشمن کو اُنگلی رکھنے کا موقع نہ ملا۔ ابوجہل اور اس کی پارٹی نے سخت سے سخت مخالفت کی۔ دیوانگی، جنون اور کہانت کے بے بنیاد الزامات لگائے مگر اس صاف ستھرے نوجوان کے اخلاق پر طعنے کرنے کی کسی کو جرأت نہ ہو سکی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چال چلن پر اگر یہ مخالف ذرا سا بھی داغ پا لیتے تو آپؐ کے شخصی وقار کو گرانے کے لئے میل کا بیل اور تنکے کا شہتیر بنا دیتے لیکن جہاں اس کی جوانی چاند سورج سے زیادہ روشن پھولوں سے زیادہ پاکیزہ اور معطر تھی وہاں دشمن زبان کھولتے تو کس طرح۔

۲۵ سال اس طرح پاکبازی کے ساتھ گذار کر یہ نوجوان کسی دوشیزہ لڑکی سے نہیں بلکہ ایک بیوہ عورت (خدیجہ کبریٰ رضؓ) سے نکاح کرتا ہے جس کی عمر چالیسؓ سال ہے۔ یہ دو دفعہ بیوگی کے داغ سہہ چکی ہے۔ ہاں اس کا کریکٹر عرب کے گندے ماحول میں نہایت بلند ہے۔ قوم اس بیوہ کو "طاہرہ" کے لقب سے پکارتی ہے اور اسی خوبی کو یہ طاہر وطیب نوجوان پسند کرتا ہے۔ خود اعلیٰ اخلاق کا مجسمہ ہے اور اپنی رفیقۂ حیات کے لئے ایک نمونۂ اخلاق خاتون کا انتخاب کرتا ہے۔

حضرت خدیجۂ کبریٰ رضؓ کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے ۲۸ سال گذارے نبوت سے پہلے ۱۵ سال میں زیادہ وقت تجارت، خدمتِ خلق اور علیحدگی میں تلاشِ خدا میں صرف کیا اور ۱۳ سال نبوت کے بعد تبلیغ و دعوت کی بے پناہ سختیوں میں بسر ہوئے۔

یہ سارا دور نہایت محبت اور خوش گواری سے گذرا۔ ایک دن کلِ کل اور بدمزگی نہ ہوئی۔
شکوہ وشکایت کی جگہ صبر وشکر اور باہمی تعاون قائم رہا۔

حضرت خدیجہؓ نے انتخاب کیوں کیا؟

خدیجۂ کبرای رضؓ عرب کی کامیاب سوداگر خاتون تھیں اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی تجارت میں شریک کرکے اور تجارتی قافلوں میں بھیج کر آپؐ کے اخلاقی کردار کا قریب سے تجربہ کر چکی تھیں اس لئے خود فرماتی ہیں۔

انی رغبت فیك لحسن خلقك وصدق حدیثك (اصح السیر ص ۱) ——

"میں نے آپؐ کو آپؐ کے اعلیٰ اخلاق اور زبان کی سچائی کی وجہ سے منتخب کیا ہے۔"

خدیجۂ کبرای رضؓ ایک مال دار خاتون تھیں اور قریش کے بڑے بڑے لوگ ان کے ساتھ شادی کرنے کے خواہشمند تھے، لیکن حضرت خدیجہؓ نے تمام پیغامات کو ٹھکرا کر آپؐ کو پسند کیا۔ خدیجۂ کبرای رضؓ کے رشتہ دار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غربت کے سبب اس رشتہ کو اچھا نہیں سمجھ رہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب کو اس بات کا علم تھا چنانچہ آپ نے اپنے بھتیجے کی طرف سے خطبہ نکاح پڑھتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شاندار مستقبل کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا۔

ان ابن اخی محمد بن عبد اللہ لا یوزن بہ رجل الا رجح بہ شرفا ونبلاً وفضلاً وعقلا وان کان فی المال قل فان المال ظل زائل وامر حائل وھو واللہ بعد ھذا لہ نبأ عظیم وخطر جلیل (اصح السیر ص ۱) —— "میرا یہ بھتیجا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس شان کا نوجوان ہے کہ جس شخص سے بھی اس کا مقابلہ شرافت، عقلمندی اور بزرگی میں کیا جائے تو یہ اس سے بڑھ جائے گا، مگر مال و دولت ڈھلنے والا سایہ ہے اور یہ بدلنے والی چیز ہے اور یہ نوجوان خدا کی قسم! اس کا مستقبل عظیم ہوگا اور اس کی بات اونچی رہے گی۔

حق پسندی اس نوجوان کی فطرت تھی:

ایک گمراہ قوم میں اس نوجوان کی حق پسندی سارے ماحول میں اسے ممتاز کر دیتی ہے۔ تین صدیوں سے

پھیلی ہوئی اوہام پرستی اس نوجوان کی پاک فطرت پر کوئی اثر نہیں ڈالتی۔ قدرت ہر قدم پر اس کی حفاظت کرتی ہے۔ اس نوجوان کا خاندان کعبہ کا متولی ہے اور اس مذہبی منصب کی وجہ سے پوری قوم اس خاندان کی عزت کرتی ہے، لیکن اس عزت و سرداری کی طمع اسے چھیڑنے کی بھی جرأت نہیں کرتی یہ نوجوان مخلوق کے سامنے جھکنے سے بے زار نظر آتا ہے۔

اس کے سامنے بتوں کے چڑھاوے کا کھانا لایا جاتا ہے تو یہ صاف صاف کہہ دیتا ہے کہ میں تو صرف وہی چیز کھاتا ہوں جس پر خدا کا نام لیا جاتا ہے (فتح الباری ج ۷، ص ۱۰۹)۔

مذہبی تہواروں کو سماج میں بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے مگر یہ ہاشمی جوان ان مشرکانہ تہواروں سے دُور رہتا ہے۔ چچا اور پھوپھیاں تہوار میں اپنے بچے کے ساتھ لے جانے پر اصرار کرتی ہیں مگر یہ انکار کر دیتا ہے اور جب رشتہ داروں کا زور پڑتا ہے تو گھر سے چلا جاتا ہے۔ واپسی پر گھر کی عورتیں پوچھتی ہیں تو جواب میں کہتا ہے کہ میری طبیعت پر کچھ اثر تھا۔ عورتیں سوچتی ہیں شاید جن بھوت کے اثر کا اس لڑکے کو وہم ہو گیا ہے۔ اس پر وہ کہتی ہیں۔

ما کان اللہ لیبتلیك بالشیطان و فیك من خصال الخیر (فتح الباری ایضاً)۔

"بیٹا! یہ بات نہیں کہ خدا تم کو شیطان کے اثر میں مبتلا کرے گا۔ جب کہ تمہارے اندر اچھی عادتیں موجود ہیں"

یہ خاندان کی دانش ور عورتوں کی طرف سے اس نوجوان کی اخلاقی شان کا اقرار تھا۔

ایک تجارتی سفر میں اس ہاشمی سوداگر کا ایک گاہک سے کچھ اختلاف ہو گیا۔ وہ گاہک عرب کے دستور کے مطابق بولا: اَحلِف باللّٰتِ والعزّٰی۔ آپ لات و عزّیٰ کی قسم کھائیے! آپؐ نے بڑی حقارت سے اس مطالبہ کو ٹھکراتے ہوئے کہا میں ہرگز ان بتوں کی قسم نہ کھاؤں گا (ابن سعد ج ا ص ۱۰۲)

اس نوجوان کی فطرت میں بت پرستی سے اس قدر نفرت اس ماحول میں کیسے پیدا ہوئی؟ اس کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ یہ نوجوان خدا تعالیٰ کی نگرانی میں پرورش پاتا ہے۔ خدا ہی اسکا معلّم و مربّی ہے کیونکہ یہ منصب رسالت پر سرفراز ہو کر معلّم اخلاق بننے والا ہے۔

جوانی میں گانا سننے سے پرہیز:

خدا تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت کو ایسا پاکیزہ بنایا تھا کہ رسالت سے پہلے بھی آپؐ فضول اور بے کار کاموں سے دُور رہتے تھے اور آپؐ کی فطرت آپؐ کی حفاظت کرتی تھی۔

حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا کہ جوانی میں جاہلیت کی کسی بات کا شوق میرے دل میں پیدا نہیں ہوا، سوائے دو موقعوں کے مگر ان موقعوں پر بھی خدا نے مجھے محفوظ رکھا۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میں نے اپنے ساتھ بکریاں چرانے والے ساتھی سے کہا تم میری بکریوں کا خیال رکھنا میں مکہ جا کر قصے کہانیاں سن آؤں۔ اس خیال سے میں جا رہا تھا کہ ایک مکان کے اندر سے مجھے گانے کی آواز آئی میں نے پوچھا تو مجھے بتایا گیا کہ اس گھر میں فلاں آدمی کی شادی ہے۔ میرے دل میں خیال آیا کہ میں گانا سُن لوں میں بیٹھ گیا۔ خدا تعالیٰ نے میرے کانوں پر فوراً مہر لگا دی اور میں سو گیا۔ خدا کی قسم! میں ایسا سویا کہ سورج کی شعاعوں نے مجھے صُبح کو بیدار کیا۔ صبح اُٹھ کر میں اپنے ساتھی کے پاس چراگاہ میں پہنچا۔ میرے ساتھی نے پوچھا، کہو کیا سُن کر آئے۔ میں نے سارا واقعہ اسے سنایا۔

دوسرے دن پھر میرے دل میں وہی خیال پیدا ہوا اور میں پھر شہر کی طرف چل پڑا، مگر خدا تعالیٰ نے پھر مجھے سُلا دیا اور میں گانا سننے سے محفوظ رہا۔ اس کے بعد پھر کبھی مجھے اس طرح کی باتوں کا خیال نہیں آیا۔ (خصائص کبریٰ ج ۱، ص ۸۸)۔

یہ اس معلّم اخلاق کی شان تھی جسے خدا تعالیٰ اخلاقِ حسنہ اور شائستگی کی تعلیم کے لئے کھڑا کرنے والا تھا بھلا اس کی فطرت اتنی پاکیزہ کیوں نہ ہوتی؟

دانش مندی کا ایک واقعہ:

اس نوجوان کے پاس جو دانش مندی اور سمجھ بوجھ ہے وہ بھی خدا تعالیٰ کا خاص عطیہ ہے۔

ایک وحشی اور لڑنے مرنے والی قوم میں ایسا صلح پسند اور دور اندیش نوجوان حالات کی پیداوار نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اسے اس نوجوان کی شکل میں قدرت کا انعام عظیم ہی کہا جا سکتا ہے۔ غور کرو یہ صرف ۲۵ سالہ نوجوان ہے اور قریش کے بڑے بڑے دانشوروں کو اپنی دانش مندی سے حیرت میں ڈال رہا ہے۔

بیت اللہ میں حجر اسود نصب کرنے کا واقعہ مشہور ہے۔ قریش کعبہ کی از سرِ نو تعمیر سے فارغ ہو کر اس کی دیوار میں حجر اسود لگانے پر آپس میں جھگڑا کرنے لگے۔ ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ یہ سعادت ہمارے حصّہ میں آئے۔ بات اتنی بڑھی کہ تلواریں نکل آئیں۔ خون سے بھرے پیالوں میں انگلیاں ڈبو کر قسمیں کھائی جانے لگیں۔ اور اسی جھگڑے میں چار دن لگ گئے۔ پانچویں دن قریش کے بوڑھے سردار ابو امیہ نے یہ تجویز پیش کی کہ جو شخص صبح کو سب سے پہلے کعبہ میں آجائے اسی کو اس جھگڑے میں ثالث بنا لیا جائے۔ سب نے اس سے اتفاق کیا۔ صبح کو ہر شخص سب سے پہلے پہنچنے کے ارادہ سے جلدی جلدی گھر سے نکلا لیکن حرم میں داخل ہو کر سب نے یہ دیکھا کہ عرب کا وہ جواں سال وجواں بخت نوجوان کعبہ میں سب سے پہلے موجود ہے۔

قرارداد کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم حکم بنا دیئے گئے۔ آپؐ چاہتے تو حجر اسود لگانے کا تنہا اپنے لئے فیصلہ کر سکتے تھے لیکن آپؐ نے اس سعادت میں سب کو شریک کرنے کے لئے ایک تجویز پیش کی اور فرمایا، جو جو قبیلے اپنے آپ کو اس شرف کا حق دار سمجھتے ہیں وہ اپنا ایک ایک نمائندہ چن کر مجھے دیں، پھر آپؐ نے اپنی چادر مبارک بچھائی اور اس پر حجرِ اسود رکھ دیا اور ان نمائندوں سے کہا کہ اس چادر کو سب مل کر اٹھائیں اور دیوارِ کعبہ کے پاس رکھ دیں اور پھر آپؐ نے اپنے دستِ مبارک سے حجر اسود کو اس کی جگہ پر نصب کر دیا۔

اس واقعہ سے اس نوجوان کی صلح پسندی اور دانش مندی کی دھاک بیٹھ گئی اور سردارانِ قوم کے سر اس کی اخلاقی عظمت کے سامنے جھک گئے (خصائص کبریٰ جلال الدین سیوطی ص ۹۸)

معاہدۂ امن میں شرکت اور تعاون: یہ با اخلاق نوجوان اپنی قوم کے برے اور غلط کاموں

سے کوسوں دور رہتا ہے۔ مگر اچھی باتوں میں تعاون کا موقع آتا ہے تو اس وقت قوم کے ساتھ ہوتا ہے۔ حرب فجار (قریش کی مشہور جنگ) کے بعد قریش کے دانش وروں نے امن کے پرانے معاہدہ کو زندہ کرنا چاہا اور اس (حلف الفضول) کے لئے ایک اجتماع بلایا۔ اس امن پسند نوجوان نے اس اجتماع میں شرکت کی اور معاہدۂ امن میں حصہ لیا۔ اس معاہدہ میں درج تھا۔

۱۔ سب مل کر حق وانصاف کی حمایت کریں گے۔ ظالم اپنا ہو یا غیر اس سے مظلوم کا حق دلوا کر رہیں گے۔

۲۔ بے روزگار لوگوں کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کریں گے۔

امن وامان قائم رکھنے اور بھوکوں اور پریشان حال لوگوں کی مدد کرنے کے سلسلہ میں یہ اہم اقدام تھا جس میں اس صالح نوجوان نے شرکت کی اور پھر قریش کے لوگ تو اس پر قائم نہ رہ سکے لیکن آپؐ نے اپنی ساری زندگی اسی مشن کے لئے وقف کر دی۔

نبوت کے بعد ایک دفعہ حلف الفضول کا ذکر ہوا تو آپؐ نے فرمایا، اسلام کے بعد آج بھی اگر اس قسم کے معاہدہ کے لئے کوئی مجھے دعوت دے تو میں اسے ضرور قبول کروں گا۔ یعنی مسلم ہو یا غیر مسلم، اچھے کاموں میں سب کے ساتھ تعاون کرنا اسلام کا بنیادی مقصد ہے میں اس پر قائم رہوں گا۔ (ابن سعد ج اص ۸۲)

حضرت خدیجہ رضؓ کا خراجِ عقیدت:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلے کی چالیس سالہ زندگی کا یہ مختصر خاکہ ہے جو شرافت، امانت اور خدمت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی اخلاقی کردار کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے وحی الٰہی کی پہلی آمد کے موقع پر حضرتِ خدیجہ کبریٰؓ نے فرمایا تھا۔

واللہِ ما یخزیك اللہ ابداً انك لتصل الرحم و تحمل الكل و تكسب المعدوم و تقری الضیف و تعین علی نوائب الحق ________ "خدا کی قسم! خدا تعالیٰ کبھی آپؐ کو رسوا

نہیں کرے گا۔ آپ رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کرتے ہیں۔ لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں بیروزگاروں کو کمانے کے قابل کرتے ہیں۔ مہمانوں کی خاطر کرتے ہیں اور لوگوں کی جائز مصیبت میں ان کی مدد کرتے ہیں"۔

اپنے بڑوں کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اپنے بڑوں کے ساتھ اخلاق کا نہایت شریفانہ کردار ملتا ہے۔ ایک بیٹا، ایک بھائی اور ایک بھتیجا، بھانجا، بڑے مقام پر پہنچ کر اپنے بڑوں کے ساتھ ماں باپ کے ساتھ، چچا اور ماموں کے ساتھ ادب و احترام کا کتنا اونچا برتاؤ کرتا ہے؟

اس نمونہ کے لئے ہمیں اس آخری معلم اخلاق کی گھریلو زندگی کا قریب سے مطالعہ کرنا ہوگا۔

نبوت کی تاریخ میں قرآن کریم نے شریف بیٹے کے طور پر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کا اخلاقی اسوۂ حسنہ پیش کیا ہے اور شریف بھائی کے طور پر حضرت یوسفؑ کو نمایاں کیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ آزر کے ساتھ نہایت اعلیٰ اخلاق پیش کئے۔ باپ نے توحید الٰہی کا پیغام سنانے پر ابراہیمؑ کو گھر سے نکالا۔ ابراہیمؑ نے اس تکلیف دہ برتاؤ کے باوجود باپ کے حق میں دُعاءِ خیر کی۔

حضرت اسماعیل نے اپنے باپ ابراہیم کے حکم پر اپنا گلا چھری کے نیچے رکھ دیا اور ایک اطاعت شعار بیٹے کا آخری نمونہ دُنیا کو دکھایا۔ حضرت یوسفؑ نے کنوئیں میں ڈالنے والے اور غلام کی طرح بیچنے والے بھائیوں کے ساتھ شرافت اور سخاوت کا اعلیٰ اخلاقی سلوک کیا۔

حضرت یوسفؑ جب امتحان کی ساری منزلوں سے گزر کر مصر کے تختِ شاہی پر بیٹھے اور برادرانِ یوسفؑ قحط سے تنگ آئے ہوئے بھکاریوں کی طرح شاہِ مصر یوسفؑ کے سامنے حاضر ہوئے تو بھائی نے بے خبری کے سارے پردے اٹھاتے ہوئے اپنے بھائیوں کو یاد دلایا۔

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنْتُمْ جَاهِلُونَ ۝ قَالُوٓا أَإِنَّكَ لَأَنْتَ يُوسُفُ ۖ قَالَ أَنَا يُوسُفُ وَهَٰذَا أَخِي ۖ قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا ۖ إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ۝ قَالُوا تَاللَّهِ لَقَدْ آثَرَكَ اللَّهُ عَلَيْنَا وَإِنْ كُنَّا لَخَاطِئِينَ ۝ قَالَ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۖ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ ۖ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ۝ (سورہ یوسف) ——— "یوسفؑ

بولے، کیا تمہیں یاد ہے کہ تم نے یوسفؑ اور اس کے بھائی بن یامین کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟ وہ بولے، کیا آپ یوسفؑ ہیں؟ یوسفؑ نے کہا، ہاں میں یوسفؑ ہوں اور یہ میرا بھائی ہے، ہم سب پر خدا نے انعام فرمایا، بیشک جو شخص برائیوں سے بچتا ہے اور مصیبت پر صبر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ نیکو کاروں کا اجر وثواب ضائع نہیں کرتا۔ وہ بولے، خدا کی قسم! خدا نے آپ کو ہم پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔ ہم سب قصوروار ہیں۔ یوسفؑ بولے آج تم پر کوئی سرزنش نہیں۔ اللہ تم کو معاف فرمائیگا اور وہ بڑا رحم کرنے والا ہے؛"

بھائیوں نے اچانک اور خلاف توقع یوسفؑ کو عظمت کے مقام پر دیکھا، شرمندگی سے سر جھکا دیا۔ یوسفؑ نے بغیر کسی تاخیر کے بھائیوں کو معاف کر دیا کسی قسم کی ملامت نہ کی۔ ایک لفظ طنز وطعنہ کا زبان پر نہ لائے اور ان کے حق میں دعا کی اور اس سے بھی اونچی بات یہ کی کہ جب انہیں پچھلی باتیں یاد دلائیں تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا یہ اس وقت کی بات ہے جب تم نادان تھے۔ یعنی غلطی یاد بھی دلائی تو اس انداز سے کہ خود ہی صفائی بھی پیش کر دی کہ تم نادانی کی حالت میں ایسی غلطی کر بیٹھے تھے۔

شرافت اور اونچے اخلاق کی یہ کتنی اعلیٰ مثال ہے لیکن رسولِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر ایک شریف بیٹے اور شریف بھائی کا جو بے مثال نمونہ ہے وہ مجموعی حیثیت سے نبوت کی پوری تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔

ماں باپ کے لئے دُعا:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوان ہوتے سے پہلے ہی آپؐ کے ماں باپ کا انتقال ہو گیا تھا اور آپؐ کو ان کی خدمت کا موقع نہیں ملا تھا لیکن آپؐ اپنے بزرگ باپ اور پیاری ماں کو بھول نہیں سکتے تھے۔ صحابہ کرامؓ بیان کرتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک ہزار کے قریب صحابہ تھے۔ مکہ اور مدینہ کے درمیان جب آپؐ اس مقدس مقام پر پہنچے، جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ مدفون تھیں تو آپؐ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا، تم عقبہ کے پاس ٹھہر دمیں ابھی آتا ہوں۔ آپؐ کچھ

دور جا کر قبر مبارک کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ فنزل علی قبر ـــــ فجلس علی قبر پھر آپؐ نے دعا کرنی شروع کی۔ دعا کرتے کرتے آپؐ پر رقت طاری ہو گئی۔ ہم بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رونے سے بے قابو ہو گئے اور خود بھی رونے لگے۔ دعا سے فارغ ہو کر آپؐ نے فرمایا، تم کیوں روتے ہو؟ صحابہؓ نے عرض کیا، آپ کی گریہ وزاری نے ہمیں بھی بیقرار کر دیا اور ہم یہ سمجھے کہ شاید خدا تعالیٰ کی طرف سے امت کے لئے کوئی سخت حکم نازل ہوا ہے۔ آپؐ نے فرمایا ایسا نہیں ہوا۔ یہ میری ماں کا مزار ہے۔ میں نے اپنی ماں کے لئے خدا تعالیٰ سے دعا مانگی۔ خدا تعالیٰ نے انہیں دوبارہ زندگی عطا فرمائی اور وہ مجھ پر ایمان لائیں محدثین کہتے ہیں، حضرت آمنہ کی یہ زندگی اسی طرح ہے جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے خدا تعالیٰ نے ڈوبتے سورج کو دوبارہ واپس کیا اور آپؐ نے عصر کی نماز ادا فرمائی۔ (تفسیر ابن کثیر سورہ توبہ ص ۳۹۳)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یتیم ہونے کے بعد آپؐ کے چچا جناب ابو طالب نے باپ کی طرح اپنے بھتیجے کی پرورش کی اور ہر مصیبت میں بھتیجے کا ساتھ دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبر تھے مگر آپؐ کے مرتبہ کی بڑائی نے کبھی آپؐ کو اپنے بڑوں کی عزت سے نہیں روکا۔ غریب چچا کا تجارت میں ہاتھ بٹایا۔ مکہ میں ابو طالب کی دکان تھی اس پر آپؐ بیٹھا کرتے تھے۔ ایک دفعہ چچا بیمار ہوئے تو حضورؐ چچا کی مزاج پرسی کے لئے تشریف لے گئے۔ چچا نے بھتیجے سے کہا، بیٹا! کیا تم خالی مزاج پرسی کے لئے آئے ہو؟ جس خدا نے تمہیں رسول بنایا ہے اس خدا سے تم میری تندرستی کے لئے دعا کیوں نہیں کرتے؟ بھتیجے نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ رحمت الٰہی کو جوش آگیا۔ دعا قبول ہوئی اور ابو طالب کے کانٹا سا نکل گیا۔ ابو طالب اٹھ کر بیٹھ گئے اور بولے، محمد! خدا تمہارا کہا مانتا ہے۔ آپؐ نے تبلیغ کا موقع پا کر کہا، چچا جان! اگر آپ بھی میرا کہنا مان لیں تو خدا تعالیٰ آپ کا بھی کہنا ماننے لگے۔ (سیرت النبی جلد اوّل)

ابو طالب زندگی بھر تو اپنے قومی مذہب پر قائم رہے مگر جب بیمار پڑے تو بھتیجے کی زبان سے لا الہ الا اللہ سن کر ایمان سے مشرف ہو گئے۔ موت کے وقت ان کے بھائی حضرت عباس ابو طالب کے

کے پاس کھڑے تھے۔ جب ابو طالب کے لب ہلنے لگے تو حضرت عباس نے اپنے کان ان کے منہ سے لگا کر ان کی آواز سنی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے کہا بھتیجے! تم نے جو کلمہ میرے بھائی کے سامنے پیش کیا تھا، میرے بھائی نے اس کلمہ پر جان دی ہے۔ (سیرت ابن ہشام ص ۱۴۲)

علامہ شبلیؒ نے جناب ابو طالب کے ایمان کی روایت کو ترجیح دی ہے اور جن حضرات نے دوسری روایت کو اختیار کیا ہے انھوں نے جناب ابو طالب کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کو دیکھتے ہوئے کفر و ایمان کے مسئلہ میں سکوت کو اولیٰ اور بہتر کہا ہے (دیکھو علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا تفسیری حاشیہ سورہ توبہ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا)۔

رضاعی ماں باپ کی عزت:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رضاعی ماں باپ کی بھی بہت عزت کرتے تھے اور حقیقی ماں باپ کی طرح ہی پرورش کرنے والے ماں باپ کا حق مانتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت حلیمہ رضؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آئیں تو آپؐ بچوں کی طرح "میری اماں، میری اماں" کہہ کر ان سے لپٹ گئے۔ حلیمہ رضؓ کے شوہر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آئے تو دیکھتے ہی اپنی چادر پاک ان کے لئے زمین پر ڈال دی اور حارث نے قیامت کے متعلق پوچھا تو آپؐ نے فرمایا، ابا! جس دن قیامت قائم ہوگی اس دن میں آپ کا ہاتھ پکڑ کر آپ کو بتاؤں گا کہ دیکھو ابا! یہ قیامت قائم ہوگئی ہے حضرت حارث رضؓ یہ واقعہ بڑے والہانہ انداز سے سنایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ میرا بیٹا جب قیامت کے دن میرا ہاتھ پکڑے گا تو مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے جنت سے ورے نہیں چھوڑیگا۔

چچی کی لحد اپنے ہاتھ سے بنائی:

حضرت فاطمہ رضؓ بنت اسد جناب ابو طالب کی بیوی تھیں۔ فاطمہ نے شوہر کی وفات کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کا وہی سلوک کیا جو ان کے شوہر کرتے تھے اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی چچی کو ماں کے برابر سمجھا۔ شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلویؒ نے جذب القلوب میں لکھا ہے کہ جب حضرت فاطمہ کا انتقال ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

چچا ابو طالب کے بعد فاطمہ بنت اسد سے زیادہ میرے ساتھ کوئی بھلائی کرنے والا نہ تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی قبر میں خود اُترے اور اپنے ہاتھ سے لحد بنائی اور اپنے ہاتھ سے مٹی نکالی اور پھر اس قبر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم لیٹ گئے۔ پھر قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر فرمایا:

جزاكِ الله من ام و ربيبة۔ خيراً فنعم الام ونعم الربيبة۔

"اے میری ماں! اور اے میری پالنے والی! خدا تمہیں جزائے خیر دے۔ کتنی اچھی ماں تھیں اور کتنی اچھی پالنے والی"

آپ نے فرمایا میں نے فاطمہ کو کفن کے لئے کرتہ دیا تھا تاکہ خدا تعالیٰ انھیں بہشتی حلّہ عطا فرمائے اور میں ان کی قبر میں لیٹا تاکہ خدا تعالیٰ اسے وسیع کر دے۔ (ترجمہ جذب القلوب مطبوعہ کراچی ص ۲۱۴)۔

کتنے شریف بیٹے اور شریف بھتیجے اور شریف بھائی تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شرافت بھی اس شریف انسان پر ہمیشہ فخر کرتی رہے گی۔

دادا کی وفات پر:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی ام ایمن فرماتی ہیں کہ جس وقت جناب عبد المطلب کا جنازہ اٹھا تو میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ جنازے کے پیچھے روتے ہوئے جا رہے تھے اس وقت آپ کی عمر شریف آٹھ سال کی تھی۔ (ابن سعد ج اص ۴۷)

اپنے چھوٹوں کیساتھ حضور صلّی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق:

ایک معلّم اخلاق کی حیثیت سے جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چھوٹوں کے ساتھ محبت اور پیار کا بہترین برتاؤ کرتے تھے وہاں محبت کے جوش میں کبھی چھوٹوں کی تربیت اور فہمائش سے غفلت نہیں فرماتے تھے۔ محبت کے وقت محبت اور نصیحت کے وقت نصیحت، یہ آپ کا اخلاقی اصول تھا۔ آپ نے باپ کی حیثیت سے اپنی اولاد کے ساتھ، نانا کی حیثیت سے اپنے نواسوں کے ساتھ، چچا کی حیثیت سے اپنی بھتیجی کے ساتھ اور ایک آقا کی حیثیت سے اپنے خادموں کیساتھ کتنا اعلیٰ اخلاقی برتاؤ کیا۔ اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ ایک انسان اگر روحانی آدمی بنتا ہے تو بال بچوں سے بے تعلق ہو جاتا ہے اور اگر دنیا داری کی طرف جھکتا ہے تو بال بچوں کی محبت میں غرق ہو کر مذہب و اخلاق کو نظر انداز کر دیتا ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ایک ایسے اعلیٰ اخلاق کی زندگی ہے جس میں بال بچوں کے لئے بے پناہ محبت بھی ہے اور آخرت کے خیال سے ان کی تعلیم و تربیت کا پورا پورا اہتمام بھی ہے۔ یہی معتدل اخلاقی اسوۂ عالم انسانیت کے لئے قابل تقلید ہو سکتا ہے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی سیرتِ پاک کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ آپؐ نے تمدن و سیاست کے بڑے بڑے کاموں میں مشغول رہ کر بھی اپنی اولاد اور اپنی امت کی تعلیم و تربیت کے نہایت چھوٹے چھوٹے کاموں پر بھی پوری توجہ فرمائی۔

حضرت سیدۂ کبریٰ اور ان کے بچوں سے محبت:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی چھوٹی لڑکی خاتونِ جنت حضرت فاطمہ رضؓ کے ساتھ بیحد محبت تھی۔ روزانہ عشاء کے بعد حضرت سیدہ رضؓ کی خبر لینے کے لئے ان کے مکان پر تشریف لیجاتے بیٹی کو آتا دیکھ کر اپنی جگہ چھوڑ دیتے، کھڑے ہو کر ان کا استقبال کرتے، ان کے بچوں حسن رضؓ و حسین رضؓ کو کندھوں پر لئے پھرتے، خطبہ دیتے ہوئے نواسوں کو مسجد میں آتا دیکھتے تو منبر سے اُتر کر انھیں گود میں اٹھا لیتے اور منبر کے پاس بٹھا لیتے۔ بیٹی داماد کو سوتا ہوا پاتے تو نواسوں کو اپنے ہاتھ سے بکری کا دودھ نکال کر پلاتے اور انھیں تھپک کر پھر سلا دیتے۔

چھ ماہ کے بچے ابراہیم کا انتقال ہو گیا تو بیٹے کی جدائی کے غم میں عام انسانوں کی طرح رونے لگے اور اظہارِ غم کے طور پر فرمایا:

واللہ یا ابراھیم انا بفراقك لمحزون ——— "خدا کی قسم اے ابراہیم! میں تیری جدائی سے مغموم ہوں۔"

ابراہیم سے اس قدر محبت فرماتے کہ جس دایہ کے پاس ابراہیم دودھ پینے کے لئے چھوڑے گئے تھے وہ ایک لوہار کی بیوی تھی۔ آپؐ بیٹے کو دیکھنے اس کے گھر تشریف لے جاتے

لوہار کی بھٹی کا دھواں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں اور ناک میں گھستا رہتا، آپ نازک طبع ہونے کے باوجود اس دھوئیں کو بچے کی محبت میں برداشت کرتے۔ انھیں ابراہیم کی پیدائش کی جس غلام نے خوشخبری سنائی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلام کو آزاد کر دیا تھا۔ یہ کئی بیٹیوں کے بعد پیدا ہوئے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو بہت چاہتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ کو منظور نہ تھا کہ اپنے محبوب کی آرزو کے اس پھول کو کھلا رکھے۔ ابراہیم خدا کو پیارے ہو گئے اور خدا تعالیٰ نے بیٹے کے بغیر صرف بیٹیوں سے آپ ﷺ کا نام چلایا۔ حضور ﷺ کی تمام اولاد حضرت خدیجہ کبریٰ کے بطن سے تھی۔ صرف حضرت ابراہیم، حضرت ماریہ قبطیہ کے بطن سے تھے۔

ایک اعرابی صحابی حضرت اقرع بن حابس دربارِ نبوی میں حاضر تھے کہ حضرت حسن رضؓ ادھر آ نکلے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں گود میں لے کر پیار کرنا شروع کر دیا۔ دیہاتی لوگ سخت مزاج ہوتے ہیں۔ حضرت اقرع کو یہ بات وقارِ نبوت کے خلاف محسوس ہوئی۔ یہ بولے، حضور! میرے تو دس بچے ہیں، میں نے ان میں سے کسی کو اس طرح پیار نہیں کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف نظر اٹھائی اور فرمایا، اقرع! جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا مَنْ لَّا یَرْحَمُ لَا یُرْحَمُ دوسری روایت میں یہ الفاظ اور زیادہ ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے تیرے دل سے رحم نکال دیا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ (بخاری کتاب الادب)۔

لڑکیوں کے ہلاک کرنے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رونا:

ایک صحابی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضور! ہم لوگ زمانہ جاہلیت میں اپنی لڑکیوں کو ہلاک کر دیا کرتے تھے۔ میری ایک لڑکی تھی جو مجھ سے بہت ہی محبت کرتی تھی۔ میں اس کو بلاتا تو وہ دوڑ کر میرے پاس آتی۔ ایک دن میں نے اسے آواز دی وہ دوڑ کر میرے پاس آئی۔ میں آگے آگے چلتا رہا اور وہ میرے پیچھے پیچھے آتی رہی، یہاں تک کہ گھر کے پاس ایک کنواں تھا میں اس کنوئیں پر آیا۔ اپنی بچی کو پکڑا اور اس کنوئیں میں ڈال دیا وہ ابا ابا پکارتی رہی اور یہی اس کی آخری آواز تھی۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس درد بھرے افسانے کو سُن کر رونے لگے۔ ایک صحابی نے اس سنانے والے شخص کو برا بھلا کہا کہ تم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو غمگین کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اسے کچھ نہ کہو۔ جو مصیبت اس پر پڑی ہے وہ اس کا علاج پوچھنے آیا ہے۔ پھر اس شخص سے فرمایا، ہاں، میاں تم مجھے اپنا یہ قصہ پھر سناؤ انھوں نے دوبارہ بیان کیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت ہوئی کہ روتے روتے ریش مبارک (ڈاڑھی) آنسو سے تر ہو گئی۔ پھر فرمایا، جاؤ، جاہلیت کے گناہ اسلام کے بعد معاف ہو گئے۔ اب نئے سرے سے زندگی بناؤ۔ (سیرت النبی ج ۶ ص ۱۶۲)۔

تعلیم و تربیت کی سختی:

اس محبت و شفقت کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دین و اخلاق کے معاملے میں اولاد کے ساتھ کبھی نرمی نہیں برتی، قبیلۂ مخزوم کی ایک خاتون فاطمہ رضؓ سے چوری کا ایک جرم سرزد ہو گیا۔ ان کے رشتہ داروں نے حضرت اسامہ رضؓ کے ذریعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سفارش پہنچائی۔ سفارش سُن کر آپؐ نے فرمایا، خدا کی قسم! اس فاطمہ کی جگہ اگر میری لختِ جگر فاطمہ بھی ہوتی اور چوری کا الزام ثابت ہو جاتا تو میں اس کا ہاتھ کاٹنے میں بھی دیر نہ کرتا۔

اس واقعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اولاد کو سخت تنبیہہ فرمائی کہ میں اخلاق و قانون کے معاملے میں کسی قسم کی نرمی اختیار نہیں کر سکتا۔ میری اولاد میری محبت کو دیکھ کر غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔ تاریخ میں بیٹی داماد کو نصیحت کرنے اور داماد کی طرف سے لاڈ اور پیار کا ایک دلچسپ واقعہ مذکور ہے۔ حضرت علی رضؓ کا بیان ہے کہ ایک دن سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت ہمارے گھر تشریف لائے اور مجھے اور خاتونِ جنت کو مخاطب کر کے فرمایا "الا تصلیان ؟ کیا تم دونوں نے نماز پڑھ لی ؟ میں بولا "یا رسول اللہ ! انما انفسنا بید اللہ فاذا شاء ان یبعثنا بعثنا ۔حضور (صلی اللہ علیہ وسلم!) ہماری جانیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ پس وہ جب

پا ہتا ہے ہمیں اٹھا تا ہے اور ہم اٹھ جاتے ہیں۔

حضرت علی رضؓ فرماتے ہیں، میرا جواب سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم لوٹ گئے اور مجھے کوئی جواب نہیں دیا اور آپؐ جاتے ہوئے اپنی رانوں پر ہاتھ مارتے جاتے تھے اور فرماتے تھے:

وکان الانسان اکثر شیء جدلاً (ابوداؤد) ـــــــ "انسان بڑا ہی جھگڑالو ہے"۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت کے جواب میں حضرت علی رضؓ نے جو کچھ کہا اس میں اپنے بڑے چچیرے بھائی اور اپنے خسر کے ساتھ ناز و پیار کا فطری انداز پوشیدہ ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ حضرت علی رضؓ نے تقدیر و مشیت کا بہانہ بنا کر عمل سے بچنے کی کوشش کی۔

حضرت حمزہ رضؓ کی یتیم بچی کے ساتھ محبت:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے سمجھوتہ کے مطابق ۷ھ میں عمرہ ادا کیا۔ عمرہ سے واپسی کے وقت ایک عجیب دل دوز واقعہ پیش آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شہید چچا حضرت حمزہ رضؓ کی یتیم لڑکی امامہ اپنی ننھیال میں مکہ ہی میں رہ گئی تھی۔ اتفاق سے اس بچی کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نظر پڑ گئی وہ دیکھتے ہی چچا، چچا پکارتی ہوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دوڑی حضور صلی اللہ علیہ وسلم رشتہ میں چچا زاد بھائی تھے مگر بچی نے احترام کے طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چچا کہہ کر پکارا۔ اس موقع پر حضرت علی رضؓ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہی کھڑے تھے انھوں نے امامہ کو گود میں اٹھا لیا۔ امامہ کو دیکھ کر حضرت علی رضؓ کے بھائی جعفر رضؓ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام زید رضؓ بھی علی رضؓ کے پاس آ گئے۔

اب ان تینوں بزرگوں نے امامہ کو لینے کے لئے آپس میں جھگڑا شروع کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور چچا حمزہ رضؓ کی مظلومانہ شہادت کا خیال آ رہا تھا:

آپؐ نے حضرت علی رضؓ سے کہا:

انت منی وانا منک ـــــــ "علی رضؓ! تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں"۔

حضرت زید رضؓ سے کہا:

انت اخونا و مولانا ——— "زیدؓ! تم میرے بھائی اور میرے دوست ہو"

جعفر رضؓ سے کہا:

اشبھت خَلقی و خُلقی ——— "جعفرؓ! تم سورت اور سیرت میں مجھ سے مشابہ ہو"

اور پھر امامہ کو جعفر رضؓ کی بیوی اسماء کے سپرد کر دیا جو امامہ کی خالہ تھیں اور فرمایا، خالہ ماں کے برابر ہوتی ہے۔ (ابن کثیر ج ۴ ص ۲۰۳)

گھر کے خادم سے محبّت:

حضرت انس رضؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص ہیں۔ بچپن میں ان کی والدہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دیا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کام کاج کے سلسلہ میں مجھ پر کبھی ناراض نہیں ہوئے صرف ایک دفعہ ایسا ہوا کہ آپؐ نے مجھے کسی کام کے لئے بھیجا میں بچوں کے ساتھ کھیل کود میں مشغول ہو گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجھے دیکھنے کے لئے باہر نکلے اور کھیلتے ہوئے پکڑ لیا اور فرمایا، کھیل میں لگ گیا؟ جی چاہتا ہے کہ اس مسواک سے تمھیں خوب ماروں۔ بس یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انتہائی ناراضگی تھی۔

ماں باپ کے حقوق کی تعلیم:

اوپر والدین اور دوسرے بڑے رشتہ داروں کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی اخلاق کا ذکر کیا گیا جس میں بڑوں کا ادب، بڑوں کی عزت و احترام اور ان کی خدمت، کا نہایت بلند نمونہ نظر آرہا ہے۔

اس باب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے بھی ماں باپ کی عزت و خدمت کے ایک ایک گوشہ کی وضاحت کی ہے۔ اور والدین کے اولاد پر حقوق اور اولاد کے ماں باپ پر فرائض دونوں کی مکمل تشریح کی ہے اور اسی کے ساتھ اپنی شانِ تکمیلی کا رنگ بھی برقرار رکھا ہے اور ہر قدم پر تشدد اور مبالغہ سے پرہیز کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر، توراۃ نے ماں باپ کو برا بھلا کہنے والے کے لئے

تعزیری قانون بنایا ہے اور ایسی نافرمان اور گستاخ اولاد کے لئے قتل کرنے کی تجویز رکھی ہے اور جو کوئی اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعن طعن کرے، توراۃ کہتی ہے کہ اسے مار ڈالا جائے (احبار ۱۰۔۲۰) انجیل عام طور پر توراۃ کے سخت احکام کو نرم کرتی ہے مگر اس حکم کو اسی طرح برقرار رکھتی ہے۔ لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم توراۃ کے اس حکم میں تخفیف کرتے ہوئے نافرمانی کی سزا آخرت پر اٹھا رکھتے ہیں جو جہنم ہے مگر دنیا کی سزا منسوخ فرما دیتے ہیں۔

ماں باپ کے فرائض کی تعلیم:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بحیثیت باپ کے اولاد کے حقوق عملی طور پر کس طرح ادا کیے؟ اوپر اس کا مختصر ذکر کیا گیا۔

اس سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم بھی نہایت مکمل اور جامع ہے ایک جامع حدیث میں فرمایا: من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا فلیس منّا (ترمذی) ——— "جو بڑا ہو کر چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور چھوٹا ہو کر بڑوں کے ساتھ ادب سے پیش نہ آئے وہ ہم میں سے نہیں ہے"۔

تمام معلمین اخلاق اور حکماء نے ماں باپ اور اولاد کے حقوق و فرائض کا جو بے پایاں دفتر وضع کیا ہے۔ اسے ایک طرف رکھئے۔ اور آخری معلم اخلاق کا یہ ایک جملہ ایک طرف رکھئے آپ کو نظر آئے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جملہ کی جامعیت نے دریا کو کوزہ میں بند کرنے کی شاندار مثال پیش کی ہے۔

اگلی شریعتوں میں بڑوں کے حقوق تو بیان کیے گئے ہیں مگر ان کے فرائض کی طرف سے مکمل خاموشی رہی ہے لیکن اسلام نے فرائض والدین پر بھی ایک جامع قانون مرتب کیا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں باپ کو استقاطِ حمل اور بلا ضرورت عزل سے روکا۔ عربوں میں لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کا رواج تھا ——— اسے ختم کیا۔ بتوں کے نام پر اولاد کی قربانی کا رواج تھا اسے منسوخ کیا۔

بیٹیوں کے ساتھ نفرت کو محبت میں تبدیل کیا۔ چھوٹے بچوں کی پرورش، رضاعت اور حضانت کی ذمہ داری ماں باپ پر ڈالی اور اس کے لئے مکمل قانون بنایا۔

ماں باپ پر تعلیم و تربیت کی ذمہ داری عائد کی اور فرمایا کہ ماں باپ سے اولاد کے متعلق سوال کیا جائے گا کہ انھوں نے اولاد کو کس طرح اٹھایا۔

قرآنِ کریم میں فرمایا:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِیْكُمْ نَارًا (سورۂ تحریم) ——— "مسلمانو! اپنی جانوں اور اپنے بال بچوں کو عذابِ جہنم سے بچاؤ۔"

حکم دیا کہ لڑکوں کو لڑکیوں پر ترجیح نہ دی جائے۔

ارشاد فرمایا: جو مسلمان لڑکیوں پر لڑکوں کو ترجیح نہ دے گا اور ان کی بے عزتی نہ کرے گا تو خدا تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرے گا۔ (ترمذی کتاب البر والصلۃ)۔

اگلی شریعتوں میں پہلوٹھے اور بڑے بیٹے کو دوسری اولاد کے مقابلہ میں ترجیح حاصل تھی مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام اولاد کے درمیان انصاف اور مساوات کو ضروری قرار دیا۔

ایک صحابی رضؓ نے اپنے بڑے لڑکے کو غلام ہبہ کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس عطیہ پر گواہ بننے کی درخواست کی، آپؐ نے فرمایا:

کیا تم نے تمام اولاد کو ایک ایک غلام دیا ہے؟ اس نے انکار کیا۔ آپؐ نے فرمایا میں اس ظالمانہ عطیہ پر گواہ نہیں بن سکتا۔ (ابوداؤد کتاب البیوع)

اچھی تربیت اور اچھی تعلیم کے لئے اہتمام:

اسلام نے اولاد کے لئے اچھی سے اچھی تعلیم اور اعلیٰ سے اعلیٰ تربیت کا انتظام ضروری قرار دیا ہے اور اس کے لئے تمام بہتر تدبیریں اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔[1]

تعوذوا باللہ من جهد البلاء ومن درك الشقاء ومن سوء القضاء ———

"لوگو! خدا تعالیٰ سے پناہ مانگا کرو امتحان کی سختی سے، برائی کے ملنے سے اور برے فیصلے سے۔"

[1] صاحب مشکوٰۃ نے کتاب الاستعاذہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت نقل فرمائی ہے

حدیث کے شارحین نے جہد بلا یعنی امتحان کی سختی کی شرح میں لکھا ہے۔

من قلة المال و کثرة العیال ــــــ "امتحان کی شدت یہ ہے کہ مال کی کمی اور اولاد کی زیادتی ہو"

اس شرح کے مطابق حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ مال کی کمی اور اس کے ساتھ اولاد کی زیادتی سے انسان کو بچنے کی دعا کرنی چاہیئے۔

اولاد کی کثرت ہو اور مال کی کمی ہو تو ایسی صورت میں انسان بڑی سختی میں گرفتار ہو جاتا ہے اور روٹی کپڑے کے چکر ہی سے اس کا نکلنا مشکل رہتا ہے۔ تعلیم و تربیت کا خیال رکھنا تو بہت دُور کی بات ہے۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر خود ہی یہ دعا فرمایا کرتے تھے تاکہ اُمت بھی اس دُعا کو سیکھ لے، فرمایا کرتے تھے۔

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْفَقْرِ وَ الْکُفْرِ ــــــ "میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں افلاس اور کفر سے۔

ایک صاحب نے پوچھا۔ آنعد (؟) ن؟ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا افلاس اور کفر دونوں برابر ہیں؟ تو آپؐ نے جواب میں فرمایا، ہاں' دونوں کے نتائج خطرناک ہونے میں برابر ہیں"

بیماروں کے ساتھ اخلاق:

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیماروں کی مزاج پرسی کی سخت تاکید فرمائی ہے۔ اس نیکی کا بڑا درجہ قرار دیا ہے۔ آپؐ نے ہدایت کی کہ بیمار کی عیادت کرنا ایک مسلمان پر مسلمان کا حق ہے اسی طرح آپؐ نے غیر مسلموں (یہودیوں) کی بھی مزاج پرسی کی اور منافقین کی عیادت کے لئے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے۔ آپؐ نے فرمایا۔

جب کسی کی عیادت کے لئے جاؤ تو اس کے ہاتھ اور پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھو اور اس کو تسلی دو اور دلاسا دو اور اس کی شفا کے لیے دعا کرو (سیرت النبی ص ۲۱۶)۔

غلاموں کے ساتھ اخلاق:

عرب میں غلامی کا رواج تھا۔ آپؐ نے اس طبقہ کی آزادی کی تحریک شروع کی اور ان کو سماج

میں برابری اور عزت کا مقام دلانے کے لئے زبردست جدوجہد فرمائی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم کے بعد مال دار لوگوں نے غلاموں کو آزاد کرنا شروع کیا حکیم بن حزام رضؓ صحابی نے سَو غلام آزاد کئے۔ حضرت عائشہ رضؓ نے ایک قسم کے کفارہ میں چالیس غلام آزاد کئے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک ہزار غلاموں کو آزاد کرایا۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے تیس ہزار غلاموں کو غلامی سے نجات دلوائی۔ یہ سب آپؐ کی تعلیم اور غلاموں کے ساتھ آپؐ کے حسنِ اخلاق کا اثر تھا۔

حضرت بلال رضؓ آزاد شدہ غلام تھے۔ آپؐ ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔ حضرت زیدؓ آزاد شدہ غلام تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم انھیں اپنی اولاد کی طرح رکھتے تھے، یہاں تک کہ لوگوں میں زید بن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بیٹے زید مشہور ہو گئے تھے۔

قریش مکہ ان غلاموں کو اپنے ہاں اچھوتوں کی طرح رکھتے تھے، ان کا لباس عام شرفاء قوم سے الگ تھا۔ یہ لوگ سب سے الگ تھلگ رہتے تھے، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم انھیں اپنے ساتھ اپنی مجلسوں میں بٹھاتے تھے۔ اپنے ساتھ کھلاتے اور پلاتے تھے۔ مشہور واقعہ ہے کہ ابوجہل نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا، اگر تم ان غلاموں کو اپنی مجلسوں سے الگ رکھو، جب ہم تمہارے پاس ہوں تو یہ لوگ وہاں آنے کی جرأت نہ کریں تو ہم تمہاری باتیں سننے کے لئے آنے لگیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ اسلام کے شوق میں ان کے مطالبہ کو ماننے کا ارادہ کرلیا لیکن خدا نے آپؐ کو ان غریبوں کے ساتھ امتیاز برتنے سے منع کر دیا اور اس ممانعت کے لئے قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی۔ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ الخ (سورہ انعام آیت نمبر ۵۲)

آپؐ نے اس مظلوم طبقہ کی عزت بڑھانے کے لئے حضرت زید کے ساتھ اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب کی شادی کی حالانکہ زینب ایک باعزت قریشی خاندان کی خاتون تھیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر کی سرداری کے لئے حضرت زیدؓ کے لڑکے اسامہ رضؓ کا انتخاب کیا۔ کچھ لوگوں نے ان کی سرداری پر ناک بھوں چڑھائی، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا

اپنا فیصلہ واپس نہیں لیا، اور صحابہ کرامؓ کو ان کی سرداری کو تسلیم کرنا پڑا۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی تعلیم اور ذاتی حسنِ اخلاق کا نتیجہ تھا کہ آگے چل کر اس طبقہ کو سیاسی سرداری اور روحانی پیشوائی کا بلند سے بلند مقام حاصل ہوا۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز اپنی اہلیہ حضرت ام سلمہؓ کے ہاں تشریف فرما تھے کہ آپؐ کو کسی کام کے لیئے خادمہ کو آواز دینے کی ضرورت پڑی، خادمہ نے آنے میں دیر کی اور حضرت ام سلمہ رضؓ اسے دیکھنے کے لیئے صحن میں آئیں، خادمہ کو دیکھا کہ وہ بکری کے بچّوں سے کھیل رہی ہے۔ حضرت ام سلمہ رضؓ نے آکر عرض کیا، حضور! خادمہ ایسی گستاخ ہوگئی ہے کہ آپ کی آواز سن کر بھی کھیل کود میں مشغول ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باندی سے کہا

لولا القود لا وجعتكِ بهذا السواك (بخاری ادب المفرد ص ۲۸) ——— "اگر مجھے خدا کی طرف سے بدلے کا خوف نہ ہوتا تو میں تجھے اس مسواک سے مارتا"

یہ آپؐ کی انتہائی ناراضگی تھی۔ اس سے زیادہ کبھی آپؐ خادموں پر ناراض نہیں ہوئے۔ آپؐ نے اپنے رفقاء کو ہدایت کر رکھی تھی۔

اکسوھم کما تلبسون اطعموھم کما تطعمون ——— "ان غلاموں اور خادموں کو جو لباس خود پہنو وہی انھیں پہناؤ۔ جو خود کھاتے ہو وہی انھیں کھلاؤ"

عرب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس اخلاقی تعلیم کا اثر آج بھی نظر آتا ہے جو دوسری قوموں کے اندر موجود نہیں ہے۔ ایک عرب سردار اپنے دستر خوان پر جب تک اپنے خادم کو اپنے ساتھ نہیں بٹھا لیتا اس وقت تک کھانا شروع نہیں کرتا۔

حالانکہ اس دستر خوان پر بڑے بڑے رؤسا اور افسران ہوتے ہیں اور انھیں کے ساتھ اس گھر کا خادم بھی شریک ہوتا ہے جو ایک منٹ پہلے تک کھانا لانے اور لگانے کا کام کر رہا تھا۔

یتیم پر شفقت: ایک دفعہ ایک یتیم لڑکے نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں یہ دعوٰی

دائر کیا کہ یہ نخلستان میرا ہے اس پر فلاں شخص قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مقدمہ کی سماعت شروع فرمائی اور لڑکے سے ثبوت طلب فرمایا۔ لڑکا ثبوت دینے سے قاصر رہا آپؐ نے اس کا دعویٰ خارج کر دیا۔ اس فیصلہ پر وہ یتیم بچہ رونے لگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو رحم آیا۔ اس شخص سے کہا، تم یہ نخلستان اس بچہ کو دیدو۔ وہ شخص اس کے لئے تیار نہ ہوا حضرت ابو الدرداءؓ صحابی موجود تھے۔ انھوں نے کہا، کیا تم یہ نخلستان میرے باغ سے بدل سکتے ہو؟ وہ راضی ہو گیا۔ اور حضرت ابو الدرداءؓ نے وہ نخلستان اس یتیم کو عطا کر دیا (سیرۃ النبی ج ۶ ص ۲۰۴)

بیوہ عورتوں کے ساتھ حسن اخلاق:

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دنیا میں بیوہ عورتیں سماج میں بڑی کس مپرسی کی زندگی گذارتی تھیں۔ ہندوستان میں شوہر کے ساتھ جل جاتی تھیں۔ عرب میں بیوہ عورت وارث کی ملکیت بن جاتی تھی اور وہ مالک ان کے ساتھ ہر قسم کا غیر انسانی سلوک کرتا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیوہ عورت کو اس ذلت سے نکالا اور اسے سماج میں عزت کا مقام عطا کیا۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ بیوہ عورتوں کو اپنے حرم پاک میں داخل کیا اور بیوہ کے ساتھ نکاح کو اپنی سنت بنا دیا۔

بیوہ کی خدمت کو جہاد کے برابر درجہ عطا فرمایا (بخاری کتاب الادب) ایک حدیث میں فرمایا، میں قیامت کے دن سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھولوں گا تو دیکھوں گا ایک عورت مجھ سے بھی پہلے اندر جانا چاہتی ہے، میں پوچھوں گا، تو کون ہے؟ تو وہ کہے گی کہ میں ایک بیوہ عورت ہوں جس کے چند ننھے یتیم بچے تھے (سیرت النبی ج ۶ ص ۲۰۶)

پڑوسی کے حقوق کی تعلیم:

اسلام سے پہلے بھی عربوں میں پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی بڑی اہمیت تھی۔ ہر عرب اپنے پڑوسی کی عزت و آبرو کے لئے لڑنے مرنے کو شرافت کا نشان سمجھتا تھا۔

اسلام نے اپنی تعلیم میں پڑوسی کے دائرے اور اس کے حقوق اور زیادہ وسیع کر دیے۔

ایک سفر کے دو رفیق، ایک کارخانہ کے دو ملازم اور ایک کاروبار کے دو شریک بھی پڑوسی کے دائرہ میں شامل کر دیئے کیونکہ یہ بھی ایک دوسرے کے رفیق اور ساتھی ہیں۔ اگرچہ یہ رفاقت عارضی ہے۔

اسلام کی اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کے نزدیک دوست دشمن اور مسلم اور غیر مسلم کی تمیز ختم ہو گئی تھی۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک بکری ذبح کی۔ ان کے پڑوس میں ایک یہودی رہتا تھا۔ انھوں نے گھر والوں سے پوچھا، کیا تم نے اس گوشت میں سے اس یہودی پڑوسی کو گوشت بھیجا؟ کیونکہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سُنا ہے کہ مجھے جبرئیل امینؑ پڑوسی کے ساتھ نیکی کرنے کی اس قدر تاکید کرتے رہے کہ میں یہ سمجھا کہ آپ اس پڑوسی کو میراث میں شریک کریں گے۔ (ابوداؤد باب حق الجار)۔

پڑوسی اگر تکلیف پہنچائے تو کیا کرے؟

ایک شخص نے حاضر ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ میرا پڑوسی مجھے تکلیف دیتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا، اپنا تمام سامان گھر سے نکال کر بازار میں رکھ دے۔ اس شخص نے ایسا ہی کیا اور راستہ میں اپنا مال واسباب ڈال کر وہیں بیٹھ گیا۔ اب جو شخص ادھر سے گذرتا وہ پوچھتا کہ تم گھر سے باہر کیوں بیٹھے ہو؟ یہ سبب بیان کرتا وہ شخص اس پڑوسی کو برا بھلا کہتا ہوا چلا جاتا۔ پڑوسی کو جب اس کا علم ہوا تو وہ اس کے پاس آیا اور اس سے معافی تلافی کر کے اسے گھر واپس لے آیا اور یہ عہد کیا کہ آئندہ میں تم کو پریشان نہیں کروں گا (تفسیر ابن کثیر سورۂ نساء بحوالہ ابوداؤد ج ا ص ۵۷)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑوسی کی ایذا رسانی کے جواب میں ایذاء پہنچانے کی اجازت نہیں دی بلکہ اس کے خلاف پرامن اور شریفانہ احتجاج کرنے کی ہدایت فرمائی (جسے آج کل کی اصطلاح میں دھرنا دینا، کہا جاتا ہے) اور وہ پُرامن احتجاج کامیاب ہوا۔

اولادِ رسولؐ اور پڑوسی کا حق:

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے انہی اخلاق کا آپؐ کی اولاد اور آپؐ کے رفقاء پر گہرا اثر پڑا

حضرت سیدہ کبریٰ رضؓ کے متعلق آتا ہے کہ حضرت سیّدہ رضؓ نماز میں طویل قیام کرتیں۔

حتی تورم قدماھا وھی تدعو لجیرانھا فسالھا ابنھا الحسن یوما اُمّاہ اما

لی ارنک تدعین لجیرانک ولا تدعین لنا؟ فقالت الجار ثم الدار

"آپ کے قدم سوج جاتے اور آپؓ اپنے پڑوسیوں کے لئے دعا کرتیں۔ ایک روز صاحبزادے حضرت حسن رضؓ نے کہا اماں جان! یہ کیا بات ہے کہ آپ اپنے پڑوسیوں کے لئے دعا کرتی ہیں اور ہمارے لئے نہیں کرتیں۔ آپؓ نے فرمایا، بیٹا! پہلے پڑوسی پھر اپنا گھر"۔ (مضمون شیخ مرتضیٰ المطہری، ایران، الہادی عدد ثالث ۹۳ سنہ)۔

جانوروں کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق:

اسلام کے معلم اخلاق نے جانوروں کے ساتھ بھی نہایت اونچے اور شریفانہ اخلاق کا برتاؤ کیا۔ ایک سفر میں آپؐ کے کچھ ساتھی ایک چڑیا کے بچے پکڑ لائے، چڑیا اپنے بچوں کی مامتا میں، ان کے اوپر منڈلانے لگی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو فرمایا، اس چڑیا کے بچوں کو پکڑ کر کس نے اسے بے قرار کیا ہے؟ اس کے بچوں کو چھوڑ دو۔ (سیرت النبی ج ۶ ص ۲۴۲)۔

سفر ہی کا ایک دوسرا واقعہ ہے کہ صحابہ کرام رضؓ نے چیونٹیوں کے بل پر آگ کا چولہا جلایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ کر فوراً حکم دیا کہ اسے جلدی بجھاؤ، جلدی بجھاؤ۔ (سیرۃ النبی ج ۶ ص ۲۴۱)

جانوروں کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت تفصیلی ہدایات دی ہیں جن میں جانوروں پر رحم کرنے اور ان کے چارہ اور پانی کا خیال رکھنے اور انہیں طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔

امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھلی قوموں کی ایک عورت کے متعلق فرمایا کہ اس نے ایک بلی پال رکھی تھی جسے اس نے باندھ دیا تھا اور اس حالت میں وہ بھوکی اور پیاسی

مر گئی تھی۔ اس فعل پر خدا تعالیٰ نے اس عورت کو جہنم کے عذاب کی سزا دے دی۔ (کتاب الانبیاء ص ۴۹۵)

امام بخاری رحمۃ جانوروں پر رحم کرنے کے عنوان میں ایک واقعہ نقل کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔

ایک شخص نے ایک کتے کو پیاسا دیکھا کہ وہ زبان ڈالے ہوئے کنوئیں کے پاس کیچڑ چاٹ رہا ہے۔ اُس شخص کو رحم آیا اور کنوئیں میں اتر کر اس کے لئے پانی لایا اور اسے پلایا۔ اس فعل پر خدا تعالیٰ نے اس پر رحم فرمایا اور اسے بخش دیا۔ صحابہ کرام رضی نے یہ واقعہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، اے اللہ کے رسول! (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا جانوروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے پر بھی آخرت کا ثواب ملتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا، ہر جاندار کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اجرو ثواب کا کام ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن ایک باغ میں قضائے حاجت کے لئے تشریف لے گئے۔ یہ باغ ایک انصاری کا تھا۔

اس باغ میں ایک اونٹ تھا، یہ اونٹ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر بلبلایا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

فاذا جمل فلما رای النبی صلی اللہ علیہ وسلم حن وذرفت عیناہ فاتاہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فمسح ذفراہ فسکت فقال من رب ھذا الجمل؟

"وہ اونٹ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر چیخنے لگا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس اونٹ کے پاس آئے اور اس کی کنپٹیوں پر ہاتھ پھیرا۔ وہ چپ ہو گیا، آپؐ نے فرمایا، اس کا مالک کون ہے؟"

اس کا مالک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپؐ نے اس سے فرمایا:

افلا تتقی اللہ فی ھذہ البھیمۃ التی ملکک اللہ ایاھا فانہا شکت الیّ انک تجیعہا و تو عبہا (ابوداؤد ج ۲ ص ۳۵۲) ——— "کیا تم ان جانوروں کے بارے میں خدا کا

خوف نہیں کرتے جن کا خدا نے تمھیں مالک بنایا ہے۔ اس اونٹ نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ تم اسے تکلیف دیتے ہو اور تھکا دیتے ہو"

ایک اونٹ کا سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر چیخنا اور آنسوؤں سے رونا، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رحمت کا کھلا نشان تھا جو آپؐ کی صداقت کو واضح کرنے کے لئے سامنے آیا۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی بھی ممانعت فرمائی کہ چوپایوں اور جانوروں کو بازی گری کے طور پر آپس میں لڑایا نہ کرو۔ یہ بھی ان بے زبانوں پر ظلم و زیادتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حیوانات کو انسانوں کی جس خدمت کے لئے پیدا کیا ہے ان سے وہی خدمت لینی چاہیے

سسرال والوں کیساتھ ایک شریف داماد کے اخلاق :

عرب کے لوگ بیٹی کے وجود کو صرف اسی لئے ننگ و عار سمجھتے تھے کہ بیٹی کی وجہ سے ان کے گھر داماد آتا اور وہ داماد سسرال والوں سے ایسی ناجائز ناز برداری کراتا جو ایک غیرت مند انسان کی برداشت سے باہر ہوتا۔

ہندوستانی سماج کے اثر سے آج ہم ہندوستانی مسلمانوں میں لڑکی کے متعلق جو تصور ہے وہ اس کی زندہ مثال ہے۔ لڑکے والے لڑکی والوں کے ساتھ کیسا ذلت آمیز سلوک کرتے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ لڑکی والوں کا رشتہ جھکنے کا ہے۔ لڑکی کو پالیں، پوسیں، جوان کر کے لڑکے کے حوالہ کریں، حیثیت سے زیادہ جہیز کی شکل میں نذر پیش کریں اور مختلف رسموں کے مطابق یہ نذر زندگی بھر پیش کرتے رہیں اور پھر لڑکی والا ہونے کی سزا میں سمدھیانے کے بچے بچے کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے رہیں۔ یہ ہم مسلمانوں کی حالت ہے جو اسلام سے تعلق کا شرف رکھتے ہیں، یہی حالت عرب کے جاہل سماج کی تھی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مذہب حق کی اشاعت کی خاطر عرب کے بہت سے خاندانوں کی عورتوں کو اپنے حرم پاک میں داخل کیا اور ایک شریف داماد کو سسرال والوں کے ساتھ اخلاق اور

ہمدردی کا جو اعلیٰ برتاؤ کرنا چاہیے اس کا بہترین نمونہ پیش کیا۔ آپؐ نے عرب کے عام ماحول کے مطابق نہ ناز و نخرے اور نہ غرور و تکبر کا مظاہرہ کیا اور نہ بیٹی والوں کو ذلیل سمجھا بلکہ ساس سسروں کی تعریف کرنا، سالے، سالیوں سے محبت کرنا، سسرال والوں کی قدردانی کرنا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عام شیوہ رہا۔

اپنی زوجہ مطہرہ حضرت عائشہ رضہ سے ان کے باپ حضرت ابوبکر رضہ کی تعریف کرتے ہوئے ایک روز فرمایا، عائشہ رضہ! تمہارے باپ ابوبکر کی نیکیاں آسمان کے تاروں کے برابر ہیں حضرت عائشہ رضہ کی ماں حضرت ام رومان کا انتقال ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود قبر میں اُتر کر انھیں لحد کے سپرد کیا اور جس طرح اپنی چچی حضرت فاطمہ رضہ کے انتقال کے وقت ان کا اعزاز و اکرام فرمایا اسی طرح اپنی ساس کے ساتھ بھی کیا اور ساس اور ماں کو ایک ہی درجہ میں رکھنے کی عملی تعلیم دی۔

حضرت خولہ رضہ آپ کی سالی ہیں یہ حضرت خدیجہ رضہ کی بہن تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی آواز سن کر انھیں پہچان جاتے اور بڑی بے چینی کے ساتھ اندر بلا لیتے تھے۔ آپؐ نے ابوبکر رضہ و عمر رضہ کو یہ اعزاز بخشا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ دونوں خسر آج حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں آرام فرما ہیں۔

آج کی جدید دنیا عورتوں کو سوسائٹی میں باعزت مقام دینے کا نعرہ لگا رہی ہے لیکن آج سے تیرہ چودہ سو برس پہلے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو ایک شریف داماد بنا کر جو عملی نمونہ پیش کیا اس نے عورت کو عزت کی بلندی پر پہنچا دیا۔ آپؐ کا یہ اسوۂ حسنہ آج بھی دنیا کے لوگوں کو دعوت عمل دے رہا ہے۔

دامادوں کے ساتھ ایک شریف خسر کے اخلاق:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگر ابوبکر و عمر رضہ کے داماد ہیں تو علی رضہ و عثمان رضہ کے خسر ہیں، خسر ہونے کے ناطے بھی آپؐ ایک نمونہ کا کردار پیش کرتے ہیں۔ دامادوں کو اولاد کی طرح ہی سمجھتے ہیں اور ان کی نازبرداری فرماتے ہیں اور اسی کے ساتھ بے جا پاسداری سے بھی گریز کرتے ہیں۔

یہاں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک معتدل اور متوازن عملی کردار کے مالک ہیں۔ حضرت علی رض کسی بات پر ناراض ہو کر چلے جاتے ہیں تو ان کو منا کر لاتے ہیں۔ علی رض مسجد کے فرش پر لیٹے ہوئے ملتے ہیں تو فرماتے ہیں، اے ابوتراب! (مٹی پر لیٹنے والے) کھڑے ہو جاؤ۔ داماد بھی حکم سنتے ہی کھڑے ہو جاتے ہیں۔

حضرت علی رض کے منہ سے اپنی سوتیلی ساس (حضرت عائشہ رض) کے متعلق کوئی کمزور جملہ نکل جاتا ہے تو آپ اسے درگزر فرماتے ہیں اور رشتہ کی نزاکت کا لحاظ کرتے ہیں۔ حضرت علی رض جناب سیدہ رض کی حیات میں دوسری شادی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس پر علانیہ ناراضگی کا اظہار فرماتے ہیں کیونکہ علی رض کی مالی حالت دو بیویوں کے خرچ کو برداشت کرنے کے قابل نہیں تھی، داماد بھی اپنے خسر کا حکم مانتے ہیں۔

ایک دفعہ بیٹی شوہر کی سخت مزاجی کی شکایت لے کر آتی ہیں اور ان کے پیچھے پیچھے حضرت علی رض بھی آجاتے ہیں۔ بیٹی سے شکایت سنتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ بیٹی! تم کو خود سمجھنا چاہئے کہ کس کا شوہر اپنی بیوی کے پیچھے پیچھے خاموشی کے ساتھ چلا آتا ہے۔ نصیحت کے اس محتاط انداز سے داماد پر اثر ہوتا ہے اور وہ خود حضرت فاطمہ رض سے معذرت کرتے ہوئے فرماتے ہیں، میں اب آپ کے مزاج کے خلاف کوئی بات نہیں کہوں گا۔

خسر اس قدر بردبار کہ بیٹی کی شکایت سن کر غضبناک نہیں ہوتے اور داماد اس قدر شریف کہ خسر کے تحمل کو دیکھ کر خود ہی شرم سے پانی پانی ہو جاتے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک داماد (عثمان غنی رض) دولت مند ہیں اور دوسرے داماد (حضرت علی رض) غریب ہیں لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم دونوں دامادوں سے یکساں محبت کرتے ہیں، بلکہ غریب داماد کی دلجوئی کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔

ایک روز دونوں دامادوں کو بستی (مدینہ منورہ) سے باہر لے گئے۔ حضرت عثمان رض سے فرمایا، عثمان! ذرا اس چٹان پر کھڑے ہو کر مجھے دن بھر کا حساب تو بتاؤ۔ گرمی پڑ رہی تھی، عرب کی

چٹان سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ حضرت عثمان رضؓ بے حد نازک مزاج تھے، ایک ہی منٹ میں گھبرا گئے۔ آپؐ نے فرمایا، اچھا نیچے اتر آؤ۔ پھر حضرت علی رضؓ سے فرمایا، علیؓ! اب تم کھڑے ہو، علی رضؓ کھڑے ہو گئے۔ غریب زندگی کا حساب ہی کیا ہوتا ہے۔ علی رضؓ نے ایک منٹ میں سب بتا دیا۔ آپؐ نے فرمایا، تم سمجھے کہ میں نے یہ کیوں کیا؟ میں نے تمھیں یہ بتایا ہے کہ قیامت کے دن وہی انسان آرام سے رہے گا جس کا حساب کتاب کم سے کم ہوگا۔ حضرت عثمانؓ رونے لگے

اس تدبیر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غریب داماد علی رضؓ کو سمجھایا کہ تم اپنی نادار زندگی پر افسوس نہ کرنا، بلکہ شکر گذاری کے ساتھ اپنا وقت گذارنا۔

دوستوں کے ساتھ ایک بہترین دوست کے اخلاق :

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے بندوں کو خدا کے احکام (قرآن حکیم) پر چلانے اور انکی اخلاقی زندگی بنانے آئے تھے لیکن آپؐ یہ تعلیمی اور دعوتی فرض ایک جابر و قاہر حاکم کی طرح انجام دینے پر مامور نہ تھے۔ بلکہ پیار و محبت سے دلوں کی دنیا کو بدلنا آپؐ کا مذہبی اور تاریخی فریضہ تھا اس لئے خدا تعالیٰ نے آپؐ کو ایک محبوب اور پیاری شخصیت کا مالک بنایا تھا۔ جابر حاکم ڈنڈے کے زور سے حکومت کے احکام کی پیروی کراتا ہے اور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود گرامی سراپا محبت تھا۔ آپ کے سینہ میں بھی خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کی محبت ڈالی تھی اور اپنے بندوں کے دل میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پیدا کی تھی اور یہی وہ محبت کی کشش تھی جو صاف ستھری فطرت رکھنے والے انسانوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چاروں طرف پروانوں کی طرح جمع کر دیتی تھی اور وہ اللہ کے بندے اپنے محبوب کے ایک اشارہ پر اپنا وقت، مال اور جان سب کچھ قربان کر دیتے تھے۔

یہی سبب ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج میں ایک طرف ایک زاہد کی متانت اور ایک حاکم کا رعب تھا تو دوسری طرف ایک دوست کی خوش طبعی اور ظرافت بھی تھی۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دینداروں حلقوں میں دینداری کا یہ ناقص اور ادھورا

خیال پھیلا ہوا تھا کہ اللہ والے خشک مزاج، اکھڑ طبیعت اور رونی صورت ہوتے ہیں اور ہنسنا ہنسانا روحانیت کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں رکھتا۔ یہ خیال اس امت کے اندر آج بھی موجود ہے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اسوۂ پاک سے اس غلط تصور کی تردید کی، غور کرو! کیسی باکمال سیرت ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ اپنے رفیقوں کے ساتھ مسجد میں امام ہیں تو طبیعت پر خوف و خشیت کا رنگ غالب ہے۔ انہی رفیقوں کے درمیان جب ایک جج ہیں تو سنجیدگی اور وقار کا سراپا ہیں اور عام زندگی میں انہی رفیقوں کے ساتھ ایک ہنس مکھ دوست اور بہت ہی بے تکلف ساتھی ہیں۔

احادیث میں آتا ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ہنسنے بولنے میں کبھی بازاری پن نہیں آتا تھا۔ آپ ہنستے تھے تو آپ کی کچلیاں ظاہر نہیں ہوتی تھیں۔ بازاروں میں چیخ کر بولنے سے آپ ہمیشہ دور رہتے تھے۔ صحابہ کرام رضؓ کے ساتھ مذاق کرتے تھے تو اس میں شوخی کے ساتھ ساتھ لطافت ہوتی تھی۔

مشہور ہے کہ آپؐ ایک دفعہ حضرت ابوبکرؓ اور علی رضؓ کے ساتھ کھجوریں تناول فرما رہے تھے اور کھجوریں کھا کر اپنی گٹھلیاں حضرت علی رضؓ کے آگے ڈالتے جاتے تھے۔ کھجوریں کھا کر آپؐ نے حضرت علی رضؓ سے فرمایا، علیؓ! آج تم نے سب سے زیادہ کھجوریں کھائی ہیں۔ حضرت علی رضؓ بھی نہایت حاضر جواب تھے، نہایت ادب کے ساتھ بولے، ہاں حضورؐ! آپؐ نے تو گٹھلیوں سمیت کھائی ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی حضرت زاہد رضؓ تھے یہ دیہات میں بود و باش رکھتے تھے اور شکل و صورت کے نہایت بھدے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے بڑی محبت کرتے تھے اور ان کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ زاہد رضؓ ہماری دیہاتی ضرورت پوری کرتے ہیں اور ہم ان کی شہری ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دیہات سے سبزیاں لایا کرتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بال بچوں کے لئے شہری چیزیں عطا

فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم بازار تشریف لے گئے تو زاہد کو سبزیاں فروخت کرتے دیکھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم زاہد کے پیچھے گئے اور ان کی دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے زاہدؓ بولے، کون ہے؟ مجھے چھوڑ دو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ چھوڑا، زاہدؓ کسی نہ کسی طرح سمجھ گئے کہ میرے ساتھ یہ محبت بھری شوخی میرے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کر رہے ہیں۔ یہ محسوس کرتے ہی زاہد رضؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سینۂ اقدس کے قریب ہونے لگے۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی سمجھ گئے کہ زاہدؓ نے مجھے پہچان لیا۔ اب آپؐ نے پیار بھرے لہجہ میں فرمایا: من یشتری ھذا العبد؟ —— "اس غلام کو کون خریدتا ہے؟"

زاہد رضؓ بولے، میرے آقا! یہ مال تو بہت کھوٹا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، زاہد! نہیں ایسا نہیں، خدا کے نزدیک تم بہت قیمتی ہو۔

ایک روز آپؐ کی پھوپھی جان حضرت صفیہ رضؓ آپؐ کے پاس آئیں اور بولیں، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! میرے لئے دعا کرو کہ خدا تعالیٰ مجھے بہشت کی زندگی عطا فرمائے ادع اللہ ان یدخلنی الجنۃ —— "حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا، پھوپھی جان! ان الجنۃ لا یدخلھا عجوز —— "جنت میں کوئی بڑھیا داخل نہیں ہوگی"۔

حضرت صفیہ رضؓ یہ جملہ سنتے ہی رونے لگیں۔

حضرت صفیہ رضؓ بہت سادہ خاتون تھیں اور پھر ایک صاحب ایمان آدمی رسول پاکؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بحث کیسے کر سکتا تھا، ورنہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم)! دوزخ اور جنت کے لیے خدا کا قانون عام ہے۔ قرآن تو صاف صاف کہہ رہا ہے۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ —— "تمام نیک لوگ بوڑھے ہوں یا جوان جنت میں جائیں گے اور تمام بُرے لوگ دوزخ میں"۔

لیکن حضرت صفیہ رضؓ کی سادگی دیکھو اور پھر یقین کی مضبوطی کہ ادھر ایک بات حضور (صلی اللہ علیہ وسلم)

کے منہ سے نکلی، ادھر صفیہ رضؓ پر اثر کرگئی اور صفیہ رضؓ رنجیدہ ہو کر جانے لگیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً صحابہ کرام رضؓ سے کہا، میری پھوپھی جان سے کہہ دو کہ خدا تعالیٰ ہر ایمان والی بڑھیا کو جوان بنا کر جنت میں داخل کرے گا اور اس کے بڑھاپے کو جوانی میں تبدیل کر دے گا اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پاک تلاوت فرمائی:

اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَاۗءً فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا عُرُبًا اَتْرَابًا (سورہ واقعہ)

"ہم نے ان عورتوں کو اچھی اٹھان پر اٹھایا، پھر دوشیزہ، محبت کرنے والیاں اور ہم عمر"

یہ دونوں واقعے علامہ بیجوری نے شمائل ترمذی کی شرح ص ۱۳۳ پر نقل کئے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح کا ایک واقعہ حضرت عائشہ رضؓ کے ساتھ بھی منقول ہے کہ ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضؓ سے کہا، عائشہ! اگر تم مجھ سے پہلے مر جاؤ تو اس میں تمہارا کیا حرج ہے؟ فائدہ ہی فائدہ ہے؟ میں تم کو اپنے ہاتھوں سے غسل دوں گا، کفناؤں گا، جنازہ کی نماز پڑھاؤں گا اور پھر اپنے ہاتھوں سے دفن کر دوں گا۔ حضرت عائشہ رضؓ ایک عورت کی طرح حساس تھیں۔ بگڑ کر بولیں، جی ہاں، یہ سب کچھ تو آپ کریں گے مگر اس کے ساتھ یہ بھی تو کریں گے کہ اسی دن میرے کمرے میں کسی دوسری حرم کے ساتھ آرام فرمائیں گے۔ حضورؐ! کیا میں آپ پر دوبھر ہو گئی ہوں؟ حضورؐ اپنی محبوب رفیقۂ حیات کے اس خفگی بھرے جواب پر ایک دم ہنس پڑے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس شگفتہ مزاجی کی وجہ سے صحابہ کرام رضؓ کا دل بھی آپؐ سے کھل گیا اور یہ حضرات بھی آپؐ کے ساتھ شوخی کی باتیں کر لیا کرتے تھے اور آپؐ اسے ناپسند نہیں کرتے تھے۔ غزوۂ تبوک کا واقعہ ہے کہ آپؐ ایک چھوٹے سے خیمہ میں تشریف فرما تھے کسی ضرورت سے ایک صحابی حاضرِ خدمت ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ کر فرمایا، اندر آجاؤ صحابی رضؓ بولے، سرکار! کیا پورا آجاؤں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ جملہ سن کر مسکرانے لگے۔

صحابی رضؓ کے اس جملہ میں لطیف تعریض تھی کہ خیمہ تو اتنا چھوٹا ہے اور آپؐ مجھے اندر بلا رہے ہیں۔

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو ہدایت فرمائی۔

لیس المؤمن بالطعان ولا اللعان ولا الفاحش ولا البذی (ترمذی)

"مومن نہ کسی پر لعن طعن کرتا ہے، نہ بدزبانی اور فحش گوئی سے پیش آتا ہے۔"

مہمانوں اور میزبانوں کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق:

مہمان نوازی عربوں کی قومی خصوصیات میں داخل ہے لیکن رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے مہمان نوازی کی جو شاندار مثال قائم کی وہ اپنی جگہ نمایاں شان رکھتی ہے۔ اُس وقت کی بات ہے جب مدینہ منورہ کے یہودی دعوتِ اسلامی کو ناکام بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کھانے میں زہر دیا جا رہا تھا۔ آپؐ کو قتل کرنے کی ناپاک سازشیں ان لوگوں کی طرف سے کی جا رہی تھیں۔ ان اشتعال انگیز حالات میں ایک یہودی سردار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ پاک دل پیغمبرؐ نے مہمانوں کی تواضع میں اپنی چادر پاک زمین پر ڈال دی صحابہ کرام رضؓ کی محبت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس شریفانہ فعل پر اپنی توہین محسوس کی جس محبوب آقا کی چادر کو وہ آنکھوں سے لگاتے ہوں اسے دشمنِ خدا کے پیروں کے نیچے دیکھیں۔ بولے حضور! صلی اللہ علیہ وسلم دشمنِ خدا کی اتنی عزت افزائی؟ شریف میزبان نے جواب دیا، میرے رفیقو! یہ شخص اپنی قوم کا سردار ہے، اس لئے ہمارے ہاں بھی اسی حیثیت کے مطابق عزت و احترام کا حق دار ہے۔

اسی طرح ابی سینیا کے بادشاہ نجاشی کے پاس سے ایک ڈیپوٹیشن آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شاہی وفد کو اپنا مہمان بنایا اور اس کی مہمان داری کے فرائض خود انجام دیئے۔ صحابہ کرام نے ہر چند چاہا کہ یہ خدمت وہ انجام دیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول نہ فرمایا اور جواب میں کہا ان لوگوں نے میرے رفیقوں کی خدمت کی ہے، جب وہ ہجرت کر کے حبشہ گئے تھے اس لئے آج میں ان کی خدمت کے فرائض خود ہی انجام دوں گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مہمان نوازی کا ایک عجیب واقعہ امام ترمذی نے ابواب الاطعمہ

میں حضرت ابوہریرہ رضؓ سے نقل کیا ہے؛ وہ فرماتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک غیر مسلم مہمان آیا۔ آپؐ نے اس کے لیے بکری کا دودھ منگایا، وہ مہمان سارا دودھ پی گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر دودھ لانے کا حکم دیا۔ وہ مہمان پھر سارا دودھ پی گیا اور اس طرح سات دفعہ سات بکریوں کا دودھ لایا گیا اور وہ آنے والا سب کا سب دودھ پی گیا اور سیر ہو کر چلا گیا۔

دوسرے دن وہ مہمان صبح کو پھر حاضر ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہو گیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تواضع کے لیے پھر بکری کا دودھ منگایا، اس مرتبہ بھی مہمان نے سارا دودھ پی لیا، مگر جب دوسری مرتبہ لایا گیا تو کچھ دودھ پیا اور کچھ چھوڑ دیا سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر فرمایا: المومن یشرب فی معی واحد والکافر یشرب فی سبعۃ امعاء ـــــــ

"مومن ایک آنت میں کھاتا پیتا ہے اور کافر سات آنتوں میں"

مطلب یہ کہ مومن صبر و قناعت کے ساتھ کھاتا پیتا ہے اور کافر حرص و ہوس کے ساتھ۔

اُمت کو ہدایت فرماتے ہوئے آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"جو اللہ اور رسول پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ مہمان کی عزت کرے"

اور اپنے طرزِ عمل سے بتایا کہ مہمان مسلم ہو یا غیر مسلم سب کا یکساں اعزاز کرنا چاہیے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم مہمان کی حیثیت سے:

اب اس فیاض و سخی میزبان کو مہمان کے روپ میں دیکھو۔ آپؐ مہمان بن کر کہیں تشریف لیجاتے ہیں تو ایک طرف سادگی سے پیش آتے ہیں، اور دوسری طرف میزبان کی حالت پر بھی نظر رکھتے ہیں۔

آپؐ کے ایک ایرانی پڑوسی نے آپؐ کی دعوت کی۔ آپؐ نے بے تکلفی سے فرمایا، میرے ساتھ عائشہ رضؓ بھی ہوں گی۔ اس شخص کے گھر صرف ایک آدمی کا انتظام تھا۔ اس نے عرض کیا میں مشورہ کرلوں یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ دوسری دفعہ پھر آیا اور آپؐ کی دعوت کی، آپؐ نے پھر وہی جملہ دہرایا۔ تیسری دفعہ اس نے دونوں کی دعوت قبول کرلی۔ بات یہ تھی کہ کئی دن سے آپؐ کی رفیقۂ حیات نے بھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا تھا۔ آپؐ کو یہ گوارا نہ ہوا کہ تنہا جا کر دعوت کھالیں۔ ادھر اس شخص کے ہاں بھی کھانے کا

انتظام تھوڑا تھا۔ وہ بھی بار بار اپنے گھر جاتا اور بیوی سے مشورہ کرتا۔ دونوں طرف کس قدر سادگی ہے شرافت ہے اور محبت کا خلوص ہے۔

آپؐ نے ارشاد فرمایا، کسی کا ہدیہ واپس نہ کیا کرو، اس کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا:
تہادوا تحابوا ـــــ "آپس میں ہدیوں کا لین دین کیا کرو محبت زیادہ ہوگی"۔

ایک بے تکلف مہمان کی حیثیت سے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کردار فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے کہ جو چیز فطری ذوق کے مطابق نہ ہوتی اسے طبیعت اور مذاق کے خلاف زبردستی کھانے کے بجائے واپس کر دیتے۔

چنانچہ ہجرت کے بعد جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوایوب انصاری کے دولت کدہ پر مہمان تھے تو ان دنوں ایک روز کھانے میں لہسن ڈال دیا گیا، وہ کھانا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیا۔ آپؐ نے اسے واپس کر دیا۔ ابوایوب انصاری گھبرائے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وجہ دریافت کی۔ آپؐ نے فرمایا اس کھانے میں لہسن تھا۔ انھوں نے پوچھا حضور! صلی اللہ علیہ وسلم کیا لہسن حرام ہے؟ آپؐ نے فرمایا، حرام تو نہیں مگر مجھے اس کی بُو پسند نہیں یہ بولے تو حضور! (صلی اللہ علیہ وسلم) آج سے مجھے بھی اس کی بُو ناپسند ہے (مسلم شریف ج ۲ ص ۱۸۳)۔

ایک سائل کے جواب میں ابوایوب انصاری نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج اقدس کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ "آپؐ نے کبھی کسی کھانے کی فرمائش نہیں کی اور جو کھانا پیش کیا گیا کبھی اس کی بُرائی نہیں کی (وفاء الوفاء ج ۱ ص ۱۹۰)

مطلب یہ کہ اگر کوئی کھانا پسند نہیں آتا تو آپؐ اسے واپس کر دیتے مگر اس میں عیب نہ نکالتے تاکہ میزبان کی دل آزاری نہ ہو۔ یہ بات بھی نہیں ہوتی کہ آپؐ اپنے مذاقِ لطیف کے خلاف ہر چیز تناول فرما لیتے۔

گاہکوں اور خریداروں کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق:

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سوداگر اور تاجر کی حیثیت سے زندگی کا بڑا حصہ گذارا

اس تجارتی زندگی میں آپؐ ایک بلند اخلاق تاجر بن کر رہے، دیانتداری، وعدہ کا پاس اور نرمی اور پیار کے رویہ میں آپؐ نے اس قدر شہرت پالی تھی کہ آپؐ کو ہر بچہ اور بڑا "امین" کہنے لگا تھا۔

حضرت خدیجہ کبریٰؓ سے ان کے غلام میسرہ نے سفر سے واپس آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انہی اخلاقِ حسنہ کا ذکر کیا اور بتایا کہ یہ نوجوان نہایت بلند اخلاق کا مالک ہے اور ایسے شخص کے ذریعہ تجارت بہت کامیابی کے ساتھ چل سکتی ہے چنانچہ حضرت خدیجہ رضؓ نے ان خوبیوں کی وجہ سے آپؐ کو زندگی کا مستقل رفیق بنانے کا فیصلہ کرلیا۔

آپؐ نے دُکانداروں کو اس انداز سے نرمی اور محبت کی نصیحت فرمائی۔

رحم اللہ رجلا سمحا اذا باع واذا اشتری واذا اقتضیٰ ——— "خدا تعالیٰ اس دکاندار پر رحم کرے جو خرید و فروخت اور قرضے کے تقاضے میں نرمی اختیار کرے۔"

داؤد بن حصین کا بیان ہے کہ عرب کے لوگ عام طور پر یہ کہتے سنے جاتے تھے کہ محمد بن عبداللہ اس شان سے جوان ہوئے کہ آپؐ اپنی قوم میں سب سے زیادہ بامروت، سب سے زیادہ با اخلاق، پڑوسیوں کی خبر گیری کرنے والے، سب سے زیادہ حلیم و بردبار اور سب سے زیادہ صادق و امین جھگڑے سے دور رہنے والے، فحش و دشنام طرازی سے پرہیز کرنے والے تھے اور اسی وجہ سے آپؐ کی قوم نے آپؐ کا نام "الامین" رکھا تھا۔ (خصائص کبریٰ ج ا ص ۹۱)۔

عبداللہ بن حمسار کا بیان ہے کہ میں نے رسالت سے پہلے ایک دفعہ محمد بن عبداللہ کے ساتھ ایک معاملہ کیا اور میرے ذمہ آپؐ کا کچھ باقی رہ گیا، میں نے آپؐ سے عرض کیا میں ابھی لے کر آتا ہوں اتفاق سے میں گھر جانے کے بعد بھول گیا۔ تین دن کے بعد یاد آیا کہ میں آپؐ سے واپسی کا وعدہ کر کے آیا تھا۔ یاد آتے ہی میں فوراً اس مقام پر پہنچا جہاں آپؐ سے بات ہوئی تھی۔ وہاں پہنچ کر کیا دیکھا کہ آپؐ اسی مقام پر میرے انتظار میں کھڑے ہیں۔

آپؐ نے مجھے دیکھ کر صرف اتنا کہا، تم نے مجھے تکلیف دی ہیں تین دن سے اسی جگہ تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ (سیرۃ المصطفیٰ ج ا ص ا، بحوالہ ابوداؤد)۔

عبد اللہ بن سائب رضؓ فرماتے ہیں کہ عہدِ جاہلیت میں میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تجارت میں شریک ہو کر کام کر چکا ہوں۔ نبوت کے بعد جب میں مدینہ منورہ حاضر ہوا تو آپؐ نے مجھ سے فرمایا:

سائب! مجھے پہچانتے بھی ہو؟

میں نے عرض کیا، حضور! (صلی اللہ علیہ وسلم) کیوں نہیں۔

كنت شريكي فنعم الشريك لا تداري ولا تماري (خصائص کبریٰ ج ۱ ص ۹۱)

"میں آپ کا شریک تجارت تھا اور آپؐ کیا ہی اچھے شریک تھے۔ نہ کسی بات کو ٹلاتے تھے اور نہ کسی بات پر جھگڑا کرتے تھے۔"

ایک صحابی قیس بن سائب رضؓ ہیں جن کی عمر ۱۶۰ سال کی ہوئی ہے، ان کا بھی یہی بیان ہے کہ میں نے بھی آپؐ کے ساتھ شریکِ تجارت رہ کر کام کیا ہے اور آپؐ کو ایک شریف ساتھی پایا ہے۔ (اصابہ ترجمہ قیس بن سائب)

محنت کے کاموں میں اپنے رفیقوں کے ساتھ شرکت:

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بہت بڑی عزت کے مالک تھے۔ آپؐ کے ماننے والے آپؐ کی اس قدر عزت کرتے تھے کہ کسی نبی اور کسی سلطان کے ماننے والوں کو اپنے پیشوا اور بادشاہ کی اس قدر عزت کرتے نہ دیکھا گیا۔

عزت و عظمت کے اتنے عظیم مقام پر فائز ہونے کے باوجود رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق میں اس قدر خاکساری تھی کہ آپؐ محنت و جفاکشی کے کاموں میں اپنے رفقاء کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کام کرتے تھے رسول و نبی کے سب سے عظیم مرتبہ پر فائز ہونے سے پہلے جس جفاکش نوجوان کو عرب کے تپتے ہوئے صحراؤں میں بکریاں چراتے دیکھا، کعبہ کی تعمیر کے وقت اپنے بڑوں کے ساتھ سر پر پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے دیکھا اس محنت پسند نوجوان کو رسول بننے کے بعد بھی مزدوروں میں ایک مزدور دیکھا۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے ہجرت کے بعد جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو سب سے

پہلے قبار کی بستی میں قیام فرمایا۔ آپؐ یہاں چودہ دن ٹھہرے اور اس عرصہ میں خدا کی عبادت کے لئے سب سے پہلی مسجد کی اپنے ہاتھ سے بنیاد رکھی۔

یہ مسجدِ قبار کی تعمیر کا منظر ہے، آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفیقوں کے ساتھ بھاری بھاری پتھر اٹھا کر لا رہے ہیں۔ بھاری پتھر کے بوجھ سے آپؐ کا جسمِ نازک خم کھا رہا ہے۔ فدا کار رفیق دوڑ کر جاتے ہیں اور عرض کرتے ہیں "ہمارے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، آپ تکلیف نہ فرمائیں، ہم لوگ کافی ہیں"۔

خدا کی زمین پر خدا کا پہلا گھر (خانۂ خدا) بنایا جا رہا ہے، خدا کے بندے، آقا اور غلام خوشی سے پھولے نہیں سما رہے ہیں۔ یہ راج بھی ہیں اور مزدور بھی ہیں سب مل جل کر کام کر رہے ہیں اور خوشی اور فخر کے جوش میں اپنے مالک کی بندگی کا ترانہ گاتے جاتے ہیں۔

افلح من یعالج المساجدا ویقرء القرآن قائما وقاعدا

ولا یبیت اللیل عنہ راقدا

(ترجمہ) "کامیابی اس شخص کے لئے ہے جو خانۂ خدا تعمیر کرے۔ اٹھتے بیٹھتے قرآن پڑھے اور راتوں کو عبادت کے لئے جاگے"۔

کیسا عجیب سماں ہوگا اور کس قدر روح پرور نظارہ ہوگا، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہر ہر رفیق کے ساتھ صحابہ کرام کی آواز میں آواز ملا رہے ہیں۔ اور خدا کے گھر کی تعمیر میں مل کر کام کر رہے ہیں۔

مسجد قبا کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کی تعمیر کا کام شروع کیا محنت کے اس کام میں بھی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے رفیقوں نے مل جل کر کام کیا۔

حضرت ابو سعید خدری رضؓ کا بیان ہے کہ ہم لوگ ایک ایک پتھر لا رہے تھے اور حضرت عمار بن یاسر رضؓ دو دو پتھر لا رہے تھے۔ اپنے اس زہد پسند رفیق کی اس مشقت کو دیکھ کر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ترس آگیا۔ آپؐ عمار رضؓ کے پاس آئے اور اپنے مبارک ہاتھوں سے عمار رضؓ کی کمر سے مٹی جھاڑتے ہوئے عمار کی حق پرستی پر ایک پیشین گوئی ارشاد فرمائی اور کہا:

عمار! تمہیں اللہ تعالیٰ استقامت عطا فرمائے تمہیں ایک نافرمان گروہ قتل کرے گا۔

محنت اور مشقت کے اس موقع پر بھی جی بہلانے کے لئے نہ کسی قسم کی بیہودہ گوئی ہے اور نہ فحش مذاق ہے بلکہ خداوندِ عالم کا ذکر ہے اور اس کی جناب میں دعا و التجا ہے۔

لا عیش الا عیش الاخرۃ   اللھم ارحم الانصار والمھاجرۃ

(ترجمہ) آخرت کی ابدی زندگی ہی حقیقی زندگی ہے۔ اے اللہ! انصار و مہاجرین کی مغفرت فرما۔

مسجد نبوی کی تعمیر میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پتھر اٹھاتے دیکھ کر صحابۂ کرام چلّا اُٹھتے ہیں اور کہتے ہیں:

لئن قعدنا والنبی یعمل   لذاک منا العمل المضلل

(ترجمہ) اگر خدا کے نبی مزدوروں کی طرح کام کرتے رہے اور ہم بیٹھے دیکھتے رہے تو ہمارا سارا کیا کرایا غارت ہوا۔

خدا کے مقدس گھروں کی تعمیر میں رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مزدور کی طرح کام کرتے ہوئے دیکھنے کے بعد اب میدانِ جنگ میں حملہ آور دشمنوں سے شہر کا بچاؤ کرتے ہوئے خندق کے کام میں رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک محنت کش مزدور کی طرح دیکھو۔

خندق کی لڑائی، عرب کے تمام قبیلوں کا مدینہ منورہ پر متحد حملہ تھا، یہ سب مل کر مدینہ کی پُرامن بستی کو اپنے ناپاک قدموں سے روندڈالنا چاہتے تھے اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے حملے سے شہر کی حفاظت کرنے کا انتظام فرما رہے تھے۔

اس حملہ کے موقع پر حضرت سلمان فارسی رضؓ نے خندق کھود کر شہر کے بچاؤ کی تجویز رکھی، رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اتفاق کیا، شہر سے باہر تشریف لائے خندق کی حدیں خود قائم کیں، دس دس آدمیوں پر دس دس گز زمین تقسیم کردی گئی، پانچ گز گہری خندق کھودنے کا پروگرام ہے۔ تین ہزار مجاہد صحابہ مزدور

بنے ہوئے کھدائی کے کام میں مشغول ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایک مزدور کی طرح کدال ہاتھ میں لیے زمین کھود رہے ہیں۔ سردی کی ٹھنڈی راتیں ہیں، نہ کھانے کا ہوش ہے، نہ پینے کا، جانثار ساتھی فاقہ کے مارے پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے ہیں، ایک رفیق نے بھوک کی شکایت کی اور اپنے پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے دو پتھر سرکار کو دکھائے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رفیق کو اپنا پیٹ کھول کر دکھایا، جس پر بھوک سے تین پتھر بندھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت دیکھ کر اطمینان ہو جاتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خندق کی مٹی بھی ٹوکریوں میں بھر کر خود ہی پھینکنے جا رہے ہیں عالت یہ ہے کہ جب مٹی کی ٹوکری سر پر رکھتے ہیں تو اس میں سے مٹی چھن چھن کر آپؐ کے اوپر گرتی ہے اور اس مٹی سے آپ کے سینۂ اقدس پر سنہری بالوں کی جو سین دھاری ہے وہ مٹی میں اٹ جاتی ہے۔ لیکن رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم راہِ حق کی اس جدوجہد میں پورے ذوق وشوق کے ساتھ لگے ہوئے ہیں، نہ بھوک کا احساس ہے، نہ تکلیف کا نہ مشقت کا

خندق کی کھدائی میں صحابہ کرام کے سامنے ایک نہایت سخت چٹان آجاتی ہے۔ صحابہ کرام سرورِ عالم سے شکایت کرتے ہیں کہ حضور! چٹان ہم سے نہیں ٹوٹتی، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم خود تشریف لاتے ہیں اور کدال ہاتھ میں لے کر اس چٹان پر مارتے ہیں اور آپؐ کی ایک ہی ضرب سے وہ چٹان ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔

خدا کے گھر کی تعمیر اور شہر کی حفاظت کے کاموں میں ایک عام مزدور کی طرح رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی محنت و مشقت کی زندگی کا منظر آپ نے دیکھا۔

اب گھریلو زندگی میں آپؐ محنت کے کاموں میں کس بے تکلفی کے ساتھ اپنے گھر والوں کے ساتھ شریک رہتے تھے، اس کا حال حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ سے سنئے، یہ آپ کی رفیقۂ حیات ہیں، فرماتی ہیں، کان فی مھنۃ اھلہ فاذا سمع الاذان خرج ——— "حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر کے کاموں میں شریک رہتے تھے، البتہ جب اذان ہوتی تھی تو آپ فوراً گھر سے

مسجد میں چلے جاتے تھے"۔

اپنے رفیقوں کو کسبِ معاش کا طریقہ سکھایا:

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو بھلائی اور کامیابی کا صرف روحانی راستہ بتانے نہیں آئے تھے بلکہ روحانیت کے ساتھ معیشت کی کامیابی کے طریقے بتانے اور ان پر چلانے کا کام بھی آپؐ کے فرائض میں داخل تھا۔

اور اسی کو آپ نے تکمیلِ اخلاق کا نام دیا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی مشن تھا، چنانچہ آپؐ کی زندگی میں جہاں یہ واقعہ نظر آتا ہے کہ آپؐ نے اپنے ایک رفیقِ خاص حضرت معاذ بن جبلؓ کو ایک روز دن کے وقت مسجد میں پریشان اور مغموم بیٹھے دیکھا آپؐ ان کے پاس گئے اور ان سے پوچھا۔

مالی اراك یا معاذ مغموما حزینا ——— "اے معاذ! میں تم کو اس وقت پریشان اور غمگین کیوں دیکھ رہا ہوں"۔

معاذ بولے:

لزمتنی هموم و غموم یا رسول اللہ ——— "حضور! مجھے غموں اور پریشانیوں نے گھیر لیا ہے"۔

آپؐ نے معاذ کو رنج و غم کا ایک روحانی علاج بتاتے ہوئے کہا۔ معاذ! تم خدا تعالیٰ سے اس طرح دعا کیا کرو۔

اللهم اعنی علی ذکرك و شکرك و حسن عبادتك ——— "الٰہی اپنا ذکر و شکر کرنے اور اچھی طرح اپنی عبادت کرنے میں میری مدد فرما"۔

حضرت معاذؓ نے اس پر عمل شروع کر دیا۔ چند دن کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معاذؓ نظر آئے، آپ نے معاذؓ کا حال پوچھا، معاذؓ نے خدا کا شکر ادا کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ خدا نے میری پریشانیوں کو دور کر دیا۔

خدا تعالیٰ کے ذکر و شکر کی کثرت، یہ ایک کامیاب روحانی معلّم کی طرف سے رنج و غم کا بینظار علاج تھا جس پر معاذ رضؓ نے عمل کیا اور رنج و غم سے نجات حاصل کر لی۔

اب اسی کے ساتھ دوسرا واقعہ سنئیے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پریشان حال اور غمِ روزگار سے تنگ صحابی کو روزگار اور کسبِ معاش کا طریقہ سکھایا۔

حضرت انس بن مالک رضؓ نے بیان کیا کہ ایک انصاری مسلمان نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دستِ سوال دراز کیا، آپؐ نے اس سے پوچھا، تمھارے پاس کیا ہے؟ اس نے عرض کیا کہ حضور! میرے پاس ایک بڑی چادر اور ایک کھانے پینے کا پیالہ ہے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پیالہ منگایا اور اس پیالے کو اپنے ہاتھ میں لے کر اسے مجلس میں دو درہم میں نیلام کر دیا۔

پھر اس انصاری سے کہا کہ تم ایک درہم کا کھانا خرید کر بال بچوں کے پاس پہنچا دو اور ایک درہم کی کلہاڑی خرید کر لے آؤ، اس انصاری نے آپؐ کے حکم کی تعمیل کی اور ایک کلہاڑی لا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کلہاڑی میں اپنے ہاتھ سے لکڑی کا دستہ ڈالا اور انصاری سے کہا: اذھب فاحتطب ولا ادینک خمسۃ عشر یوما ـــــــ "جاؤ اور لکڑیاں کاٹ کر لاؤ اور دیکھو! میں تمھیں پندرہ دن تک یہاں کہیں نہ دیکھوں"

وہ انصاری اسی وقت سے کام میں لگ گئے۔ لکڑیاں جنگل سے کاٹ کر لاتے اور بازار میں فروخت کرتے، دو ہفتہ کے بعد یہ انصاری حضور کے پاس آئے اور انھوں نے اپنی آمدنی کا حساب حضور کے سامنے پیش کیا، ان کے پاس اس وقت کھا پی کر دس درہم بچے ہوئے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حلال اور باعزت نفع کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اپنے رفیق سے فرمایا: ھذا خیر لک من ان تجئ المسئلۃ نکتۃ فی وجھک یوم القیامۃ ـــــــ "یہ محنت کی کمائی اس سے بہتر ہے کہ بھیک مانگنا تمھاری پیشانی پر ایک بدنما داغ بن جاتا اور قیامت کے دن تمھاری پیشانی پر ظاہر ہوتا" (ابوداؤد، ابن ماجہ)

امام بخاری نے حضرت زبیر بن عوام رضؓ سے نقل کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کو محنت اور مشقت کی تعلیم دیتے ہوئے اس کی فضیلت سے آگاہ فرمایا۔

"تم میں سے کوئی شخص لکڑیوں کا ایک گٹھا باندھ کر جنگل سے لائے اور اسے بازار میں فروخت کرے اور اس طرح خدا تعالیٰ اس کی آبرو بچا لے تو یہ اس صورت سے بدرجہا بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے اور لوگ اسے بھیک دیں یا انکار کر دیں"

ازواج مطہرات کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق :

میاں بیوی کا تعلق انسانی زندگی کا نازک ترین شعبہ ہے، اسلام سے پہلے "خدا پرست" لوگ اس شعبہ کی نزاکت سے گھبرا کر تارکِ دنیا صوفی ہو جاتے تھے کیونکہ بیک وقت نفسانی اور روحانی دونوں تقاضوں کو پورا کرنا آسان کام نہیں ہے۔

ہادی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کامل و مکمل رسول کی حیثیت سے اس مشکل کام کو آسان کر کے دکھایا اور ذکر و عبادت کے روحانی کاموں کے ساتھ بال بچوں کی رفاقت میں خوشحال اور پر مسرت زندگی بسر کرنے کی شاندار مثال قائم کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

خیرکم خیرکم لاھلہ ______ "تم میں بہترین انسان وُہ ہے جو اپنے بال بچوں کے لئے اچھا ہو۔"

مطلب یہ ہے کہ اس دور میں انسانیت بالغ ہو چکی ہے اور اپنے کمال کو پہنچ رہی ہے اس دور میں اچھائی کا پیمانہ یہ نہیں ہے کہ انسان گھریلو زندگی سے الگ تھلگ رہ کر ذکر و عبادت میں وقت گذارے بلکہ آج کا اچھا انسان وہ ہے جو اخلاق و روحانیت کے ساتھ اپنے گھر والوں کے ساتھ بھی اچھا اور بہتر ثابت ہو۔

سیرت کی کتابوں میں حضرت عائشہ رضؓ کا ایک تاثر نقل کیا گیا ہے۔ ایک صحابی نے سوال کیا، ام المومنین! آپ کے نزدیک حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا کونسا واقعہ زیادہ تعجب انگیز ہے؟ حضرت عائشہ رضؓ نے جواب دیا کہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے اس واقعہ نے

سب سے زیادہ حیرت میں ڈال دیا کہ ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے حجرے میں آرام فرما تھے اور میری باری کی شب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بہت ہی مسرت واطمینان کی شب ہوتی تھی، کچھ رات گذرنے کے بعد میری آنکھ کھلی اور میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بستر سے غائب پایا میں گھبراکر اُٹھی تو کیا دیکھا کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف مصلّٰی بچھائے خدا کی جناب میں سربسجود ہیں۔ حضرت عائشہ رضؓ نے اس واقعہ کو تعجب انگیز اس لئے کہا کہ مسرت وشادمانی کی ساعتوں میں بھی حضور خدا کے ذکر سے غافل نہیں ہوتے تھے اور خالق ومخلوق دونوں کے ساتھ بیک وقت آپ کا تعلق قائم رہتا تھا۔ خُلق سے تعلق حق سے غافل نہیں کرتا تھا اور حق سے رشتہ خُلق سے بے خبر نہیں کرتا تھا۔

عورت کی عزّت کا عملی اعلان:

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم جس دور میں تشریف لائے اس وقت عورت کو ہر قسم کے تمدنی حقوق سے محروم رکھا جاتا تھا، یہ غریب معاشرہ میں صرف مرد کی محکوم اور غلام بن کر رہ گئی تھی اس وقت اسلام نے عورت کی عزّت کو بحال کرنے کے لئے ایک طرف قرآن کریم میں کتابی احکام نازل کئے اور دوسری طرف اپنے رسول کی گھریلو زندگی کا عملی نمونہ دُنیا کے سامنے پیش کیا ——— قرآنِ کریم نے اعلان کیا ——— وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ——— "اور ان عورتوں کے مردوں پر وہی حقوق ہیں جو مردوں کے عورتوں پر ہیں" ——— تفصیل میں جاکر دیکھیے، اسلام نے عورتوں کو وسیع تمدنی اور معاشی حقوق عطا کئے، معاشرہ اور سماج میں عزت اور شرف کے تمام مراتب پر عورت کو فائز کیا اور ان مراتب کی حفاظت کے لئے اخلاقی اور قانونی ہدایات میں پائیدار ضمانتیں مہیا کیں البتہ اسلام نے مرد اور عورت کے درمیان فطرت کی طرف سے پیدا کئے ہوئے فرق کو ملحوظ رکھا اور وہ فرق یہ ہے کہ مرد کے اندر فطری طور پر فعل وتاثیر کی قوت ہے اور عورت کے اندر انفعال اور اثر قبول کرنے کی صلاحیت ہے اور قدرت کا یہ سارا نظام اسی اصول پر چل رہا ہے، یہاں ہر شئے کا ایک جوڑا ہے ——— ومن

کُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ ـــــــــ یعنی ہم نے ہر شے کو جوڑا جوڑا کر کے پیدا کیا ہے، اس جوڑے میں ایک فاعل ہے اور ایک منفعل ہے، ایک اثر ڈالتا ہے اور دوسرا اثر قبول کرتا ہے ایک شئ میں سختی ہے اور ایک میں نرمی ہے، ایک میں گرمی ہے اور ایک میں سردی ـــــــ یہی "قانون زوج" اس نظامِ ہستی کو چلا رہا ہے، اگر کدال میں سختی اور زمین میں نرمی نہ ہوتی تو کھیتی کا کام نہ ہو سکتا، لیکن قدرت کے اس نظام میں نرمی اور سختی دونوں کی ایک حیثیت ہے، یہ بات نہیں ہے کہ سختی اور گرمی کو فضیلت حاصل ہو اور اس کے مقابلے میں نرمی اور سردی کا درجہ کم تر ہو، قرآنِ کریم نے عورت کی اسی فطری حیثیت کو ان لفظوں میں ظاہر کیا ہے ـــــــ نِسَاۤؤُکُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ ـــــــ "تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں، مرد کی برتر حیثیت کو ظاہر کرتے ہوئے قرآن نے کہا ـــــــ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَاۤءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَاۤ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِھِمْ ط (سورہ نساء) ـــــــ "مرد عورتوں کے اوپر نگران ہیں، اس فضیلت کی بناء پر جو اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر عطا کی ہے اور اس بناء پر کہ وہ مرد ان پر (مہر اور نفقہ کی صورت میں) اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔

مرد کی اس سرداری کا مطلب یہ ہوا کہ مرد اپنے خاندان میں غالب اور عورت مغلوب ہے، خاندان کا محافظ ہے، اخلاق و معاملات کا نگران ہے، اس کے بیوی بچوں پر قانونِ الٰہی کے اندر اس کی اطاعت فرض ہے، اس پر خاندان کے لئے روزی کمانے اور ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کی ذمہ داری ہے۔

بعض قوموں نے عورتوں کو مردوں پر سرداری کا درجہ دیا، مگر یہ فطرتِ الٰہی کے بالکل خلاف تھا اس لئے ایسی قومیں تہذیب و تمدن کے میدان میں کسی اعلیٰ مرتبہ پر نہیں پہنچ سکیں ـــــــ اکثر قوموں نے مرد کی سرداری کا اصول تسلیم کیا مگر اس سرداری میں اعتدال اور میانہ روی قائم نہ رہ سکی اور مرد حاکمِ مطلق اور آقا بن بیٹھا اور عورت ایک لونڈی اور مظلوم باندی بن کر رہ گئی، جو مرد کی خدمت کرتی اور اس کے لئے حیوانی خواہش کی تسکین کا سامان بنتی اور بس۔

یہ طریقہ بھی فطرتِ الٰہی سے بغاوت ہے۔ اس پر بھی جو قومیں چلیں وہ نقصان میں رہیں۔

مغربی تمدن نے تیسرا راستہ اختیار کیا اور وہ یہ کہ مردوں اور عورتوں کے درمیان برابری اور مساوات قائم کی جائے، یورپ ابھی اپنے اس عمل میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوسکا اور نہ ہوسکتا ہے کیونکہ یہ بھی مرد اور عورت دونوں کی فطرت کے مطابق نہیں ہے، لیکن یورپ نے عورت کو عورت کے فطری دائرہ سے تھوڑا بہت جو اوپر اٹھایا ہے اس کا نتیجہ بھی یورپ کے معاشرہ میں نہایت تباہ کن نکل رہا ہے، اسلام نے انتہا پسندی کے ان تمام طریقوں سے ہٹ کر وہ راستہ اختیار کیا جس کی طرف فطرتِ انسانی رہنمائی کرتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مرد میں فعل کی قوت ہے اس کو اسی کے مطابق خاندان کا نگران، کمانے والا، کھلانے والا اور حفاظت کرنے والا قرار دیا جائے اور عورت میں قبول کرنے (انفعال) کی صلاحیت ہے اس لیے اسے اچھی ماں، اچھی بیوی اور امورِ خانہ کا ذمہ دار قرار دے کر ملکۂ خانہ بنایا جائے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک طاقت اور فضیلت مرد کے اندر ہے جو عورت کے اندر نہیں ہے اور ایک طاقت اور فضیلت عورت کے اندر ہے جس سے مرد کو محروم رکھا گیا ہے، اور اس لحاظ سے مرد اور عورت زندگی کی دو اہم ضروری کڑیاں ہیں۔

بیوہ عورت سے شادی اور عورت کی عزّت کا اعلان:

اب رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کے مختلف پہلوؤں کو دیکھو! حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلی شادی چالیس سالہ بیوہ خاتون حضرت خدیجہ کبریٰ رضی کے ساتھ کی حالانکہ آپ عرب کے ۲۵ سالہ حسین جوان تھے، بڑے گھرانے کے چشم و چراغ تھے، عرب کی اعلیٰ سے اعلیٰ دوشیزہ اس صاحبِ جمال نوجوان کے لیے موجود تھی اور عرب میں بیوہ عورت ایک نہایت بری چیز سمجھی جاتی تھی جسے ایک کنوارا نوجوان اپنے لیے کسی طرح برداشت نہیں کرتا تھا۔ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ماحول میں ایک بیوہ عورت سے شادی کرکے ایک طرف عورت کی عزت کو بحال کیا اور دوسری طرف یہ بتایا کہ عورت نہ جوانی کا نام ہے اور نہ

جسمانی حسن کا، بلکہ عورت خدمت، عفت اور عصمت کا نام ہے، اسی لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہترین عورت، نیک عورت کو قرار دیا ہے، حسین وجمیل اور مالدار کو بہترین عورت نہیں فرمایا حدیث اس طرح ہے۔

خَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ ——— "دنیا کی نعمتوں میں بہترین نعمت نیک بیوی ہے"

عورت کے حقوق کا عملی اعلان:

اسلام نے عورت کی عزت کو بحال کرتے ہوئے، اسے ہر قسم کے مکمل معاشی تمدنی اور سماجی حقوق عطا کیے، ان حقوق میں ایک روٹی کپڑے اور مکان کا حق ہے جو مرد کے اوپر واجب ہے، عرب اپنی عورتوں کو اتنا دبا کر رکھتے تھے کہ وہ روٹی کپڑے کے جائز حق کے لیے آواز بلند کرنے کی جرأت نہیں کرسکتی تھیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عورتوں کو اپنے حق کے لیے زبان کھولنے کی آزادی دے رکھی تھی تاکہ عام عورتوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل سے اپنے حق کے لیے زبان کھولنے کی جرأت پیدا ہو اور اس طرح عورتوں کی مظلومیت کا سلسلہ بند ہو جائے۔

مشہور واقعہ ہے کہ ایک روز حضرت عمر رضؓ آپ سے ملنے آئے، در دولت کے قریب آکر حضرت عمر رضؓ نے ازواج مطہرات کی آوازیں سنیں، حضرت عمر رضؓ نے حضور سے ملنے کی اجازت چاہی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضؓ کو اندر بلا لیا، اس وقت آپ مسکرا رہے تھے، آپکی مسکراہٹ کو دیکھ کر عمر رضؓ نے عرض کیا حضور! خدا تعالیٰ آپ کو ہنستا رکھے، اس وقت آپ کے ہنسنے کی وجہ کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا، عمر رضؓ! تمھارے آنے سے پہلے میری ازواج روٹی کپڑے اور گزارے میں کمی کی شکایت کر رہی تھیں، لیکن عمر رضؓ! تمھاری آواز سن کر یہ سب دبک دبک کر اندر بیٹھ گئیں، اس پر مجھے ہنسی آگئی، خدا تعالیٰ نے عمر رضؓ! تمھیں ایسا دبدبہ عطا کیا ہے کہ شیطان بھی اس راستے سے بھاگ جاتا ہے جس سے تم گذرتے ہو۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک رسول کی حیثیت سے واجب الاحترام ہیں، آپ اپنی عورتوں کو زبان کھولنے پر تنبیہ کر سکتے تھے، مگر معاشرہ کی اصلاح کے لئے آپؐ نے اپنی بیویوں کو گھریلو تنگی ترشی کے خلاف شکایت کرنے کی آزادی عطا فرمائی اور خندہ پیشانی کے ساتھ ان کی باتوں کو سُنا اور انھیں مطمئن کرنے کی کوشش فرمائی۔

یہ واقعہ اوپر گذر چکا ہے کہ آپؐ نے ایک پڑوسی کی دعوت میں تنہا شریک ہونے سے انکار کر دیا اور جب پڑوسی نے حضرت عائشہ رضؓ کو دعوت میں شریک کیا تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دعوت قبول کی، اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتایا کہ شوہر کو عورتوں کے کھانے پینے اور دوسری ضروریاتِ زندگی کا اسی طرح خیال رکھنا چاہیے جتنا وہ اپنی ضرورتوں کا خیال رکھتا ہے، حضرت عائشہ رضؓ گھر میں بھوکی بیٹھی تھیں، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کب روا ہو سکتا تھا کہ آپ تنہا جا کر اپنا پیٹ بھر لیں۔

نان ونفقہ میں اضافہ کیا:

اعلانِ نبوت سے ۷ھ ہجری تک ۱۸، ۱۹ سال کا زمانہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے گھر والوں کے لئے انتہائی غربت اور تنگ دستی کا زمانہ تھا، سات ہجری میں خیبر فتح ہو اور اس کی آمدنی نے مسلمانوں کے معاشی حالات کو سنبھالا، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر والوں کے نان نفقہ کی طرف توجہ فرمائی اور ازواجِ مطہراتؓ میں سے ہر ایک خاتون کا سالانہ نفقہ، اسّی وسق کھجور اور بیس۲ وسق جَو مقرر فرمائے ایک وسق کا وزن پانچ من ڈھائی سیر بنتا ہے اس حساب سے اسّی وسق کھجور چار سو پانچ من اور بیس وسق جو ایک سو ایک من ہوتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کا جو نان نفقہ مقرر کیا وہ ایک اچھے اوسط درجہ کے خوشحال گھرانے کی گذر اوقات کے لئے بہت کافی تھا، ایک شخص کی خوراک کے لئے مہینہ میں ایک من اور سال میں بارہ من جَو یا کھجوروں کی مقدار کم نہیں ہوتی، پھر حضور کے مقرر کئے

ہوئے نفقہ سے تو کبھی سومَن کی مقدار فاضل بچتی تھی، جو ہر خاندان کی زندگی کو خوش بنانے کے لئے کافی تھی۔

مزید اضافہ کے لئے مطالبہ کی شدت:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مالی فتوحات کے بعد بڑی فراخ دلی کے ساتھ اپنے گھر والوں کے خرچہ میں اضافہ کیا، مگر اس کے باوجود ۹ھ میں ایلاء کا واقعہ پیش آیا، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آپؐ کی ازواج مطہرات نے گذر اوقات کے لئے مزید نان و نفقہ کا مطالبہ کیا۔ اور حضور کو اس سے سخت ناگواری ہوئی اور آپؐ ناراض ہو کر خانہ نشین ہو گئے۔

اس واقعہ کا پس منظر بیان کرتے ہوئے سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ منافقینِ اسلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پریشان کرنے کے لئے جہاں سیاسی سازشیں کرتے تھے وہاں یہ بدنصیب گروہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کو سکون و راحت سے محروم کرنے کی بھی کوشش کرتا رہتا تھا، حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کے خلاف تہمت کا واقعہ مشہور ہے، کس طرح ایک پاکدامن عورت پر الزام لگا کر خاندانِ ابوبکر رضؓ اور خاندانِ نبوت کو بدنام کرتے اور دونوں بڑے خاندانوں کے درمیان جھگڑا پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بردباری نے اس سازش کو ناکام بنایا۔

اسی طرح ان منافقین نے "ام جلاح" نامی ایک عورت کو مستقل طور پر اس کام کے لئے چھوڑ رکھا تھا کہ وہ ازواجِ مطہرات کے درمیان شرارت پھیلاتی رہے اور ایک کو دوسری کے خلاف بھڑکاتی رہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات عرب کی معمولی عورتیں نہ تھیں بڑے بڑے سرداروں کی لڑکیاں تھیں، حضرت ام حبیبہ رضؓ قریش کے سردار ابوسفیان کی صاحبزادی تھیں، حضرت جویریہ رضؓ خاندان بنی مصطلق کے سردار کی لڑکی تھیں، حضرت صفیہ رضؓ خیبر کے رئیس اعظم کی لڑکی تھیں، حضرت عائشہ رضؓ اور حفصہ رضؓ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما جیسے بڑے باپ کی بیٹیاں تھیں، اس وجہ سے ان تمام بیویوں کے درمیان فطری طور پر کچھ نہ کچھ باہمی رقابت

ضرور رہتی ہوگی اور ہر زوجۂ پاک اپنے سردار و آقا کی قربت حاصل کرنے میں دوسری سے آگے بڑھنا چاہتی ہوگی۔

اس کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ پاک کے آخری دور میں خدا تعالیٰ کی طرف سے انعامات کی بارش شروع ہوگئی تھی اور فتوحات کے سلسلہ نے دورِ اوّل کی ناداری اور افلاس کو ختم کر دیا تھا۔

ان حالات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں نے گھر کے خرچہ میں فراخی کا مطالبہ شروع کیا اور اس میں اس درجہ زور دیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگواری ہوئی اور آپؐ ناراض ہو کر حضرت عائشہ رضؓ کے بالاخانہ میں گوشہ نشین ہوگئے۔

صحابہ کرام رضؓ نے یہ وقت ممبر کے پاس بیٹھ کر رو رو کر گذارا، حضرت عمر رضؓ نے بھاگ دوڑ کی کہ حضورؐ اپنی ازواجِ مطہرات کو معاف کر دیں مگر آپؐ کی ناگواری ایک مہینہ تک قائم رہی اور پھر آیت "تخییر" نازل ہوئی، سرکار نے اس آیت کی روشنی میں ازواجِ مطہرات کو اجازت دی کہ اگر وہ زندگی کا عیش چاہتی ہیں تو مجھ سے علیٰحدگی طلب کر لیں میں انھیں علیٰحدہ کر دوں گا، البتہ جو اس تنگی ترشی کو برداشت کریں وہ میرے حرم میں رہ سکتی ہیں۔

حضرات امہات المؤمنین وحی الٰہی کی زبان سے اختیار (نکاح میں رہو یا طلاق لے لو) کی بات سن کر تڑپ اٹھیں اور سب نے ایک زبان ہو کر کہا کہ ہم کسی حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت سے محروم ہونا نہیں چاہتے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت تعمیر و ترقی کے دور سے گذر رہی تھی، اس دور میں اُمت کے ہادی اور امیر کے لیے ضروری تھا کہ اپنی ذاتی زندگی میں سادگی اور قربانی اختیار کریں چنانچہ آپؐ نے زاہدانہ زندگی اختیار کی اور بیویوں کے اصرار پر بھی اپنے گھر میں عیش کی زندگی کو نہ آنے دیا، لیکن اسی کے ساتھ عورت کو جو حق حاصل تھا کہ وہ جائز حد تک آرام و راحت کی خواہش کرے۔ آپؐ نے اس حق سے اسے محروم کرنے کی کوشش نہ کی اور اختیار دے دیا کہ چاہے وہ آپ کے

ساتھ سادہ زندگی گذارنے کو ترجیح دیں یا علیٰحدگی اختیار کریں، ازواج مطہرات نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے کے شرف واعزاز کو پسند کیا اور عیش کی زندگی کا خیال چھوڑ دیا، اور اس طرح رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی بیویاں دونوں فریق امتحان الٰہی میں کامیاب ہو گئے

ازواج مطہرات کے مطالبہ کا سبب:

ایلاء کے واقعہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے فیض حاصل کرنے والی خواتین (ازواج پاک) نے حضور کے فراخ دلانہ خرچہ کے باوجود اضافہ کا مطالبہ کیوں کیا؟ —— کیا آپؐ کی بیویاں تعیش کی زندگی بسر کرنا چاہتی تھیں، یا اس کا سبب دوسرا تھا؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں سے ہو سکتا ہے کہ بعض کی نیت یہ ہو کہ جب خدا تعالیٰ نے مال و دولت کی وسعت عطا فرما دی ہے تو پھر ہم کیوں نہ عیش و آرام کی زندگی گذاریں لیکن ازواج مطہرات میں کثرت ایسی قناعت پسند خواتین کی تھی جن کی طرف اس خیال کو منسوب کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے اور اس مطالبہ کا یہی سبب نظر آتا ہے جس کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا اور فرمایا:

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ —— "یہ رفقاءِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی جانوں پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، باوجودیکہ انھیں خود شدید ضرورت ہوتی ہے۔" (سورۂ حشر)

مطلب یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک بیویاں قومی ضرورتوں کے لیے اس قدر خیرات کر دیتی تھیں کہ ان کے اپنے گذارہ کے لیے ان کے پاس بہت کم بچتا تھا، قرآن کریم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام رفیقوں، گھر والوں اور صحابیوں کے اسی ایثار کی تعریف کی ہے۔

یہ وقت کا یہ واقعہ ہے اس وقت مسلمانوں کی عام معاشی حالت اس درجہ خستہ تھی کہ ایک اوسط درجہ کے مہاجر خاندان کی آمدنی نصف دینار یعنی پانچ درہم روزانہ کے قریب تھی، اور غریب

خاندانوں کا حال اس وقت کیا ہوگا؟ ——— اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ایسی حالت میں مالدار صحابہ کرام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والے زبردست ایثار اور قربانی سے کام لے کر عام مسلمانوں کی مدد کرتے تھے، ازواج مطہرات میں حضرت زینب رضؓ بہت فیاض خاتون تھیں، ان کے متعلق آتا ہے کہ حضرت عمر رضؓ نے اپنے عہد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک بیویوں کا وظیفہ دس ہزار درہم سالانہ مقرر فرمایا اور جب یہ وظیفہ حضرت زینب رضؓ کے پاس پہنچا تو آپ رضؓ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ عمر رضؓ پر رحم فرمائے، انھوں نے اتنی بڑی رقم میرے پاس کیوں بھیج دی، میری دوسری بہنوں میں ایسی باہمت بہنیں موجود ہیں جو نہایت ہوشیاری کے ساتھ اس رقم کو تقسیم کرسکتی تھیں، وظیفہ لانے والے نے عرض کیا، اے ام المومنین! یہ تو آپ کی ذاتی ضرورت کے لئے ہے تو آپ رضؓ نے فرمایا، اچھا، اسے یہاں ڈال دو، پھر اپنے خادم سے کہا، اس پر کپڑا ڈال دو اور کپڑے کے نیچے ہاتھ ڈال کر رقم نکالنی شروع کردو، پھر ایک ایک ضرورت مند خاندان کے لئے آپ رضؓ نے علیحدہ علیحدہ رقم نکلوائی ——— آخر میں خادمہ نے کہا، سیدہ رضؓ! میں بھی تو ہوں، تو آپ رضؓ نے فرمایا، اچھا اب جو کپڑے کے نیچے ہے وہ تیرا ہے، خادمہ نے کپڑا اٹھایا تو اس میں صرف پچاس درہم باقی تھے۔ (سیرت مبارکہ مولانا محمد میاں ص (۳۳)۔

یہ واقعہ حضرت زینب رضؓ جیسی فیاض خاتون کا ہے، آپ کے علاوہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں، ازواج مطہرات اور اہل بیت کے اندر غریبوں اور ضرورت مندوں کی امداد اور اعانت کا یہی جذبہ موجود تھا جس کی وجہ سے ازواج مطہرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مزید نان و نفقہ کا مطالبہ کرتی ہوں گی اور اسی سبب سے ایلاء کا واقعہ پیش آیا ہوگا

مرد کے لئے طلاق کا حق:

اسلامی شریعت نے مرد کو حق دیا ہے کہ وہ عورت کو طلاق دے کر علیحدہ کردے لیکن اسی کے ساتھ اس قانونی حق کو بہت سی اخلاقی پابندیوں میں جکڑ دیا ہے تاکہ مرد اپنے اس حق کو ضرورت کے وقت استعمال کرے، بلا ضرورت عورت کو پریشان کرنے کے لئے استعمال نہ کرے، رسول پاک

صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھریلو طرزِ عمل سے اس معاملہ میں امت کی نہایت اعلیٰ رہنمائی فرمائی حضرت عائشہ رضی جیسی محبوب اور دانش ور رفیقۂ حیات کے خلاف منافقین نے نہایت خوفناک سازش کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک طرف اپنی ذاتی عزت کا خیال اور دوسری طرف اپنے یارِ غار صدّیقِ اکبر رض کی آبرو کا خیال، ________ بات صرف اتنی ہوئی تھی کہ حضرت عائشہ رض ایک سفر میں قافلہ سے بچھڑ گئی تھیں اور اگلی منزل پر تلاش کرنے والے صحابی رض کے ہمراہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آملی تھیں، دشمنوں نے اتنی سی بات کا تبنگڑ بنا دیا تھا اور شرمناک افواہوں سے آسمان وزمین ایک کر دیئے تھے۔

سرکارِ اقدس کو اس پروپیگنڈہ سے بے حد صدمہ ہوا حضرت عائشہ رض اس صدمہ سے بیمار پڑ گئیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایک صحابی اور ایک ایک گھر والے کو بلا کر اس الزام کی تحقیق فرماتے، خود بھی بیوی کے کیریکٹر پر بھروسہ تھا، مگر پروپیگنڈہ کا اتنا زور کہ آپ اندر ہی اندر غم میں گھلتے رہتے۔

دوسرا کوئی ہوتا تو اس زور شور سے متاثر ہو کر بیوی کے ساتھ بہت کچھ کر گذرتا، بدسلوکی سے پیش آتا، طلاق دے دیتا، لیکن آپ ایک شریف شوہر کی طرح بردباری کے ساتھ تحقیق حال کرتے رہے، محض دشمنوں کے الزام پر بیوی کو مجرم نہ قرار دیا، دل میں ایک وفادار بیوی کی جو عزت تھی، اس میں فرق نہ آنے دیا، تاکہ دنیا سمجھ لے کہ عورت کا ناموس بھی مرد کے ناموس کی طرح قابلِ احترام ہے، وہ پیر کی جوتی کی طرح حقیر نہیں ہے اور نہ ہی پیدائشی گناہ گار ہے۔ یہاں تک کہ کئی مہینہ کے شور وغل کے بعد وحیِ الٰہی نازل ہوئی اور اس نے حضرت عائشہ رض کی پاکدامنی کا اعلان کیا اور منافقین کی سازش کا پردہ چاک کیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز خدا کے نزدیک طلاق دینا ہے، مطلب یہ کہ مرد اپنے اس جائز حق کو اگر بلا ضرورت اور بے موقعہ استعمال کرے گا تو خدا تعالیٰ کے نزدیک، وہ ناپسندیدہ لوگوں میں شامل ہوگا۔

عورت کی طرف سے علیٰحدگی کی خواہش:

یہ صحیح ہے کہ اسلام نے عورت کو نکاح کے رشتہ سے علیٰحدہ ہونے کا اختیار نہیں دیا، یہ حق صرف مرد کو دیا گیا ہے اور یہ بات، مرد و عورت کے فطری تقاضوں کے عین مطابق ہے عورت کی فطرت اور اس کے مزاج میں دوسروں کی طرف جھکنے اور مائل ہونے کی کمزوری اور نرمی موجود ہے، عورت کی رائے میں اسی بنا پر پختگی اور دور اندیشی نہیں ہوتی۔ عورت محبت اور دشمنی دونوں کے معاملہ میں نہایت حساس اور جذباتی واقع ہوئی ہے، اگر عورت کو طلاق کا اختیار دیدیا جاتا تو نکاح کا رشتہ ہر وقت خطرہ میں رہتا، شوہر کی طرف سے ذراسی تکلیف اسے بیزار کر دیتی اور غیر کی طرف سے معمولی سا جھکاؤ اسے اپنی طرف کھینچ لیتا۔

عورت پر اخلاقی کنٹرول کی سختی:

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں عورت کو سماج کے ظلم و زیادتی سے بچا کر اس کی عزت بحال فرمائی وہیں عورت پر مرد کے اخلاقی کنٹرول کو بھی لازم قرار دیا ہے تاکہ عورت جذبات میں بہہ کر اتنی آزاد نہ ہو جائے کہ کلبوں میں ننگی ناچنے لگے اور مرد کو جوتی کی نوک پر مار کر اسے "زن مرید" بن کر رہنے پر مجبور کر دے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی دانشمند بیوی حضرت عائشہؓ سے کس قدر محبت تھی مگر جب آپؐ ان کی طرف سے کوئی نامناسب بات دیکھتے تو انھیں پوری سختی سے تنبیہ فرما دیتے کسی قسم کی رو رعایت نہ فرماتے۔ حضرت عائشہؓ خود فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ میرے منہ سے اپنی سوکن حضرت صفیہؓ کے متعلق ایک ناپسندیدہ جملہ نکل گیا، حضورؐ سنتے ہی بگڑ گئے، یا تو آپؐ محبت سے التفات فرما رہے تھے یا آپؐ کا چہرۂ انور غصہ سے سُرخ ہو گیا اور ارشاد فرمایا —— عائشہ ؓ تم نے وہ بات کہی ہے کہ اگر اسے سمندر میں ڈال دیا جائے تو سمندر کا پانی کڑوا ہو جائے۔

غزوۂ تبوک سے صحیح سلامت واپس آنے کی خوشی میں حضرت عائشہؓ نے اپنے گھر کو سجایا اور

دروازہ پر ایک تصویروں والا پردہ لٹکا دیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب واپس تشریف لائے اور اپنے مکان پر وہ پردہ لٹکا دیکھا تو آپؐ حضرت عائشہ رضؓ پر سخت ناراض ہوئے اور ارشاد فرمایا، عائشہ رضؓ! خدا تعالیٰ نے ہمیں اس لئے روپیہ پیسہ کی نعمت سے نہیں نوازا کہ ہم اسے اینٹ پتھروں کی آرائش پر خرچ کریں۔

بیوی کے مذاق پر تبسّم کا اظہار:

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے متعلّق اوپر گذر چکا ہے کہ آپؐ نہایت ہنس مکھ انسان تھے، بیویوں کے ساتھ بھی اور دوستوں کے ساتھ بھی، آپؐ کا عام برتاؤ نہایت سادہ اور بے تکلفانہ تھا، آپؐ خود بھی اپنی بیویوں کے ساتھ مزاح فرماتے تھے اور ان کے مزاح سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج میں حضرت سودہ رضؓ بڑی خوش طبع خاتون تھیں۔ ایک روز انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا، سرکار! میں رات کو آپؐ کے ساتھ نماز میں شریک تھی، آپؐ نے اس نماز میں رکوع کو اتنا لمبا کر دیا کہ مجھے رکوع میں جھکے جھکے اپنی نکسیر پھوٹنے کا شبہ ہو گیا اور میں دیر تک اپنی ناک پکڑے رہی ______ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سودہ رضؓ کے اس مزاحیہ کلام پر ہنس پڑے۔

بیوی کے منہ سے میکے والوں کی تعریف:

عام طور پر شوہر اپنی بیوی کے منہ سے اس کے میکے والوں کی تعریف سننا پسند نہیں کرتے، اور لڑکی کی فطرت یہ ہے کہ وہ اپنے ماں، باپ اور بہن بھائیوں کے گُن گاتی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ واقعہ بھی پیش آتا تھا اور آپؐ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ اپنی بیویوں سے ان رشتہ داروں کی تعریف سنتے تھے اور خود بھی تعریف کے قابل باتوں کی تعریف کرتے تھے۔

حضرت ام حبیبہ رضؓ نے ایک روز دعا مانگی:

اَللّٰهُمَّ مَتِّعْنِیْ بِزَوْجِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَبِاَبِیْ سُفْیَانَ وَبِاَخِیْ مُعَاوِیَةَ رضؓ ______

"خداوندا! میرے شوہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور میرے باپ ابوسفیان اور میرے بھائی معاویہ رضی کا سایہ مجھ پر دراز رکھیو۔"

"ام حبیبہ رضی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ کے ساتھ اپنے باپ اور بھائی کے سایے کی درازی کے لئے دعا کی، اور اپنے باپ اور بھائی کو بڑا اعزاز دیا، حالانکہ ادب محبت کا تقاضا یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سرپرستی کے بعد ہر سرپرستی اور ہر محبت سے بے نیازی کا اظہار کیا جاتا، مگر اس کا تعلق ایک عورت کی نفسیات سے ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سوءِ ادب پر ناراضگی کا اظہار نہ فرمایا، صرف اتنا کہا:

ام حبیبہ رضی! عمریں تو سب کی اللہ کے ہاں مقرر ہو چکی ہیں، دعا کرنی تھی تو عذاب جہنّم سے نجات پانے کی دعا کرتیں۔ (مسلم شریف)

اوپر تفصیل سے گذر چکا ہے کہ آپ ایک شریف داماد کی حیثیت سے سسرال والوں کی عزّت کرتے تھے اور ان کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرتے تھے، اپنی زبان سے سسرال والوں کی تعریف فرماتے تھے، پھر بھلا بیوی کے منہ سے سسرال والوں کی تعریف آپ پر کیسے گراں گذر سکتی تھی۔

تعدّدِ ازواج کا سبب

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کی تعداد پر بعض مخالفین نے طرح طرح کے شکوک پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اس لئے ضروری ہے کہ چند سطریں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کثرتِ ازواج پر لکھی جائیں۔

تاریخ نے تسلیم کیا ہے کہ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کی سب سے عظیم روحانی، اصلاحی اور انقلابی شخصیت کے مالک تھے، آپ نے صرف ۲۳ سال کی قلیل مدت میں ایک بگڑی ہوئی قوم کو مکمل طور پر بدل ڈالا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی شخصیت میں ایک طرف روحانی، اخلاقی،

اور ذہنی قوت بدرجۂ کمال موجود تھی اور دوسری طرف آپؐ جسمانی قوت میں شانِ امتیازی رکھتے تھے، انہی دونوں (باطنی اور ظاہری) قوتوں کے کمال نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو انسان کامل بنایا تھا۔

روحانی قوت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دلوں کی دنیا کو بدلا اور جسمانی قوت سے جبر و شرارت کرنے والوں کے ظلم وستم کو برداشت کیا اور آخر میں ان قوتوں کی سرکوبی کی، ایسا شجاع بہادر انسان اور پھر اخلاقی طور پر ایسا نیک چلن نوجوان بھرپور جوانی کے ۲۸ سال صرف ایک بیوہ خاتون کے ساتھ نہایت دلجمعی اور محبت کے ساتھ بسر کرتا ہے اور جب ۵۳ سال کا ہوتا ہے تو پہلی رفیقۂ حیات کے جدا ہو جانے پر دوسری شادیاں کرتا ہے۔

حضرت خدیجہ کبریٰؓ کے بعد آپؐ نے حضرت عائشہ رضؓ کے ساتھ شادی کی اور پھر اس کے بعد ۳ ہجری سے ۷ ہجری تک ۴ سال میں عرب کی مختلف معزز بیوہ عورتوں کو اپنے نکاح میں قبول فرمایا:

غور کرو، عمر ڈھل چکی ہے، طبعی طور پر قویٰ میں انحطاط اور اتار ہو رہا ہے، زندگی بڑی بڑی اہم انفرادی، اجتماعی اور سیاسی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے، دشمنوں کے پے درپے حملوں کی روک تھام کے لئے مسلسل جنگیں ہو رہی ہیں اور ان کی قیادت ایک کامیاب جرنیل کی حیثیت سے رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں۔ پھر زندگی غریبانہ گذر رہی ہے، گھر میں تو فاقے ہوتے ہیں مگر یہاں میدانِ جنگ میں بھی پیٹ پر پتھر باندھنے کی نوبت آ رہی ہے، نفس کشی کا یہ حال ہے کہ کئی کئی دن پیہم روزے رکھے جاتے ہیں اور راتوں کو اٹھ اٹھ کر خدا کی عبادت کی جاتی ہے، اور اس قدر جفاکشی کے ساتھ کہ نماز میں کھڑے کھڑے قدم مبارک سوجھ جاتے ہیں۔

پھر کیا ایسی مشغول، جسمانی راحتوں سے محروم، انقلابی ہنگاموں میں گھری ہوئی ایک ۵۳ سالہ عمر کی شخصیت پر یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ اس میں نفسانی ہوس کا جذبہ کارفرما ہوگا؟ ——— نہ عقل اس شبہ کو تسلیم کرتی ہے اور نہ انسانی زندگی کا تجربہ ایسے پاکباز انسان پر حیوانی خواہش کے غلبہ کا امکان تسلیم کرسکتا ہے۔

پھر آپ سوال کریں گے کہ اگر یہ بات تھی تو آپؐ نے اتنی کثرت سے شادیاں کس بنا پر کیں؟ ــــــ اور خدا تعالیٰ نے آپؐ کو شادیوں کے عام قانون (ایک سے چار تک) سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت کیوں دی ــــــ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا حقیقی مقصد عورتوں اور مردوں میں خدا کے دین کی اشاعت تھی، اس مقصد کے لئے آپؐ نے جس طرح مردوں کی ایک بڑی جماعت زندگی کے مسائل کی تعلیم اور دعوت کے لئے تیار کی اسی طرح عورتوں کے ایک سمجھدار گروہ کی ضرورت تھی جو عام مسائل زندگی کے ساتھ عورتوں کے خاص مسائل اور گھریلو زندگی کے نازک معاملات کی تعلیم و تربیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بالکل قریب ہو کر حاصل کرے اور پھر قوم کی عام عورتوں کو اس تعلیم و تربیت سے آراستہ کرے۔

ظاہر ہے کہ گھریلو اور ازدواجی زندگی کے خاص مسائل ایک عورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم پاک میں شریک ہو کر ہی سیکھ سکتی تھی، ایک عام عورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنی بے تکلف نہیں ہو سکتی تھی کہ گھریلو زندگی کے مخصوص معاملات کی تربیت حضورؐ سے حاصل کر سکتی۔

تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ ازواجِ مطہرات میں حضرت عائشہ رضؓ، حضرت ام سلمہ رضؓ اور حضرت سودہ رضؓ جیسی دانشور اور باشعور عرب خواتین نے اپنی ذہانت، تجربہ اور خلوص سے عرب خواتین پر بڑا اثر ڈالا اور اس طرح مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں میں بھی اسلام بہت جلد پھیل گیا۔

شادی بیاہ کے معاملہ میں کفو اور جوڑ کا سوال:

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرتی زندگی نے شادی بیاہ کے معاملہ میں کفو اور جوڑ کے سوال کو بھی ہمیشہ کے لئے صاف کر دیا، آپ کے حرم میں جہاں ایک طرف حضرت عائشہ رضؓ اور حضرت حفصہ رضؓ جیسی قریشی خواتین شامل تھیں وہیں دوسری طرف حضرت صفیہ بھی تھیں جو ایک یہودی سردار کی لڑکی تھیں مگر جنگی قیدیوں میں بطور باندی کے لائی گئی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں آزاد کر کے اپنے حرم میں داخل کیا تھا، اسی طرح حضرت ماریہ قبطیہ فرعون کے خاندان

سے تھیں اور باندی کے طور پر لائی گئی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حرم میں داخل کرنے کا شرف انھیں بخشا تھا۔

عرب کے خیالات کے مطابق لونڈی غلام نہایت گھٹیا درجہ کی مخلوق تھی، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں عورتوں کو حضرت عائشہ رضؓ اور حفصہ رضؓ کے برابر درجہ دے کر حسب و نسب کی اونچ نیچ کے تصور کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا۔

یہی حقیقت پیشہ کی اونچ نیچ کی بھی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہ رضؓ حضرت سودہ رضؓ کے ساتھ نکاح فرمایا اور یہ دونوں بیویاں کھالوں کے دھونے اور رنگنے کا کام کرتی تھیں —— حضرت ام سلمہ کا بیان ہے کہ جس وقت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم میرے مکان پر نکاح کا پیغام دینے تشریف لائے اس وقت میں ایک کچی کھال کو دھو رہی تھی، میں نے کیکر کے پتوں سے ہاتھ دھو کر آپؐ کو اندر آنے کی اجازت دی اور آپؐ کے لئے چمڑے کا ایک گدا ڈال دیا اور آپؐ اس پر تشریف فرما ہو گئے —— آج کھالوں کے دھونے کا کام بہت گھٹیا شمار کیا جاتا ہے، لیکن اگر ہم حضورؐ کی ان بیویوں کے بارے میں حقارت کا ادنیٰ تصور کریں تو یہ سخت ترین گناہ کی بات ہوگی۔

کفو کا مسئلہ محدثین اور فقہاء کی نظر میں

متاخرین فقہاء نے کفو اور جوڑ کے مسئلہ کو بہت زیادہ پھیلا دیا ہے اور ذات پات اور پیشوں کی اس طرح درجہ بندی کی ہے کہ اس سے جاہلی دور کی اونچ نیچ کا تصور پیدا ہونے لگتا ہے، حالانکہ محدثین میں حافظ ابن حجر عسقلانی اور علامہ عینی شارحینِ بخاری نے تصریح کر دی ہے کہ:

—— عرب کے مختلف قبیلوں کے درمیان نسب کے لحاظ سے اونچ نیچ اور عرب اور عجم کے درمیان قومی امتیاز اور مختلف پیشوں کے لحاظ سے تحقیر و تذلیل کا تصور کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ (تفصیل کے لئے فتح الباری ج ۹ ص ۱۰۸ اور عینی شرح بخاری ج ۱۰ ص ۳۷۸ کا مطالعہ کیا جائے)

ان محدثین نے ثابت کیا ہے کہ جس حدیث سے بعض فقہاء نے استدلال کیا ہے وہ ضعیف اور موضوع ہے۔

صحابہؓ میں عبداللہ ابن مسعودؓ، تابعین میں ابن سیرینؒ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا یہی مسلک تھا۔

فقہاء میں امام مالکؒ نے وضاحت کے ساتھ کہا ہے کہ کفاءۃ کا اعتبار صرف دین میں ہوگا اس کے بعد تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی شمار ہوں گے۔

فقہاء احناف میں امام اعظمؒ کی پہلی رائے امام مالکؒ کے موافق تھی، بعد میں امام صاحبؒ نے اپنے شاگردوں امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کی رائے سے اتفاق کر لیا اور نسب اور پیشوں میں کفاءت کو تسلیم کر لیا، لیکن بعد کے حنفی فقہاء نے اس کی تشریح کر دی ہے کہ آئمہ احنافؒ کا یہ مسلک کسی حدیثؐ پر مبنی نہیں ہے۔

بحر الرائق نے لکھا ہے:

لان الناس یتفاخرون بشرف الحرف و یتعبرون بدناء تہا ص ۱۳۱

"یعنی اس دور میں لوگ نسبی تفاخر اور پیشوں میں اونچ نیچ کے تصور میں مبتلا ہو گئے تھے ان حضرات نے گھریلو زندگی کو کشیدگی سے بچانے کے لئے مصلحۃً یہ رائے دی کہ شادی بیاہ میں لڑکے اور لڑکی کے درمیان نسب اور پیشہ کے لحاظ سے برابری کا لحاظ رکھا جائے۔"

اس رائے کا یہ مطلب نہیں کہ ائمہ احناف نسب و پیشہ میں اونچ نیچ کو تسلیم کرتے لگے تھے۔

اس لئے بعد کے علماء احناف نے کفو کے مسئلہ میں جو غلو اور افراط سے کام لیا ہے وہ متقدمین فقہاء احناف کی صحیح ترجمانی نہیں، موجودہ دور کے دو بڑے حنفی عالم اور مفتی (حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ صاحبؒ اور حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ) نے کفو کی اس درجہ بندی کی تردید کی ہے اور اسے اسلامی تعلیم کے خلاف کہا ہے۔ راقم نے اس مسئلہ پر علیحدہ ایک کتابچہ لکھا ہے اسے دیکھا جائے۔

بیویوں کی دلجوئی کے چند واقعات:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں کے ساتھ بہت دل جوئی اور محبت کے ساتھ پیش

آتے تھے۔

حضرت عائشہ رض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم میں سب سے کم عمر رکھتی تھیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم انھیں خوش کرنے کے لیے ان کی سہیلیوں کے پاس گڑیاں بھیجتے تھے، حضرت عائشہ رض کے پاس جو گڑیاں تھیں ان میں ایک گڑیا گھوڑے نما تھی جس کے اوپر دو پر بھی لگے ہوئے تھے (آج کل کے براق جیسی ہوگی) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف اشارہ کرکے فرمایا عائشہ رض! یہ پَردار گھوڑا کیا ہے؟ ——— حضرت عائشہ رض نے برجستہ جواب دیا، کیا حضرت سلیمانؑ کے گھوڑے کے پَر نہیں تھے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ سُن کر ہنسنے لگے (ابوداؤد)

حضرت عائشہ رض کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کے موقعہ پر حبشی سپاہیوں کو نیزہ بازی کے کرتب دکھائے اور اپنی آڑ میں انھیں لیے کھڑے رہے (بخاری)

ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہ رض کے درمیان کچھ رنجش ہوگئی۔ اور دونوں میاں بیوی نے اس معاملہ میں حضرت ابوبکر رض کو ثالث بنایا، بیان دیتے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، پہلے تم بیان دیتی ہو یا میں بیان دوں، حضرت عائشہ رض بولیں، پہلے آپ ہی بیان کیجیے، مگر سچ بولیے گا ——— حضرت عائشہ رض نے یہ جملہ بے تکلفی اور نسوانی ناز کے طور پر کہا لیکن حضرت ابوبکر رض کی ایمانی عقیدت جوش میں آگئی، غصّہ میں آکر بیٹی کے ایک طمانچہ مارا اور فرمایا۔ اے نفس کی دشمن! کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم جھوٹ بھی بول سکتے ہیں؟ حضرت عائشہ رض! مارے خوف کے باپ کے غصّہ سے بچنے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیٹھ کے پیچھے آگئیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خسر ابوبکر رض کو روکا اور فرمایا، ابوبکر رض ہم نے تمھیں اس (مار پیٹ) کے لیے تھوڑا ہی بلایا تھا۔[۱]

بے جا دلجوئی پر وحی الٰہی کی ناراضگی:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی سیرت نے ہدایت کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا۔

[۱] یہ تینوں واقعات میاں بیوی کے حقوق از مفتی عبد الغنی صاحب مدرسہ امینیہ سے لئے گئے ہیں

جس طرح عورتوں کے ساتھ محبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں موجود ہے اسی طرح آپؐ کی زندگی نے یہ بھی بتایا ہے کہ بیوی کے ساتھ محبت خدا کی مرضی کے حدود میں رہنی ضروری ہے، ورنہ وہ محبت معصیت ہو گی، ایک دفعہ چند بیویوں کی خاطر داری کے خیال سے آپؐ نے شہد نہ پینے کا عہد کر لیا اور ایک دفعہ ازواج مطہرات نے سوکناپے کا مظاہرہ کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مجبور کر دیا اور آپؐ نے حضرت ماریہ قبطیہ رضؓ سے علٰحدہ رہنے کا عہد کر لیا خدا تعالیٰ کو یہ بات ناپسند ہوئی اور سورۂ تحریم کی یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِکَ

"اے نبی! (صلی اللہ علیہ وسلم) تم نے وہ چیز اپنے اوپر کیوں حرام کر لی جسے خدا تعالیٰ نے آپؐ کے لئے حلال کر رکھا ہے، محض چند بیویوں کی رضا جوئی کے لئے"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آسمانی تنبیہ کے بعد اپنا عہد توڑا اور اس کا کفارہ ادا کیا، یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں امت کو ہدایت دینے کے لئے پیش آیا، ورنہ اپنی فطرت کے لحاظ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی انسان کی خاطر ایسا کوئی فعل نہیں کر سکتے تھے جو خدا کی مرضی سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔

غلبہ توحید کے جوش میں حضرت عائشہ رضؓ کا سوء ادب:

حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ پر منافقین نے تہمت کا جو طوفان اٹھایا، اس کی صفائی اور برأت خدا کی طرف سے ایک مہینہ کے بعد نازل ہوئی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سورۂ نور کی وہ آیات لے کر حضرت عائشہ رضؓ کے پاس آئے جو اپنے میکہ آئی ہوئی تھیں، آپؐ نے حضرت عائشہ رضؓ کو وہ خوشخبری سنائی، آپؐ کی ساس حضرت اُمّ رومان رضؓ نے بیٹی سے کہا قومی الی رسول اللہ ﷺ "بیٹی! کھڑی ہو جاؤ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شکریہ ادا کرو" حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا، اماں! میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شکریہ کیوں ادا کروں، اس خدا کا شکر کیوں نہ ادا کروں جس نے میری پاکدامنی کا اپنے کلام میں اعلان فرمایا ہے۔

حضرت عائشہ رضؓ کے پاس مذاقِ توحید کی جو پختگی تھی، یہ اس کا اظہار تھا، اسی لئے بظاہر سوءِ ادب پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ناراض نہیں ہوئے بلکہ آگے بڑھ کر محبت میں حضرت عائشہ رضؓ کا ہاتھ پکڑ لیا، عائشہ صدیقہ رضؓ غصہ میں بھری ہوئی تھیں، کیوں کہ اس تہمت کے دوران حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ حضرت عائشہ رضؓ کی طرف سے کم ہوگئی تھی، حضرت عائشہ رضؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ جھٹک کر چھڑالیا، لیکن یہ سختی ان کے والد حضرت ابوبکر رضؓ کو گوارا نہیں ہوئی اور انھوں نے حضرت عائشہ رضؓ کو تنبیہ فرمائی۔

(تفسیر ابن کثیر سورۂ نور)

تجھ میں حور و قصور رہتے ہیں
میں نے مانا ضرور رہتے ہیں
میرے دل کا طواف کر جنّت
میرے دل میں حضور رہتے ہیں
صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جمالیاتی ذوق

صحت، صفائی، ظرافت، لباس و معاشرت

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح روحانی اخلاق میں نہایت اعلیٰ اور بلند ذوق رکھتے تھے، اسی طرح ظاہری اور جسمانی جمال میں بھی آپؐ نہایت اونچے اور معیاری مذاق کے مالک تھے

ایک حدیث قدسی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ جَمِیْلٌ وَّ یُحِبُّ الْجَمَالَ ——— "خدا تعالیٰ کی ذات حسن و جمال کے کمالات کا سرچشمہ ہے اور وہ اپنی مخلوق میں بھی جمال کو پسند کرتا ہے"

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی خدا تعالیٰ کے اخلاق کا عکسِ جمیل تھی اس لئے آپؐ کے اندر بھی جمالِ باطنی اور جمال ظاہری دونوں بدرجۂ کمال موجود تھے، آپؐ دوسروں کے اندر بھی یہی ذوق دیکھنا پسند کرتے تھے۔

اُمّت کو جمال پسندی کی ترغیب:

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کو بھی لباس اور شکل و صورت میں حسن و جمال کے ساتھ رہنے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔

احادیث میں آتا ہے: ———

ان النبی کان یاخذ من لحیتہ من عرضھا و طولھا (شرح ابن عربی ج ۱ ص ۲۱۹)

"حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ریش مبارک کو طول اور عرض دونوں میں تراشا کرتے تھے" ——— یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا عمل تھا، صحابہ کرامؓ کو بھی آپؐ حسنِ ہیئت کے ساتھ رہنے کی تاکید فرماتے تھے۔

ایک روز آپؐ مسجد پاک میں رونق افروز تھے کہ ایک صحابی آئے جن کی سر اور داڑھی کے

بال اُلجھے ہوئے اور پراگندہ تھے، آپؐ نے انھیں دیکھ کر فاشار الیہ رسول اللہ بیدہ ان اُخرُج ــــــ "ہاتھ کے اشارہ سے حکم دیا کہ واپس چلے جاؤ"

وہ صحابی سمجھ گئے کہ حضور مجھے مسجد سے باہر جانے کی کیوں ہدایت فرما رہے ہیں، یہ واپس چلے گئے ــــــ ففعل الرجل ثم رجع فقال الیس ھذا خیرًا من ان یاتی احدکم ثائر الراس کانہ شیطان؟ ــــــ "اور اپنے بال سنوار کر واپس آئے، آپؐ نے فرمایا، کیا اب تم اچھی حالت میں نہیں ہو، اس پہلی صورت سے کہ تمھارے بال پراگندہ تھے گویا کہ شیطان ہے۔" (موطا امام مالکؒ مطبوعہ مصر مع شرح زرقانی ج ۴ ص ۳۳۸)

ایک بدہیئت انسان کو شیطان سے تشبیہ دے کر آپؐ نے ظاہر کیا کہ صورت ولباس کو خراب خستہ رکھنا کس قدر ناپسندیدہ ہے۔

ایک صحابی کی مونچھیں اور لبیں بڑھی ہوئی تھیں آپؐ نے مسواک اور استرا منگایا اور بڑھے ہوئے بال مسواک پر رکھ کر استرے سے انھیں کاٹ دیا۔ (ابوداؤد الطیالسی مطبوعہ ہند ص ۹۵)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا، جس کے کپڑے میلے کچیلے تھے، آپؐ نے اس سے فرمایا ــــــ اما کان ھذا یجد ماءً ا یغسل بہ ثوبہ ــــــ "کیا اس کے پاس پانی نہیں ہے جس سے اپنے کپڑے صاف کرے۔" (ابوداؤد مصری ج ۴ ص ۵۲)

ایک حدیث میں آپؐ نے امامت کے حق دار پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:

یؤم القوم اقرءھم لکتاب اللہ فاقدمھم ھجرۃ فان کانوا سواءً فلیؤمھم احسنھم وجھًا ــــــ "قوم کی امامت وہ شخص کرے جو سب سے زیادہ قرآن کا علم رکھتا ہو، پھر وہ کرے جو ہجرت میں مقدم ہو، اور اگر ان باتوں میں سب برابر ہوں تو وہ امامت کرے جو شکل وصورت میں سب اچھا ہو۔ (بخاری کتاب الکنی مطبوعہ ہند ص ۵۳) (الدین والجمال تالیف ابوالنصر احمد الحسینی مطبوعہ مصر ص ۴۹)

دین کی آسانی کا اعلان کس موقعہ پر کیا:

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عجیب موقع پر دین اسلام کے آسان اور سہل ہونے کا اعلان

فرمایا ــــــ حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کے دن مجھے حبشیوں کی نیزہ بازی کے کرتب دکھانے کے لئے مجھے اپنے پیچھے کھڑا کر لیا۔

وضع رسول اللہ ذقتی علی منکبیہ لانظرالی زفن الحبشۃ حتی کنت التی مللت فانصرفت عنہ ــــــ "حضور نے میری ٹھوڑی اپنے کندھے پر رکھ لی، تاکہ میں پیچھے کھڑی ہو کر حبشیوں کے کرتب دیکھ سکوں، اس وقت آپؐ اس وقت تک کھڑے رہے جب تک میں تھک نہ گئی اور خود ہی پیچھے نہ ہٹ گئی"۔

عروہؓ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا کہ اس موقعہ پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا ــــــ لتعلم یھود ان فی دیننا فُسحۃً انی اُرسلتُ بحنیفیۃٍ سمحۃٍ ــــــ "یہود کو جاننا چاہیئے کہ ہمارے دین میں آسانی اور وسعت ہے اور میں آسان حنیفی دین دے کر بھیجا گیا ہوں۔ (ابن کثیر ج ۲ ص ۱۹۸)

فُسحۃً کے معنی وسعت، گنجائش کے ہیں، مکان اور راستہ کا کشادہ ہونا، مکان کا آرام دہ ہونا، مجلس میں کھل کر بیٹھنا، چوڑے اور کشادہ سینے والا ہونا ــــــ اس کے مفہوم میں شامل ہے۔

فُسحۃً ــــــ رخصت اور فرصت کے دن کو بھی کہتے ہیں، قرآن کریم نے بھی اسی معنی میں اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔

یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِیْلَ لَکُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا یَفْسَحِ اللہُ لَکُمْ وَاِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا یَرْفَعِ اللہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ وَاللہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ (سورہ مجادلہ رکوع ۲) ــــــ "اے ایمان والو! جب تم سے کہا جائے کہ کھل کر بیٹھو مجلسوں میں تو کھل کر بیٹھ جایا کرو، خدا تعالیٰ تمہارے (جملہ کاموں میں) کشادگی پیدا کرے گا، اور جب کہا جائے کہ اٹھ جاؤ، تو اٹھ جایا کرو، اللہ تعالیٰ بلند کرے گا ایمان والوں اور علم والوں کو درجات میں، بے شک وہ خبر رکھنے والا ہے"۔

اسی طرح سمحہ کے معنی سخاوت کرنا، نرم ہونا، نرم چال چلنا، معاف کرنا، اجازت

دنیا، فراخ، دکشادہ ہونا ——— کے آتے ہیں اور اس کا مطلب بھی قریب قریب وہی نکلتا ہے جو فسحۃ کا بیان کیا گیا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ کھیل کو دسے دلچسپی لینے پر یہود نے اعتراض کیا ہو کہ یہ نبی ہو کر نیزہ بازی کے کرتب دیکھتے ہیں اور اپنی اہلیہ کو دکھاتے ہیں، اس کے جواب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہو کہ اسلام میں اتنی تنگی نہیں اس میں کشادگی اور نرمی ہے۔

صحتِ جسمانی اور ورزش کا خیال:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑے روحانی انسان تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ آپؐ اپنے جسم کی صحت اور طاقت کا بھی پورا پورا خیال رکھتے تھے ——— بچپن میں آپؐ نے تیرنا سیکھا مدینہ میں اپنے ننھیال مکان کے سامنے سے جب آپؐ گذرا کرتے تو ایک تالاب کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کرتے تھے ——— "میں نے اس تالاب میں تیرنا سیکھا ہے اور میں اسی میدان میں انیسہ لڑکی کے ساتھ کھیلا کرتا تھا" (ابن سعد ج ۱ ص ۷۳)

رُکانہ عرب کا مشہور پہلوان تھا یہ ایک روز مکہ کی ایک گھاٹی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مل گیا، آپؐ نے اس کے سامنے اسلام پیش کیا، وہ بولا ——— محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر تم پر حق ظاہر ہو جائے تو میں آپؐ کی صداقت کو تسلیم کر لوں گا، وہ پہلوان آدمی تھا، علم اور دلیل سے اُسے کیا واسطہ تھا، آپؐ نے اُسی کے ذہن کے مطابق فرمایا ——— اچھا اگر میں تجھے زیر کر دوں تو تُو مجھے نبی مان لے گا۔ اُس نے اقرار کر لیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم تیار ہو گئے دونوں کی کشتی ہوئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رُکانہ کو زیر کر دیا، رُکانہ کو بڑی حیرت ہوئی کیونکہ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ "محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) روحانی آدمی ہیں ان میں جسمانی طاقت کہاں ہوگی ———!

لیکن اس کی رائے غلط نکلی، وہ پھر کھڑا ہوا اور بولا ——— ایک دفعہ اور لڑوں گا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم پھر لڑے اور پھر اُسے زیر کر دیا، اب اسے یقین آ گیا کہ میں "محمد" سے نہیں جیت سکتا حضور نے عہد یاد دلایا، رکانہ عہد سے پھر گیا اور کہتا ہوا چلا گیا ——— تم جادوگر ہو ——— بڑے جادوگر (اصح السیر)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شہسواری کا اور تیر اندازی کا بہت شوق تھا، صحابہ کرام رضؓ کو آپؐ اس کی ترغیب دیتے تھے اور شوق دلاتے تھے اور اپنے سامنے لوگوں سے مشق کراتے تھے، ایک غزوہ میں حضرت عائشہ رضؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رفیقِ سفر تھیں، راستہ میں آپؐ نے صحابہ رضؓ کو حکم دیا سب آگے بڑھ جاؤ، سب آگے بڑھ گئے، آپؐ پیچھے رہ گئے، پھر حضرت عائشہ رضؓ سے فرمایا۔ آؤ عائشہ دوڑ لگائیں حضرت عائشہ رضؓ تیار ہو گئیں، آپس میں دوڑ ہوئی حضرتِ عائشہؓ دبلی پتلی تھیں، حضورؐ بھاری تھے، یہ نکل گئیں کئی سال کے بعد پھر اسی قسم کا موقعہ آیا حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں اب میں بھاری ہو گئی تھی، اب جو ہم دونوں دوڑے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم آگے نکل گئے اس پر فرمایا:

"عائشہ ——! یہ اُس کا جواب ہے"۔ (سیرت عائشہ بحوالہ ابوداؤد)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا —— "قوی مسلمان خدا کے نزدیک کمزور مسلمان سے زیادہ بہتر اور زیادہ محبوب ہے"۔ (مسلم کتاب القدر باب فی الامر بالقوۃ وترک العجز)۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انسان کی صحت اچھی ہو گی تو خدا کی عبادت اور مخلوق کی خدمت اچھی طرح کر سکے گا، —— صحت خراب ہو گی تو اس میں سستی و کاہلی ہو گی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عام زندگی غریبانہ رہی ہے مگر آپؐ کی زندگی میں "اچھے کھانے" اور اچھے پہننے کا نمونہ بھی موجود ہے اور ایک مکمل زندگی میں اس کا ہونا بھی ضروری تھا، چنانچہ آپؐ نے دُودھ اور کھجوریں استعمال فرمائیں اور امت کو بتایا، یہ بہترین کھانا ہے —— سبزیوں میں کدو کی بڑی تعریف فرمائی اور کہا اس سے غمگین قلب کو تسکین حاصل ہوتی ہے —— خُرفہ کے ساگ کے متعلق فرمایا، یہ دردِ سر کے لئے بہت مفید ہے —— کچے لہسن اور پیاز سے آپؐ ہمیشہ دُور رہے، صفائی، ستھرائی کو ایمان کا جُزو قرار دیا، لباس کے بارے میں فرمایا، سفید کپڑوں سے حلم و وقار ٹپکتا ہے۔

عام طور پر دنیا کا یہ خیال تھا کہ میلے کچیلے کپڑوں اور اُول جَلُول ہیئت رکھنے والے لوگ بڑے پہنچے ہوئے ہوتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس خیال کو اپنے عمل سے غلط قرار دیا، آپؐ ہمیشہ صاف ستھرے رہتے تھے، بالوں میں کنگھی اور آنکھوں میں سرمہ لگانے کا اہتمام رکھتے تھے —— ؛

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس

آدمی کی شخصیت کا واضح اظہار اس کے لباس سے بھی ہوتا ہے۔ اس کی وضع قطع، قصر و طول، رنگت، معیار، صفائی اور ایسے ہی مختلف پہلو بتا دیتے ہیں کہ کسی لباس میں ملبوس شخصیت کس ذہن و کردار سے آراستہ ہے۔ نبی اکرم کے لباس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء نے جو معلومات دی ہیں وہ بڑی حد تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذوق کو نمایاں کر دیتی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لباس کے معاملے میں درحقیقت اس آیت کی عملی شرح پیش فرمائی۔

یَا بَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَرِیْشًا وَلِبَاسُ التَّقْوٰی ذٰلِکَ خَیْرٌ (سورہ اعراف: ۲۶) ——— "اے اولادِ آدم! ہم نے تمہارے ستر ڈھانکنے والا اور تمہیں زینت دینے والا لباس تمہارے لئے مقرر کیا ہے اور لباسِ تقویٰ بہترین ہے۔

لباس کا دوسرا پہلو ——— سرابیل تقیکم الحر و سرابیل تقیکم باسکم ——— "تمہیں گرمی سے بچانے اور جنگ میں محفوظ رکھنے کے لئے قمیص اور زرہیں فراہم کیں" (سورہ النحل) کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس ساتر تھا۔ زینت بخش تھا اور بایں ہمہ لباس تقویٰ تھا، اس میں ضرورت کا بھی لحاظ تھا، وہ چند کڑے اخلاقی اصولوں کی پابندی کا مظہر بھی تھا اور ذوقِ سلیم کا ترجمان بھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کبر و ریا سے بُعد تھا اور ٹھاٹھ باٹھ سے رہنا ناپسند تھا۔ فرمایا انما انا عبد البس کما یلبس العبد ——— "میں تو بس ایک خدا کا بندہ ہوں اور بندوں کی طرح کا لباس پہنتا ہوں"۔ ریشم، دیبا اور حریر کو مردوں کے لئے آپؐ نے حرام قرار دیا۔ ایک بار تحفہ میں آئی ہوئی ریشمی قبا پہنی اور پھر فوراً اضطراب کے ساتھ اتار پھینکی (مشکوٰۃ) تہہ بند، قمیص اور عمامہ کی لمبائی چونکہ علامتِ کبر تھی اور یہ طریق لباس متکبرین میں رائج تھا۔ اس سے سخت تنفر تھا، دوسری قوموں خصوصاً مذہبی طبقوں کے مخصوص فیشنوں کی تقلید اور نقالی کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

ممنوع ٹھہرایا۔ تاکہ امت میں اپنی خودی اور عزّتِ نفس برقرار رہے۔ نیز فیشن اور لباس کی تقلید نظریات وکردار کی تقلید پیدا کرنے کا سبب نہ بن سکے۔

آپؐ کو کرتا (قمیص) بہت پسند تھا، کرتے کی آستین نہ تنگ رکھتے نہ زیادہ کھُلی، درمیانی ساخت پسند تھی۔ آستین کلائی اور ہاتھ کے جوڑ تک پہنچتی، سفر (خصوصاً جہاد) کے لئے جو کرتا پہنتے اس کے دامن اور آستین کا طول ذرا کم ہوتا، قمیص کا گریبان سینہ پر ہوتا جسے کبھی کبھار (موسمی تقاضے سے) کھلا بھی رکھتے، اور اسی حالت میں نماز پڑھتے، کرتے میں جیب بھی ہوتی جو سینہ پر ہوتی (ترجمہ البخاری باب جیب القمیص من عند الصدر) ——— عمر بھر تہہ بند (لنگی) استعمال فرمایا جسے ناف سے ذرا نیچے باندھتے اور نصف ساق تک (ٹخنوں سے ذرا اونچا) رکھتے۔

پاجامہ (سراویل) دیکھا تو پسند کیا۔ آپؐ کے صحابی پہنتے تھے۔ ایک بار خود خرید فرمایا (اختلاف ہے کہ پہنا یا نہیں) اور وہ آپؐ کے ترکہ میں موجود تھا۔ اس کی خریداری کا قصّہ دلچسپ ہے حضرت ابوہریرہؓ کو ساتھ لئے ہوئے حضورؐ بازار گئے اور بزازوں کے ہاں تشریف لے گئے، چار درہم کا پاجامہ خریدا بازار میں اجناس کو تولنے کے لئے ایک خاص وزّان مقرر تھا۔ آپؐ نے اس سے کہا تولو (اتزن وارجح) وزان کہنے لگا کہ یہ الفاظ میں نے کسی اور سے کبھی نہیں سُنے۔ حضرت ابوہریرہؓ نے توجہ دلائی الاتعرف نبیکؐ تم اپنے نبی پاک کو پہچانتے نہیں۔ وہ ہاتھ چومنے کو بڑھا تو آپؐ نے روکا کہ عجمیوں کا (یعنی غیر اسلامی) طریقہ ہے، بہرحال وزن کرایا اور پاجامہ خرید کر لے چلے حضرت ابوہریرہؓ نے بڑے تعجب سے پُوچھا کہ کیا آپؐ اسے پہنیں گے؟ تعجب غالباً اس بنا پر ہوا ہوگا کہ ایک تو دیرینہ معمول میں ایسی نمایاں تبدیلی عجیب لگی، دوسرے پاجامہ اہلِ فارس کا لباس تھا، اور تشبہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتناب معلوم تھا (حالانکہ دوسرے تمدنوں کے اچھے اجزاء کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم قبول فرماتے تھے) آپؐ نے جواب دیا "ہاں پہنوں گا، سفر میں بھی حضر میں بھی، دن کو بھی، رات کو بھی۔ کیونکہ مجھے حفظِ ستر کا حکم دیا گیا ہے، اور اس سے زیادہ ستر پوش لباس کوئی نہیں"۔

سر پر عمامہ باندھنا پسند خاص تھا، نہ بہت بڑا ہوتا تھا نہ چھوٹا، ایک روایت کے لحاظ سے، گز

لمبائی ہوتی تھی۔ عمامہ کا شملہ بالشت بھر ضرور چھوڑتے جو پیچھے کی جانب دونوں شانوں کے درمیان رہتا۔ آخری پلّو پیچھے کے رُخ اڑس لیتے، تمازت آفتاب سے بچنے کے لئے شملہ کو پھیلا کر سر پر ڈال لیتے اسی طرح موسمی حالات تقاضا کرتے تو آخری بل ٹھوڑی کے نیچے سے لے کر گردن کے گرد لپیٹ بھی لیتے، تمازت آفتاب سے بچنے کے لئے شملہ کو پھیلا کر سر پر ڈال لیتے۔ اسی طرح موسمی حالات تقاضا کرتے تو آخری بل ٹھوڑی کے نیچے سے لے کر گردن کے گرد لپیٹ بھی لیتے۔ کبھی عمامہ نہ ہوتا تو کپڑے کی ایک دھجّی (رومال) پٹی کی طرح سر سے باندھ لیتے۔ بطورِ نظافت عمامہ کو تیل کی چکنائی سے بچانے کے لئے ایک خاص کپڑا (عربی نام قناع) بالوں پر استعمال کرتے، جیسے کہ آج کل بھی بعض لوگ ٹوپیوں کے اندر کاغذ یا سلولائیڈ کا ٹکڑا رکھ لیتے ہیں۔ یہ دھجی چکنی تو ہو جاتی مگر نظافت کا یہ حال تھا کہ (روایت میں تصریح ہے) اسے کبھی میلا اور گندہ نہیں دیکھا گیا۔ سفید کے علاوہ مٹیالا خاکستری مائل یا شتری رنگ کا عمامہ بھی باندھا ہے اور فتح مکہ کے موقعہ پر سیاہ بھی استعمال فرمایا: عمامہ کے نیچے کپڑے کی ٹوپی بھی استعمال میں رہی۔ اور اسے پسند فرمایا۔ نیز روایات کے بموجب عمامہ کے ساتھ ٹوپی کا یہ استعمال گویا اسلامی ثقافت کا مخصوص طرز تھا اور اسے آپؐ نے مشرکین کے مقابلے میں امتیازی فیشن قرار دیا۔

عمامہ کے علاوہ کبھی خالی سفید ٹوپی بھی اوڑھتے۔ گھر میں اوڑھنے کی ٹوپی کی باڑ چھوٹی ہوتی سفر پر نکلتے تو اونچی باڑ کی ٹوپی استعمال فرماتے، سوزنی نما سلے ہوئے کپڑے کی دبیز ٹوپی بھی پہنی ہے۔ اوڑھنے کی چادر ۴ گز لمبی ۲½ گز چوڑی ہوتی تھی۔ کبھی لپیٹ لیتے، کبھی ایک پلّو سیدھے بغل سے نکال کر الٹے کندھے پر ڈال لیتے۔ یہی چادر کبھی کبھار بیٹھے ہوئے ٹانگوں کے گرد لپیٹ لیتے۔ اور بعض مواقع پر اسے تہہ کر کے تکیہ بھی بنا لیتے۔ معزز ملاقاتیوں کی تواضع کے لئے چادر اتار کر بچھا بھی دیتے۔ یمن کی چادر جسے حَبِرہ کہا جاتا تھا بہت پسند تھی۔ اس میں سُرخ یا سبز دھاریاں ہوتی تھیں ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے سیاہ چادر (غالباً بالوں کی) بھی منگوائی گئی اسے اوڑھا تو پسینے کی وجہ سے بُو دینے لگی۔ چنانچہ نظافت کی وجہ سے اسے نہیں اوڑھا۔

جہاں ایک طرف فقر و سادگی کی وہ شان تھی وہاں دوسری طرف آپؐ کو رہبانیت کا سدِ باب بھی کرنا تھا اور اس اصول کا مظاہرہ بھی مطلوب تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے کہ اس کی عطا کردہ نعمت (رزق) کا اثر اس کے بندے سے عیاں ہو اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کبھار اچھا لباس بھی زیبِ بدن فرمایا۔ آپؐ کا مسلک اعتدال تھا اور انتہا پسندی سے امت کو بچانا مطلوب تھا چنانچہ تنگ آستین کا رومی جُبّہ بھی پہنا، سرخ دھاری کا اچھا جوڑا بھی زیبِ تن کیا طیلسانی قسم کا کسروانی جبّہ بھی کبھی کبھی پہنا۔ جس کے گریبان کے ساتھ ریشمی گوٹ لگی تھی اور ایک بار ۲۷ اونٹنیوں کے بدلے میں ایک قیمتی جوڑا خرید فرمایا، اور پہنا اور اس کے ساتھ نماز بھی پڑھی۔

کپڑوں کے لئے سب سے بڑھ کر سفید رنگ مرغوب خاطر تھا، فرمایا "حق یہ ہے کہ تمہارے لئے مسجدوں میں بھی اور قبروں میں بھی اللہ کے سامنے جانے کا بہترین لباس ہے"۔ فرمایا "سفید کپڑے پہنا کرو اور سفید ہی کپڑے سے اپنے مُردوں کو کفن دو کیونکہ یہ زیادہ پاکیزہ اور پسندیدہ ہیں"۔

سفید کے بعد سبز رنگ بھی پسندیدہ تھا، لیکن بالعموم اس شکل میں کہ ہلکی سبز دھاریاں ہوں سُرخ رنگ والی دھاریوں کے کپڑے آپؐ نے پہنے، ہلکا زرد مٹیالا یا شتری رنگ بھی لباس میں دیکھا گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جوتا مروجہ عربی تمدن کے مطابق چپل یا کھڑاؤں کی شکل کا تھا۔ جس کے ۲ تسمے تھے ایک انگوٹھے اور ساتھ والی انگلی کے درمیان رہتا، دوسرا چھنگلی اور اس کے ساتھ والی انگلی کے بیچ میں، جوتے پر بال نہ ہوتے تھے جیسے کہ معمولی ذوق کے لوگوں کے جوتوں پر ہوتے۔ یہ ایک بالشت ۲، انگل لمبا تھا۔ تلوے کے پاس سے سات انگل چوڑا اور دونوں تسموں کے درمیان پنجے سے دو انگل کا فاصلہ تھا۔ کبھی کھڑے ہو کر پہنتے، کبھی بیٹھ کر بھی پہنتے پہلے دایاں پاؤں ڈالتے پھر بایاں اور اتارتے ہوئے پہلے بایاں پاؤں نکالتے پھر دایاں۔

جرابیں اور موزے بھی استعمال میں رہے سادہ اور معمولی بھی اور اعلیٰ قسم کے بھی، شاہ نجاشی نے سیاہ رنگ کے سادہ موزے بطور تحفہ بھیجے تھے۔ انھیں پہنا اور ان پر مسح فرمایا، اسی طرح سے

دحیہ کلبی نے بھی موزے تحفہ میں پیش کئے تھے۔ چاندی کی انگوٹھی بھی استعمال فرمائی جس میں کبھی چاندی کا نگینہ ہوتا تھا کبھی حبشی پتھر کا۔ انگوٹھی بالعموم داہنے ہاتھ میں پہنتے۔ کبھی کبھار بائیں میں بھی۔ درمیانی اور شہادت کی انگلی میں نہ پہنتے۔ چھنگلی میں پہننا پسند تھا۔ نگینہ اوپر کی طرف رکھنے کی بجائے ہتھیلی کی طرف رکھتے۔ انگوٹھی پر "محمد رسول اللہ" کے الفاظ ترتیب وار نیچے سے اوپر کو تین سطروں میں کندہ تھے۔ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم خطوط پر مہر لگاتے تھے۔ محققین کی یہ رائے قرین صحت ہے کہ انگوٹھی مہر کی ضرورت سے بنوائی تھی اور سیاسی منصب کی وجہ سے اس کا استعمال ضروری تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وضع قطع اور آرائش

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بال بہت سلیقے سے رکھتے۔ ان میں کثرت سے تیل کا استعمال فرماتے کنگھا کرتے، مانگ نکالتے، لبوں کے بال تراشنے کا اہتمام کرتے، ڈاڑھی کو بھی طول و عرض میں قینچی سے ہموار کرتے، اس معاملے میں رفقاء کو تربیت دیتے۔ مثلاً ایک صحابی کو پراگندہ مو دیکھا تو گرفت فرمائی۔ ایک صحابی کی ڈاڑھی کے زائد بال بہ نفس نفیس تراشے، فرمایا کہ جو شخص سر یا داڑھی کے بال رکھتا ہو اسے چاہیے کہ ان کو سلیقے اور شائستگی سے رکھے مثلاً ابوقتادہؓ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اَکْرِمْھَا (ان کو سنوار کر رکھو)۔

یہ تاکیدیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لئے فرمائی تھیں کہ بسا اوقات مذہبی لوگ صفائی اور شائستگی کے تقاضوں سے غافل ہو جاتے ہیں۔ خصوصاً رنگِ تصوف جب بڑھتا ہے اور رہبانیت ابھرتی ہے تو غلیظ رہنا علو مرتبت کی دلیل بن جاتا ہے، اس خطرے کا سدِ باب فرمایا۔

سفر و حضر میں سات چیزیں ہمیشہ ساتھ رہتیں (۱) تیل کی شیشی (۲) کنگھا (ہاتھی دانت کا بھی) (۳) سرمہ دانی (سیاہ رنگ کی) (۴) قینچی (۵) مسواک (۶) آئینہ (۷) لکڑی کی ایک پتلی پھچی۔

سرمہ رات کو سوتے ہوئے (تاکہ زیادہ نمایاں نہ ہو) تین تین سلائی دونوں آنکھوں میں ڈالتے

آخر رات میں حاجات سے فارغ ہو کر وضو کرتے۔ لباس طلب کرتے اور خوشبو لگاتے۔ ریحان کی خوشبو پسند تھی، مہندی کے پھول بھی بھینی خوشبو کی وجہ سے مرغوب تھے، مشک اور عود کی خوشبو سب سے بڑھ کر پسندیدہ رہی۔ گھر میں خوشبودار دھونی لیا کرتے۔ ایک عطردان تھا جس میں بہترین خوشبو موجود رہتی اور استعمال میں آتی (کبھی حضرت عائشہ رضؓ اپنے دستِ مبارک سے خوشبو لگاتیں) مشہور بات ہے کہ آپؐ جس کوچے سے گذر جاتے دیر تک اس میں مہک رہتی تھی! ور فضائیں بتاتی تھیں کہ "گذر گیا ہے ادھر سے وہ کاروانِ بہار"۔ خوشبو ہدیہ کی جاتی تو ضرور قبول فرماتے اور کوئی اگر خوشبو کا ہدیہ لینے میں تامل کرتا تو ناپسند فرماتے، اسلامی ثقافت کے مخصوص ذوق کے تحت آپؐ نے مردوں کے لئے ایسی خوشبو پسند فرمائی جس کا رنگ مخفی رہے اور مہک پھیلے اور عورتوں کے لئے وہ جس کا رنگ نمایاں ہو۔ مہک مخفی رہے۔

رفتار:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چال عظمت، وقار، شرافت، اور احساس ذمہ داری کی ترجمان تھی، چلتے تو مضبوطی سے قدم جما کر چلتے، ڈھیلے، ڈھالے طریق سے قدم گھسیٹ کر نہیں، بدن سمٹا ہوا رہتا، دائیں بائیں دیکھے بغیر چلتے، قوت سے آگے کو قدم اٹھاتے۔ قامت میں آگے کی طرف قدرے جھکاؤ ہوتا، ایسا معلوم ہوتا کہ اونچائی سے نیچے کو اُتر رہے ہیں ہند بن ابی ہالہ کے الفاظ میں "گویا زمین آپؐ کی رفتار کے ساتھ ساتھ لپٹی جا رہی ہے"۔ رفتار تیز ہوتی قدم کھلے کھلے رکھتے آپؐ معمولی رفتار چلتے مگر بقول حضرت ابوہریرہ رضؓ ہم مشکل سے ساتھ دے پاتے" حضور کی رفتار یہ پیغام بھی دیتی جاتی تھی کہ "زمین میں گھمنڈ کی چال نہ چلو"۔ (سورہ لقمان)

رُوحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اندازِ تکلّم

تکلّم انسان کے ایمان، علم، کردار اور مرتبے کو پوری طرح بے نقاب کر دیتا ہے موضوعات اور الفاظ کا انتخاب، فقروں کی ساخت، آواز کا اتار چڑھاؤ، لہجہ کا اسلوب اور بیان کا زور یہ ساری چیزیں واضح کرتی ہیں کہ متکلم کس پائے کی شخصیت کا علم بردار ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب اور ذمہ داریوں کی نوعیت ایسی تھی کہ ان کا بھاری بوجھ اگر کسی دوسری شخصیت پر ڈالا گیا ہوتا تو وہ تفکرات میں ڈوب کر رہ جاتا اور اسے خلوت محبوب ہو جاتی۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات خاص میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ایک طرف آپؐ تفکرات اور مسائل مہمہ کا پہاڑ اٹھائے ہوئے رہتے، اور طرح طرح کی پریشانیوں سے گزرتے لیکن دوسری طرف لوگوں میں خوب گھلنا ملنا بھی رہتا اور دن رات گفتگوؤں کا دور چلتا۔ مزاج کی سنجیدگی اپنی جگہ تھی اور تبسّم و مزاح اپنی جگہ، اضداد میں عجیب توازن تھا، جس کا مظہر حضورؐ کی ذات تھی ایک عالمی تحریک کی ذمہ داری ایک سلطنت کے مسائل ایک جماعت اور معاشرہ کے معاملات اور پھر اپنے خاصے بڑے کنبے کی ذمہ داریاں اچھا خاصا پہاڑ تھیں جنھیں حضورؐ کے کندھے اُٹھائے ہوئے تھے۔ چنانچہ امام حسنؓ اپنے ماموں ہند بن ابی ہالہ کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم متواتر پریشانیوں میں رہتے، ہمیشہ مسائل پر غور کرتے کبھی آپؐ کو بے فکری کا کوئی لمحہ نہ ملا، دیر دیر تک خاموش رہتے اور بلا ضرورت فضول بات چیت نہ کرتے۔

آپؐ ایک داعی تھے اور ایک تحریک کے سربراہ، اس لئے تبلیغ و تعلیم اور تزکیہ اور سیاسی انتظام چلانے کے لئے لوگوں سے رابطہ ضروری تھا جس کے لئے سب سے اہم ذریعہ تکلّم ہے۔ لہٰذا دوسری طرف صورت حال حضرت زید بن ثابتؓ کے الفاظ میں یوں رہتی کہ جب ہم دنیوی معاملات کا ذکر کر رہے ہوتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس ذکر میں حصہ لیتے، جب ہم آخرت پر گفتگو کرتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہمارے ساتھ اسی موضوع پر تکلّم فرماتے اور جب

ہم لوگ کھانے پینے کی کوئی بات چھیڑتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس میں شامل رہتے۔ اس کے باوجود آپؐ نے خدا کی قسم کھا کر یہ اصولی حقیقت بیان فرمائی کہ میری زبان سے حق کے ماسوا کوئی بات ادا نہیں ہوتی۔ قرآن نے بھی وما ینطق عن الھوٰی کی گواہی دی۔

گفتگو میں الفاظ اتنے ٹھہر ٹھہر کر ادا کرتے کہ سننے والا آسانی سے یاد کر لیتا بلکہ الفاظ ساتھ ساتھ گنے جا سکتے تھے۔ اُمّ معبد نے کیا خوب تعریف بیان کی کہ گفتگو موتیوں کی لڑی جیسی پروئی ہوئی۔ الفاظ نہ ضرورت سے کم نہ زیادہ۔ "نہ کوتاہ سخن، نہ طویل گو"۔ تاکید تفہیم اور تسہیل حفظ کے لئے خاص الفاظ اور کلمات کو تین بار دہراتے بھی تھے۔ بعض امور میں تصریح سے بات کرنا مناسب نہ سمجھتے تو کنایہ میں فرماتے۔ مکروہ اور فحش اور غیر حیادارانہ کلمات سے تنفر تھا۔ گفتگو میں بالعموم مسکراہٹ شامل رہتی۔ عبداللہ بن حارثؓ کا بیان ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسی کو مسکرانے نہیں دیکھا۔ یہ مسکراہٹ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنجیدگی کو خشونت بننے سے بچاتی تھی اور رفقاء کے لئے وجہ جاذبیت ہوتی، بات کرتے ہوئے بار بار آسمان کی طرف دیکھتے، گفتگو کے دوران میں کسی بات پر زور دینے کے لئے ٹیک سے اٹھ کر سیدھے ہو بیٹھتے اور خاص جملوں کو بار بار دہراتے، حاضرین کو کسی بات سے ڈراتے تو تکلم کے ساتھ ساتھ زمین پر ہاتھ مارتے، بات کی وضاحت کے لئے ہاتھوں اور انگلیوں کے اشارات GESTURES سے بھی مدد لیتے۔ مثلاً دو چیزوں کا اکٹھا ہونا واضح کرنے کے لئے شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کو ملا کر دکھاتے کبھی دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو باہم دگر آر پار کر کے مضبوطی یا جمعیت کا مفہوم نمایاں کرتے، کسی شے یا سمت میں اشارہ کرنا ہوتا تو پورا ہاتھ حرکت میں لاتے۔ کبھی ٹیک لگائے ہوئے اہم معاملات پر بات کرتے تو سیدھے ہاتھ کو الٹے ہاتھ کی پشت پر رکھ کر اُنگلیوں میں انگلیاں ڈال لیتے۔ تعجب کے موقعوں پر ہتھیلی کو الٹ دیتے۔ کبھی سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی الٹے ہاتھ کے انگوٹھے کے اندرونی حصہ پر مارتے، کبھی سر ہلاتے اور ہونٹوں کو دانتوں سے دباتے، کبھی ہاتھ کو ران پر مارتے۔

قریش مکہ کے ایک مہذب خاندان کا یہ ممتاز فرد قبیلہ بنو سعد کی فضاؤں میں عرب کی فصیح ترین زبان سے آراستہ تو تھا ہی، وحی کی لسان مبین نے حسنِ گفتار کو اور بھی صیقل کر دیا تھا حق ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم افصح العرب تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کا جہاں ادبی معیار بہت بلند تھا وہاں اس میں عام فہم سادگی بھی تھی اور پھر کمال یہ کہ کبھی کوئی گھٹیا اور بازاری لفظ استعمال میں نہیں لیا اور نہ کبھی مصنوعی طرز کی زبان پسند فرمائی۔ کہنا چاہیئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت اور اپنے مشن کی ضروریات سے خود اپنی ایک زبان پیدا کی تھی۔ ایک اسلوب بنایا تھا۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک قول (اَلْحَرْبُ خَدْعَۃٌ) پر بحث کرتے ہوئے ثعلب کا کہنا تھا کہ "ھی لغۃ النبی" یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخصوص زبان تھی۔ بے شمار اصطلاحات بنائیں، تراکیب پیدا کیں، تشبیہیں اور تمثیلیں وضع کیں، خطابت کا نیا انداز نکالا۔ اور بہت سے مروّج الفاظ و اسالیب کو متروک کیا۔ ایک مرتبہ بنو نہد کے لوگ آئے تو گفتگو ہی جس کے دوران میں آنے والوں نے تعجب سے کہا " اے اللہ کے نبی ہم آپ ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں ایک ہی مقام میں پرورش پائی ہے پھر یہ کیا بات ہے کہ آپؐ ایسی عربی میں بات کرتے ہیں کہ جس (کی لطافتوں) کو ہم میں سے اکثر نہیں سمجھ سکتے؟ فرمایا اور خوب فرمایا ان اللہ عزو جل ادّبنی فاحسن ادبی ونشات فی بنی سعد بن بکر ——— "میری لسانی تربیت خود اللہ عزوجل نے فرمائی ہے اور میرے ذوق ادب کو خوشتر بنا دیا۔ نیز میں نے قبیلہ سعد کی فصاحت آموز فضا میں پرورش پائی ہے۔" ایک موقعے پر کسی ملاقاتی سے بات ہوئی حضرت ابوبکرؓ تعجب سے سن رہے تھے۔ پوچھا اس شخص نے آپؐ سے کیا کہا اور آپؐ نے کیا فرمایا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت کی اس پر جناب صدیق کہنے لگے "میں عرب میں گھوما پھرا ہوں اور فصحائے عرب کا کلام سنا ہے لیکن آپؐ سے بڑھ کر کلام فصیح کسی اور سے نہیں سنا" یہاں بھی وہی بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں

ادّبنی ربی ونشات فی بنی سعد ———

اسی طرح حضرت عمرؓ ایک بار کہنے لگے۔ ''اے اللہ کے رسول! کیا بات ہے کہ آپ فصاحت میں ہم سب سے بالاتر ہیں۔ حالانکہ آپ ہم سے کبھی الگ نہیں ہوئے۔'' فرمایا کانت لغۃ اسمٰعیل قد درست فجاء بہا جبرئیلؑ فحفظنیہا —— ''میری زبان اسمٰعیل علیہ السلام کی زبان ہے جسے میں نے خاص طور سے سیکھا ہے اسے جبرئیل مجھ تک لائے اور میرے ذہن نشین کر دی۔'' مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان معمولی عربی نہ تھی۔ بلکہ خاص پیغمبرانہ زبان تھی جس کا جوڑا اسمٰعیلی زبان سے ملتا تھا اور جبرئیل جس زبان میں قرآن لاتے تھے وُہ بھی وہی پیغمبرانہ زبان تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ امر سامنے رہنا چاہیئے کہ اکابر تاریخ خصوصًا انبیاء جو ایک مشن لے کر ماحول سے کشمکش کرتے ہیں اور ان میں ہر آن سچے جذبات کی موجیں اٹھتی ہیں وہ بات کرتے ہیں تو اس میں مقصد کی عظمت معنوی گہرائی پیدا کرتی ہے مخلصانہ جذبے اسے ادبی چاشنی دیتے ہیں اور کردار کی بلندی اسے پاکیزہ بناتی ہے۔

کمالِ ایمان وعبادت، عبدیت کاملہ

خدا تعالیٰ کی سب سے بڑی بڑی صفت کبریائی، عظمت اور بڑائی ہے اس اخلاقی صفت کمال کے مقابلہ میں خدا تعالیٰ بندے کے اندر عبدیت تواضع اور خاکساری کے اوصاف دیکھنا چاہتا ہے۔

انسان میں اپنے مالک و مولیٰ کے سامنے بندگی اور عاجزی کی یہی وہ خوبی ہے جس سے تمام اچھے اخلاق کی روشنی پھوٹتی ہے اور انسان کو بلند اخلاق بنا دیتی ہے۔

قرآنِ کریم نے اپنے ہادی ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جس پسندیدہ صفت کے ساتھ کثرت سے یاد کیا ہے وہ صفت "عبدیت اور بندگی" کی صفت ہے معراج کے بیان میں فرمایا سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا (سورہ اسراء) —— "پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندہ کو لے گئی راتوں رات"۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا۔ وَاَنَّہٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰہِ یَدْعُوْہُ کَادُوْا یَکُوْنُوْنَ عَلَیْہِ لِبَدًا —— "اور جب وہ اللہ کا بندہ کھڑا ہوتا ہے اور اپنے خدا کو یاد کرتا ہے تو یہ مخالفین اس پر جھپٹ پڑتے ہیں اسی طرح قرآنِ کریم نازل کرنیکا تذکرہ کرتے ہوئے کہا گیا۔ تَبَارَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ (سورہ الفرقان)

"بڑی برکت والی ذات ہے وہ جس نے نازل کیا قرآن اپنے بندہ پر"۔

چونکہ خدا تعالیٰ کو اپنے رسول کی صفت عبدیت پسند تھی اس لئے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمہ شہادت میں اپنے آپ کو "بندہ اور عبد" ہی کہلوایا ہے، ہر مسلمان کہتا ہے، اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ —— "میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُس کے بندہ اور رسول ہیں"۔

یہی مقامِ عبدیت ہے جس نے آپ کے اندر تواضع اور خاکساری کا گہرا رنگ پیدا کیا اور آپؐ کو اپنے خدا کا سب سے بڑا عبادت گذار بندہ بنا دیا۔

اوّل المسلمین:

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم فخرِ انسانیت، محبوب رب العالمین اور امام المرسلین تھے اور اس کے باوجود اولادِ آدم میں سب سے بڑے عبادت گذار تھے اور خدا پر، اپنی نبوت پر اور آخرت پر آپؐ کے ایمان اور یقین کا درجہ تمام اولادِ آدم سے بڑھا ہوا تھا، قرآن کریم نے آپؐ کو "اول المسلمین" کے خطاب سے نوازا، آپ نے اعلان کر دیا۔

وبذلك امرت وانا اول المسلمين (سورہ انعام) ـــــ "اور یہی حکم ہوا مجھ کو اور میں سب سے پہلے فرماں بردار ہوں"۔

اس خطاب کے تین مطلب بیان کئے گئے ہیں، پہلا مطلب یہ ہے کہ میں اپنی اُمّت میں اور اپنے دور میں پہلا مومن ہوں، سب سے پہلے میں اپنے خدا، اپنی نبوت و آخرت پر ایمان لایا پھر یہ پیغام دنیا والوں کے سامنے پیش کیا، عام مفسرین نے اس کے یہی معنی کئے ہیں۔

مولانا تھانویؒ نے بیان القرآن میں یہی معنی اختیار کئے ہیں، فرماتے ہیں ـــــ "میں اس دین والوں میں سب ماننے والوں سے پہلا ماننے والا ہوں" ـــــ دُوسرا مطلب یہ ہے کہ میں نوعِ انسانی میں سب سے پہلا مومن ہوں، تیسرا مطلب یہ ہے کہ میں ایمان و یقین کے سب سے اعلیٰ اور افضل مرتبہ پر قائم ہوں، حضرت شاہ عبد القادر صاحب نے اپنے ترجمہ میں یہی تیسرا مفہوم اختیار کیا ہے، مولانا شبیر احمد عثمانی رح حاشیہ پر لکھتے ہیں ـــــ شاہ صاحبؒ نے ترجمہ میں "پہلا فرماں بردار ہوں" کی جگہ "پہلے فرماں بردار ہوں" کہہ کر اسی مفہوم کی طرف اشارہ کیا ہے، یہ تقدم رتبی ہے اور محاورات کے اعتبار سے یہ تعبیر تقدم رتبی کے ادا کرنے میں زیادہ واضح ہے، یعنی پہلے دونوں مفہوم اولیتِ زمانی کی طرف اور تیسرا مفہوم اولیت رتبی کی طرف اشارہ کر رہا ہے جسے شاہ صاحبؒ نے اختیار کیا ہے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تینوں معنی کے اعتبار سے "اول المسلمین" ہیں، آپ تمام نوعِ انسانی میں بھی اول مسلم ہیں، آپ اپنے دور اور اپنی امت میں بھی اول مسلم ہیں اور آپ کے ایمان و یقین کا درجہ بھی تمام عالمِ انسانیت میں اول و اعلیٰ ہے ہمارے اکابر میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے لکھا ہے کہ حضورؐ آفتاب نبوت ہیں اور دنیا میں ہر مومن کا ایمان اسی نورِ اعظم کی شعاع ہے، جس قلبِ انسانی پر آفتابِ نبوت کی شعاع پڑ جاتی ہے، وہی قلب ایمان و یقین کی روشنی سے جگمگا اٹھتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان اور توحید کا درجہ:

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایمان و توحید کے داعیٔ اعظم تھے، پھر آپ کے اندر ذاتی طور پر ایمان و توحید کا کتنا مضبوط جذبہ ہوگا؟ ——— سیرتِ پاک کے دو واقعات اس پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہیں، حدیث میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے کہا ما شاء اللہ وما شئت ——— "جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں" ——— حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابی کو سرزنش کرتے ہوئے فرمایا ——— اَجَعَلْتَنِیْ لِلّٰہِ نِدًّا ——— "کیا تم مجھے اللہ تعالیٰ کے برابر قرار دے رہے ہو، تمھیں یوں کہنا چاہیے ——— مَا شَاءَ اللّٰہُ وَحْدَہٗ ——— "جو صرف اللہ چاہے وہ ہوگا۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا: من یطع اللہ ورسولہ فقد رشد ومَن یعصِہما فقد غوی ——— "جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ راہِ راست پر ہے اور جو ان دونوں کی نافرمانی کرتا ہے وہ گمراہ ہے"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کلام کو ناپسند کرتے ہوئے اس مقرر کے متعلق کہا: بِئْسَ خَطِیْبُ الْقَوْمِ اَنْتَ ——— "تو قوم کا برا خطیب و واعظ ہے" حدیث کے شارحین نے لکھا ہے کہ حضورؐ کے ناراض ہونے کا سبب یہ تھا کہ اس خطیب نے اللہ اور رسول کو تثنیہ کی ایک ہی ضمیر میں جمع کر دیا، جس سے سننے والوں کو یہ شبہ ہو سکتا ہے

کہ یہ کہنے والا شاید اللہ اور رسول کو برابر سمجھتا ہے (سیرت النبی ج ۴ ص ۴۵۵)

ان دونوں واقعات سے معلوم ہوا کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم توحیدِ الٰہی کا اتنا شدید اور نازک جذبہ رکھتے تھے کہ آپ شرک کا ادنیٰ اور معمولی شبہ بھی ناپسند فرماتے تھے اور ایسی کوئی بات آپ کو گوارا نہ تھی جس سے لوگوں میں شرک و غیر اللہ پرستی کا فروغ ہو۔

اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سامنے تعظیم کے طور پر کھڑے ہونے کو ناپسند فرمایا، صحابہ کرام رض نے تعظیمی سجدہ کی اجازت مانگی تو اس سے روک دیا، اپنی قبرِ مبارک کے متعلق دعا فرمائی ــــ اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِیْ وَثَنًا ــــ "خداوندا! میری قبر کو بت نہ بننے دیجیو۔ (ایضاً ص ۴۲۰)

اپنی نبوت پر ایمان و یقین:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی ذات و صفات کے ساتھ اپنی رسالت اور نبوت پر بھی پختہ یقین تھا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر دعوتِ حق کے لئے جو جوش و لگن، عزم و حوصلہ اور بے خوفی کے جذبات موجود تھے وہ اسی غیر معمولی یقین کا ثمرہ تھا کہ آپ خدا کے سچے رسول ہیں اور آپ کو ہر حال میں کامیابی حاصل ہوگی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے نبی ہونے کے بارے میں اگر ذرہ برابر شبہ ہوتا یا آپ اپنے ضمیر کے خلاف صرف لوگوں کو دھوکا دینے یا دنیوی مفاد حاصل کرنے کے لئے معاذ اللہ نبوت کا ڈھونگ رچا رہے ہوتے تو آپ کی جد و جہد میں اتنا جوش اور خلوص نہ ہوتا۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا فاضل مقالہ نگار "محمد اور اس کا مذہب" کے عنوان پر لکھتا ہے:

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو یقین اپنے قریب کے لوگوں یعنی خدیجہ رض، ابو بکر رض اور عمر رض کے دل میں پیدا کیا اور جو ہر قسم کی تکلیف اور ذلت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بارہ سال تک جھیلی اور جس جواں مردی سے اس نے ہر قسم کی دولت اور سرداری کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس کی سادہ مزاجی اور سادہ طرزِ معاشرت کو سامنے رکھ کر جو آخری دم تک قائم رہی ــــ ہم پر یڈو،

والٹیر اور مراکشی کے خیالات قبول نہیں کرسکتے، بلکہ مُہلر، کاسِن، کارلائل اور اراونگ اور دیگر محققین یورپ کے اس خیال سے اتفاق کرتے ہیں کہ عام طور پر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صداقت کو تسلیم کریں اور اس بات کو جانیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے اوپر بھروسہ تھا اور وہ اپنی رسالت کو برحق سمجھتا تھا (خطبات احمدیہ)

اسی طرح کارلائل کے تاثرات یہ ہیں۔ "بھلا یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ ایک جھوٹا آدمی جو چونہ اینٹ اور مسالہ کی خصوصیت پر یقین نہ رکھتا ہو اور ایک پختہ مکان بنالے، وہ پختہ مکان کب ہوگا، وہ تو مٹی کا ایک ڈھیر ہوگا، بارہ سو برس تک اسے قیام کیسے حاصل ہوسکتا ہے"؟ —— اور اٹھارہ کروڑ انسان اس میں کیسے رہ سکتے ہیں"؟

آخرت پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایمان ویقین:

آخرت کی زندگی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان و یقین کا یہ حال تھا کہ ہر وقت آپؐ کی آنکھوں کے سامنے آخرت کا خوفناک منظر رہتا تھا۔ امام ترمذیؒ نے حضرت ابوسعید خدریؓ سے نقل کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے" —— میں دنیوی لذتوں سے کیونکر لطف اندوز ہوں جب کہ دیکھ رہا ہوں کہ صور پھونکنے والے فرشتہ نے اپنے منہ میں صور لے رکھا ہے اور وہ تیار کھڑا ہے، اس نے اپنی پیشانی جھکا رکھی ہے اور بارگاہِ حق کی طرف کان لگا رکھے ہیں کہ کب اسے صور پھونکنے کا حکم ملتا ہے، لوگوں نے عرض کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم! اس حالت میں ہمارے لئے کیا حکم ہے؟ آپؐ نے فرمایا: حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ —— پڑھتے رہا کرو، یعنی خدا کی ذات پر بھروسہ اور اعتماد کی طاقت اپنے اندر پیدا کیا کرو،

خدا اور آخرت کے خوف سے آپؐ کی یہ حالت رہتی تھی کہ حضرت مُطرّفؓ کہتے ہیں: —— "میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور آپؐ کا یہ حال تھا —— دلجوفہ ازیز کازیز المرجل یعنی یبکی —— نماز میں آپؐ کے سینۂ مبارک سے رونے کی آواز بلند ہوتی جس طرح ہنڈیا کے پکنے کی آواز بلند ہوتی ہے، ایک روایت میں ہے کہ ——

کازیز الرحی ——— آپؐ کے سینہ سے چکی چلنے کی سی آواز نکلتی تھی (ترجمان السنۃ ج ۳ ص ۳۹)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت گذاری کا بے مثل مقام:

جس ذاتِ گرامی میں اپنے خدا پر ایمان، آخرت اور جزا و سزا پر ایمان کی پختگی کا یہ حال تھا اس میں عبادت و عبودیت کا جذبہ کتنا شدید ہو گا؟ اس پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں، حضرت عائشہ رضؓ کے بیان کے مطابق نبوت سے پہلے حضورؐ جبلِ نور پر اپنے خالق کی عبادت کرتے تھے۔ نبوت ملنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تبلیغ و دعوت اور اُمّت کی دیکھ بھال کی گوناگوں اور وسیع تر ذمہ داریاں عائد ہو گئیں اور وحی الٰہی نے آہستہ آہستہ عبادتِ الٰہی کا ایک متوازی اور معتدل نظام نافذ کر دیا۔

اس نظام عبادت میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، قربانی، اعتکاف، تلاوت اور اذکار و استغفار جیسی عبادتیں اپنی اپنی جگہ مختلف رنگ و بو رکھنے والے پھولوں کی طرح مہکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

اسلام میں عبادت کا مفہوم تنگ و محدود نہیں، اسلام میں ہر کام عبادت ہے، تجارت ہو، زراعت ہو، صنعت ہو، گھرداری ہو، حکمرانی ہو، جب کہ یہ کام احکام الٰہی کے دائرہ کے اندر رہے۔ اس لحاظ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر عبادت گذار کون ہو سکتا ہے؟ ——— کیونکہ عام اُمّت کے مقابلہ میں حضور کے لئے خدا کے احکام کی تعداد بھی زیادہ تھی، اور ان کی پابندی کا حکم بھی آپؐ کے لئے اُمت سے زیادہ سخت تھا۔

اُمت پر صرف پانچ نمازیں فرض تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تہجد کی نماز کے ساتھ چھ نمازیں فرض تھیں۔ ایک مسلمان پر ایک بیوی یا زیادہ سے زیادہ چار بیویاں رکھنے اور ان کے ساتھ انصاف کرنے کی ذمہ داری ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ۸-۹، ازواج مطہرات کے ساتھ عدل و انصاف کا بہترین نمونہ پیش کرنے کی ذمہ داری تھی، روزوں میں آپؐ صومِ وصال رکھتے تھے، لیکن اُمت کو اس سے روک دیا تھا، زکوٰۃ اور خیرات میں اُمت کے لئے

عام حالات میں ایک خاص مقدار مقرر فرمادی لیکن اپنا یہ حال رکھا کہ کبھی سائل کے جواب میں "نا" زبانِ اقدس پر جاری نہ ہوا اور وصال کے وقت گھر میں چند دینار چھوڑ کر جانا بھی گوارا نہ کیا ——— اور اس کے باوجود خدا کی اتنی زبردست عبادت سے بھی آپؐ کا شوقِ تعبّد پورا نہیں ہوتا تھا، اور آپؐ اس سے زیادہ عبادت کرنا چاہتے تھے مگر اس خیال سے آپ اپنے شوقِ عبادت کو پورا کرنے سے رُکے رہتے کہ کہیں صحابہ کرام آپؐ کی محبت اور اتباع میں زحمت اور مشقت میں نہ پڑ جائیں ——— حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کا بیان ہے ——— ان کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیدع العمل وھو یحب ان یعمل بہ خشیۃ ان یعمل بہ الناس فیفرض علیھم (بخاری باب تحریض النبی)

اسی کو حافظ ابن قیم زاد المعاد میں لکھتے ہیں ——— وقد کان یترک کثیرًا من العمل وھو یحب ان یعمل بہ خشیۃ المشقۃ علیھم (زاد المعاد ص ۱۹۳ بر ہامش زرقانی ج ۲) —

——— "یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بہت سے اعمال چھوڑ دیا کرتے تھے، حالانکہ وہ اعمال آپؐ کو بہت محبوب ہوتے تھے، صرف اُمت کے مشقت میں پڑ جانے کے خوف سے"

حاصل یہ کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے حکم پر پہلے خود چلتے تھے اور عام اُمت سے زیادہ خدا کے احکام کی تعمیل میں مشغول رہتے تھے، پھر دوسرے لوگوں کو عمل کی دعوت دیتے تھے، آپ کا حال بے عمل واعظوں کا سا نہیں تھا جو لوگوں کو تو دعوتِ عمل دیتے ہیں مگر خود پیچھے رہتے ہیں۔

زندگی کے دوسرے حصوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بندگی کا کیا حال تھا؟ ——— انفرادی عبادت کے علاوہ سماجی، معاشی، اجتماعی اور سیاسی معاملات میں آپؐ کی زندگی اور سیرت پاک احکامِ الٰہی اور قانونی حق کا کتنا مکمل اور اعلیٰ نمونہ تھی؟ ——— اس کا جواب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی میں موجود ہے۔

عبدیت اور تواضع کے مختلف رنگ

نبی کا کام خدا سے لینا اور اس کے بندوں کو دینا ہے: نبی خدا سے بھی واصل ہوتا ہے اور اس کے بندوں میں بھی شامل ہوتا ہے، اسی لئے نبی کے اندر دو قوتیں ہوتی ہیں، ایک قوتِ قدسیہ دوسری عبدیت، قوتِ قدسیہ سے نبی کے اندر عظمت اور شوکت پیدا ہوتی ہے اور عبدیت کی صفت عام بندگانِ خدا کی پیروی کے لئے نبی ورسول کے اندر اسوۂ حسنہ اور نمونۂ عمل کی تشکیل کرتی ہے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں یہ دونوں قوتیں کمال کے مرتبہ پر موجود تھیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ قدسیہ کا یہ حال تھا کہ اسی جسم وجسمانیت کے ساتھ شبِ معراج میں قابَ وقوسین کے مقام پر جلوہ افروز ہوتے تھے، عرش سے فرش تک آپؐ کی حکمرانی کا ڈنکا بجتا تھا، ایک اشارہ میں چاند کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ ایک اشارہ میں سورج کو غروب ہونے سے روک دیا۔ ایک مٹھی خاک پھینک کر لشکرِ باطل کو اندھا کر دیا، انگلیوں سے پانی کا چشمہ جاری کر کے تمام فوج کو سیراب کر دیا، سنگریزوں کو حکم دے کر ان سے اپنی نبوت کا اقرار کرایا اپنے کلام کے اثر اور اپنی نظروں کی کشش سے عرب وعجم کے ایک لاکھ چوبیس ہزار انسانوں (صحابہ کرامؓ) کو صدیق۔ فاروق، غنی اور حیدر بنا دیا جس کی مثال نبوت کی پوری تاریخ میں نظر نہیں آتی یہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ قدسیہ کا کمال تھا، اب صفتِ عبدیت کا کمال دیکھیے اس صفت نے بشریت کا جامہ اختیار کیا تاکہ نوعِ بشر اور عالمِ انسانیت کے لئے آپکی ذات ایک مکمل نمونہ بن سکے۔ آپؐ نے اعلان فرمایا —— انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الیّ —— بے شک میں تمہاری مثل ایک بشر ہوں، تمہیں جیسا ایک انسان ہوں، البتہ مجھ پر کلامِ حق اُترتا ہے —— یعنی مجھ میں ایک قوتِ قدسیہ ہے جو تم میں سے کسی کے اندر نہیں ہے، اسی سے مجھ میں اور تم میں امتیاز کامل ہوتا ہے۔

بشریت کے اس اعلان میں معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص پوشیدہ نہیں، ورنہ خدا تعالیٰ بار بار حکم دے کر آپ کی زبان سے یہ اعلان کیوں کراتا، بلکہ اس میں صفتِ عبدیت کا اظہار ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہیں جیسا ایک بشر ہوں، زندگی کے تمام نشیب و فراز سے ایک انسان کی طرح گذرتا ہوں، ایک عام انسان کی زندگی میں جو جو رنگ فطری طور پر ہوتے ہیں وہ تمام رنگ میری زندگی کے اندر بھی موجود ہیں، تاکہ ہر ہر قدم پر میری سیرت اور میرے اسوۂ حسنہ کی پیروی تمہارے لئے واجب ہو جائے اور میری سنت اور سیرت کے سوا کسی دوسری طرف دیکھنے کی تمہیں ضرورت پیش نہ آئے اور نہ کسی دوسری طرف دیکھنا جائز ہے۔

میری زندگی ایک عام بشر کی طرح اگر ہر آرام و راحت، ہر دُکھ اور سُکھ اور ہر امتحان سے نہ گذرتی تو تم کہہ سکتے تھے کہ محمد بن عبد اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہم اپنا پیشوا کیسے بنائیں اور ان کے نمونہ کو ہر ہر قدم پر اپنے سامنے کیسے رکھیں یہ تو زندگی کے ہر سرد و گرم اور ہر تلخی و ترشی سے باخبر نہیں ہیں ـــــــ لیکن اب تم یہ بات نہیں کہہ سکتے۔

پس حاصل یہ نکلا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں "عبدیت کی صفت پیغمبرانہ قیادت کے اعلیٰ کمال اور عالم گیر رسول کی وہ خصوصیت ہے جو کسی سابق رسول میں موجود نہیں۔

اسی لئے قرآنِ کریم میں خدا تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کے اہم مقامات پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی صفت "عبد" کے ساتھ یاد فرمایا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے لئے اسی صفت کو بطور لقب اختیار فرمایا ہے۔

قرآن کریم نے کہا ـــــــ سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ـــــــ تَبَارَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ ـــــــ وَاَنَّہٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰہِ یَدْعُوْہُ کَادُوْا الخ ـــــــ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمۂ شہادت میں اپنے متعلق اعلان کرایا اشھد ان محمدا عبدہ و رسولہ۔

عبدیت انسانی کمزوریوں کے رنگ میں :

مظلوم و پریشان ہونا، دُکھ اور تکلیف میں ہونا، بھول اور چوک اور بیماری و موت کے حالات سے گزرنا انسانی زندگی کی کمزوریاں شمار ہوتی ہیں، اور ایک عظیم قوتِ قدسیہ رکھنے والے پیغمبر کی زندگی میں جب یہ باتیں نظر آتی ہیں تو ایک عام عقل رکھنے والا انسان تعجب میں پڑ جاتا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بشری تقاضوں، بشری کمزوریوں اور آپ میں ایک عام زندگی کی جھلکیاں دیکھ کر طرح طرح کی بے ضرورت تاویلیں کرنے لگتا ہے، حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو زندگی کی ہر منزل سے اس لئے گزارتا ہے تاکہ ہر منزل پر اس کے نشانِ قدم پڑ جائیں اور کسی مقام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے والا اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کے نشانات سے محروم نہ رہے۔

راہِ حق میں مظلومیت :

غور کرو، راہِ حق میں ذلیل دشمنوں کے ہاتھ سے زخمی ہونا، پتھر کھانا، قیدی بن کر بھوک پیاس کی تکلیفیں اٹھانا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا کس قدر قابلِ رحم پہلو ہے اور ایک دو دن نہیں، سال دو سال نہیں، تیرہ سال مکہ میں اور پھر مدینہ میں —— زندگی کے آخری لمحہ تک نت نئے انداز کی تکلیفیں اٹھائی گئیں۔

کیا خدا تعالیٰ اپنے محبوب کو زحمت میں ڈالے بغیر اسلام کا پیغام عام نہیں کر سکتا تھا؟

—— ضرور کر سکتا تھا اور جس طرح حضرت عمر ابن خطاب رضؓ کے حق میں اپنے محبوب کی دُعا کو قبول کر کے چند گھنٹوں میں عمر رضؓ کو آپؐ کے قدموں میں لا کر ڈال دیا تھا اسی طرح تمام قریش کے حق میں بھی آپؐ کی دعا قبول کی جا سکتی تھی اور ۲۳ سال کا کام صرف ۲۳ گھنٹے میں انجام پا سکتا تھا، لیکن اگر ایسا ہو جاتا تو پھر راہِ حق میں آپؐ کی امت کس کے نقشِ قدم دیکھ کر صبر و استقامت کا اُسوہ اختیار کرتی اور کس کی مظلومیت مظلوموں کو ڈھارس بندھاتی —— ؟

بھول چوک اور نبی معصوم :

وحی الٰہی ان کی نگرانی کرتی ہے، خاندان انکے معصوم ہونے کا اعلان کرتا ہے اور پھر بھی نماز جیسی عبادت کے اندر ــــ جو ان کی محبوب ترین عبادت ہے ــــ ان سے بھول ہو جاتی ہے، حضرت عبد اللہؓ کہتے ہیں ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی پانچ رکعتیں پڑھا دیں، نماز کے بعد آپؐ سے کہا گیا، حضورا صلی اللہ علیہ وسلم کیا ظہر کی رکعتیں چار سے زیادہ کردی گئی ہیں؟ آپؐ نے فرمایا، کیوں، کیا ہوا؟ صحابہؓ نے کہا، آپؐ نے پانچ رکعتیں پڑھا دیں، یہ سن کر آپؐ نے سلام کے بعد دُو سجدے سہو کے ادا کئے اور فرمایا ــــ انما انا بشر مثلکم انسیٰ کما تنسون فاذا نسیت فذکّرونی ــــ "لوگو! میں تم جیسا ہی ایک بشر ہوں، جس طرح تم بھول جاتے ہو، اسی طرح میں بھی بھول جاتا ہوں، پس جب میں بھول جاؤں تو تم مجھے یاد دلادیا کرو"

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلّم ایک دن جنابت کا غسل کرنا بھول گئے، حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ ایک دن صبح کی نماز کے لئے صفیں سیدھی ہوگئیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم حجرہ سے نکل کر مصلّے پر تشریف لے آئے، کھڑے ہوتے ہی آپؐ کو غسل کرنے کا خیال آیا، آپؐ نے فرمایا، ٹھہرے رہو، پھر آپؐ دولت خانہ میں تشریف لے گئے اور جب واپس آئے تو آپؐ کے سر مبارک سے پانی ٹپک رہا تھا ــــ اور پھر آپؐ نے نماز پڑھائی۔

پہلا واقعہ ترجمان السنہ جلد ۳ میں بخاری اور مسلم کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے اور دوسرا واقعہ امام ابوداؤد نے کتاب الطہارت میں نقل کیا ہے۔

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا دل اور دماغ ہر قسم کی غلطی، خطاء اور نسیان سے محفوظ رکھا جاتا تھا، تاکہ خدا کا پیغام پہنچانے اور پھر خدا کی ہدایت کے مطابق اس کی تشریح کرنے میں آپؐ کسی قسم کی خطاء نہ کریں، لیکن کسی کسی موقعہ پر آپؐ سے بھول کرائی گئی تاکہ اُمت کو یہ بتایا جائے کہ نماز کے اندر بھول چوک بڑے بڑے لوگوں سے بھی ہوسکتی ہے، اور بھول چوک کی صورت میں شریعت

کا مسئلہ یہ ہے۔ اس طرح اس کی تلافی کی جاسکتی ہے۔

بیماری اور جادو کا اثر!

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک طرف حیوانات سجدہ کرتے تھے اور پتھر سلام کرتے تھے اور یہ آپؐ کی قوتِ قدسیہ کا اثر تھا۔ دوسری طرف بچھو آپؐ کے ڈنک مار دیتا تھا اور جادوگر جادو کر دیتا تھا، بخار کی تیزی پریشان کر دیتی تھی اور یہ آپؐ کی عبدیت اور بندگی کا اظہار تھا، حضرت علی رضؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم رات کو نماز پڑھ رہے تھے، جب آپؐ نے زمین پر ہاتھ رکھا تو ایک بچھو نے آپؐ کے ڈنک مار دیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بچھو کو چپل سے مار ڈالا، نماز سے فارغ ہو کر آپؐ نے فرمایا، بچھو پر خدا کی پھٹکار ہو، نہ نمازی کو معاف کرتا ہے اور نہ بے نمازی کو، نہ نبی کو چھوڑتا ہے اور نہ ہی غیر نبی کو، پھر آپؐ نے پانی میں نمک ملایا اور وہ پانی اس زخم پر ڈالنا شروع کیا اور ساتھ ساتھ سورۂ معوذتین پڑھتے رہے۔

خیبر کی ایک یہودی عورت نے آپؐ کو گوشت میں ملا کر زہر دے دیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں سے کچھ ہی تناول فرمایا تھا کہ ہاتھ کھینچ لیا، پھر اس عورت کو بلا کر پوچھا کہ کیا تُو نے مجھے زہر دیا ہے۔ اس نے کہا، آپؐ کو کس نے بتایا ہے؟ آپؐ نے گوشت کی طرف اشارہ کر کے فرمایا، مجھے اس نے بتایا ہے، وہ عورت بولی حضور صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے آپؐ کی رسالت کا امتحان لیا تھا کہ اگر آپ سچے نبی ہوں گے تو آپؐ پر زہر کا اثر نہیں ہوگا اور جھوٹے نبی ہوں گے تو ہلاک ہو جائیں گے، آپؐ نے اس عورت کو معاف کر دیا

اسی زہر کا اثر دور کرنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دونوں مونڈھوں کے درمیان کمر پر ابوہند انصاری سے سینگی لگوایا کرتے تھے، لیکن یہ زہر اتنا اثر کر چکا تھا کہ مرضِ وفات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف دیئے بغیر نہ رہا، وفات کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔

عائشہ رضؓ! خیبر میں جو چند زہر آلود لقمے میں نے کھائے تھے اس کی تکلیف مجھے ہمیشہ محسوس ہوتی رہی، لیکن اب تو اس کے اثر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری شہ رگ کٹ جائے گی۔

محدثین نے لکھا ہے کہ خیبر کے زہر کا اثر آخر وقت میں اس لئے لوٹ آیا کہ خدا تعالیٰ آپ کو شہادتِ خفی کا درجہ عطا کرنا چاہتا تھا، کیونکہ شہادتِ جلی ختم نبوت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی تھی۔

حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا گیا، جس کے اثر سے آپ کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ آپؐ اپنی بیویوں کے پاس گئے ہیں، حالانکہ آپؐ ان کے پاس نہیں ہوتے تھے۔

سفیان ثوریؒ کہتے ہیں کہ عرب میں یہ جادو کی سب سے بدترین قسم تھی، ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نیند سے بیدار ہوئے تو مجھ سے فرمایا، عائشہ رضؓ! خدا تعالیٰ نے مجھے بتا دیا ہے کہ مجھ پر جادو کس نے کیا ہے، وہ بدبخت انسان لبید بن اعصم ہے، یہ منافق شخص تھا، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، فرشتوں نے مجھے بتایا ہے کہ کنگھی اور بالوں کے ذریعہ جادو کیا گیا ہے اور ایک نر کھجور کے خوشہ کے غلاف میں اسے رکھ کر ذروان نامی کنویں کے اندر پتھر کے نیچے دبا دیا گیا ہے۔

اس اطلاع کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کنویں پر گئے اور وہ تمام سامان جس کے ذریعہ جادو کیا گیا تھا کنویں کے اندر سے نکال کر پھینک دیا گیا (ابن کثیر ج ۴ مصری ص ۵۷۳ بحوالہ بخاری)

اہل و عیال کا فکر:

اہل و عیال اور بال بچوں کے مستقبل کا فکر انسان کی بہت بڑی کمزوری ہے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ خدا کی ذات پر کون بھروسہ کر سکتا تھا، مگر آپؐ اس فکر سے خالی نہ تھے، یہ فکر انسان کے طبعی تقاضوں میں شامل ہے۔ حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج مطہرات سے فرمایا کرتے تھے "—— مجھے تمہارا فکر رہتا ہے کہ میرے بعد تمہارا کیا ہوگا؟ میرے بعد تمہاری سرپرستی وہی لوگ کریں گے جو صابر اور صدیق ہوں گے۔" (ترمذی)

اسی طرح اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی وفات پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آنسو نکل آئے اور فرمایا: واللہ یا ابراھیم! انا بفراقک لمحزون ــــــ "خدا کی قسم! اے ابراہیم! میں تیری جدائی میں سخت غمگین ہوں۔

دنیا میں کون ایسا ہے جو نرینہ اولاد کی آرزو نہ رکھتا ہو؟ ــــــ اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو دشمنانِ اسلام نرینہ اولاد نہ ہونے پر طعنے دیا کرتے تھے اور انہی دل خراش طعنوں پر قرآنِ کریم نے آپؐ کو تسلی دی تھی ــــــ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ــــــ "اے نبی! تمھارے دشمن بے نشان رہیں گے"، تمھارا نام تو بغیر بیٹوں کے بھی قیامت تک بلند و بالا رہیگا وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ــــــ قرآن نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ضرور دی مگر بیٹیوں کے سوا آپؐ کا کوئی بیٹا زندہ نہ رکھا گیا، اور اس کے بغیر ہی آپؐ کی نسلِ پاک کو دُنیا کے کونہ کونہ میں پھیلا دیا گیا ــــــ بال بچوں کی طرف سے یہ فکر و پریشانی صرف امت کے غم کو ہلکا کرنے کے لئے ہے، تاکہ آپؐ کی پیروی کرنے والے اپنے اس فکر و غم میں اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونۂ عمل کو سامنے رکھ کر صبر و شکر کی زندگی گذاریں۔

عبدیت کا آخری منظر، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سفرِ آخرت:

دینِ حق کو بلند کرنے اور اسلام کو پھیلانے کی جد و جہد کو کامیابی کے دور سے گذار کر اب خدا کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے مولا سے ملنے کا اشتیاق ہے، جو کام سابق رسولوں سے مکمل طور پر انجام نہیں پا سکا وہ آپؐ کے ہاتھوں صرف ۲۳ سال میں درجۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے اور قرآنِ کریم اعلان کر رہا ہے۔

اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا (سورۂ نصر) ــــــ "جب آ گئی خدا کی مدد اور فتح مندی اور دیکھ لیا تم نے کہ لوگ گروہ در گروہ خدا کے دین میں داخل ہو گئے تو پھر آپؐ اپنے پروردگار کی پاکی اور حمد بیان کیجئے اور یکسو ہو کر اس کی جناب میں استغفار کیجئے، بے شک وہ توبہ قبول

کرنے والا ہے"

ابو بکر صدیق رضؓ مشیتِ الٰہی کے اشاروں کو سمجھ رہے ہیں اور اس سورۃ کے نازل ہونے پر آبدیدہ ہو رہے ہیں کہ اس اعلان میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا اشارہ پوشیدہ ہے بات ٹھیک تھی، حجۃ الوداع سے واپس آتے ہوئے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم بیمار پڑ گئے صفر کے مہینہ میں درد سر سے اس مرض کا سلسلہ شروع ہوا اور ربیع الاول کی ۱۲ تاریخ کو انتہا کو پہنچ گیا اور محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مولا سے جا ملے، سفرِ آخرت کی یہ منزل حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح گذاری! ـــــ مرضِ وفات بڑھتے بڑھتے اس درجہ پر پہنچ گیا کہ بخار کی شدت آخری ڈگری پر ہے، غشی پر غشی طاری ہو رہی ہے، ابنِ مسعود رضؓ اس حالت میں اپنے آقا کی مزاج پرسی کرتے ہیں تو کمبل کے اوپر سے بخار کی حدت محسوس کرتے ہیں، بے چین ہو کر عرض کرتے ہیں کہ ـــ تُوْعَكُ وَعكًا شديدًا ـــ بڑا سخت بخار ہے حضور! صلی اللہ علیہ وسلم، آپ جواب دیتے ہیں ـــ اجل انی اُوعَكُ كما يوعك رجلان منكم قال فقلت، ذٰلكَ انّ لك اجرين ؟ ـــ قال عم اجل ـــ "ہاں مجھے تمہارے دو آدمیوں کے برابر بخار چڑھتا ہے، میں نے کہا، اس لئے آپؐ کے واسطے دو اجر ہیں اور دُہرا ثواب ہے، آپؐ نے فرمایا، ہاں اسی لئے۔

رفیقۂ حیات حضرت عائشہ رضؓ کہتی ہیں ـــ ما رايت احدًا الوَجعُ عليه اشد من رسول الله صلى الله عليه وسلم ـــــ "میں نے بیماری کی سختی جیسی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر دیکھی ویسی کسی دوسرے پر نہیں دیکھی"

ایک موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاصانِ خدا کی مصیبت کے زیادہ سخت ہونے کا سبب بیان کرتے ہوئے فرمایا ـــــ يُبْتَلَى الرَّجُلُ حَسَبَ دينه فان كان فى دينه صلبًا اشتد بلاءُه وان كان فى دينه رقة هُوّن عليه ـــــ یعنی ہر انسان دینداری کی حالت کے مطابق آزمائش میں ڈالا جاتا ہے، اگر وہ دینی حالت میں مضبوط ہوتا

ہے تو اس کی آزمائش بھی سخت ہوتی ہے اور اگر دینداری کے ساتھ اس کا تعلق کمزور ہوتا، تو اس کا امتحان بھی ہلکا لیا جاتا ہے۔

حضرت عائشہ رضؓ کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مرض کی شدت پندرہ روز تک رہی، اس دوران میں آپؐ اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ جب ایک دن آپؐ اپنی مسجد میں نماز پڑھانے کے ارادہ سے نکلے تو علی رضؓ اور فضل بن عباسؓ کے کندھوں پر ہاتھ رکھا، آپؐ کے پیر کمزوری کی وجہ سے زمین سے ٹکرا رہے تھے اور آپؐ کا سر اقدس کپڑے سے بندھا ہوا تھا۔ آپؓ کہتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مرض میں اپنی وفات کا یقین تھا، اس لئے آپؐ نے اس مرض میں علاج نہیں فرمایا، ایک دفعہ بیویوں نے اصرار کر کے کوئی دوا دے دی تو ہوش میں آنے کے بعد ان سب پر سخت ناراض ہوئے۔

وصال کا وقت جب بالکل قریب آیا تو تکلیف کی شدت سے آپؐ نے اپنے دونوں مبارک ہاتھ پانی کے پیالے میں ڈالے اور پھر اپنے چہرۂ اقدس پر ملے، یہ عمل بار بار کرتے رہے اور فرماتے رہے ـــــ لا الٰہ الا اللہ ان للموت سکرات ـــــ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، بے شک موت کی تکلیف برحق ہے، پھر آپؐ نے دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھائے اور یہ کہنا شروع کیا:

ـــــ الرفیق الاعلیٰ ـــــ الرفیق الاعلیٰ ـــــ

میرا سب سے اچھا رفیق، میرا سب سے اچھا اور برتر و بالا ساتھی ـــــ بس یہ آخری جملے تھے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ اقدس سے نکلے اور آپؐ کے دونوں ہاتھ جُھک گئے اور آپؐ نے اپنی جان "جاں آفریں" کے سپرد کر دی (ما ثبت بالسنۃ ص ۱۰۹ تا ۱۱۱)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ قدسی پر اپنے محبوبِ حق سے ملاقات کے وقت بے چینی اور تکلیف کی یہ کیفیت کیسی ـــــ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہادئ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی زندگی کے آخری لمحات بھی اُمت کے لئے نمونہ کے طور پر چھوڑنے تھے، تاکہ اس منزل سے

گذرنے والا کوئی انسان اس نازک منزل میں اپنے آپ کو تنِ تنہا محسوس نہ کرے بلکہ رسولِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھ کر آسانی کے ساتھ اس منزل سے گذر جائے دیکھو، جو کلمۂ وحدت صفا کی پہاڑی پر آپؐ کی زبان سے سُنا گیا اور پھر مکہ اور طائف کے بازاروں میں جس کلمہ کے جُرم میں پتھر کھائے، وہی کلمہ آخری وقت میں زبان پر جاری ہے اور دنیا کو استقامت اور کامیابی کا سبق دے رہا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

حصّہ دوم:- سیاسی زندگی

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ

اور ہم نے اے رسول! (صلی اللہ علیہ وسلم) تمھیں جہاں والوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے

قرآن کریم کی یہ آیت پاک رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمانہ کا جلی عنوان ہے۔

یہ آیتِ پاک قرآنِ کریم کی ایک چھوٹی سی آیت ہے مگر معنوی گہرائی کے لحاظ سے قرآنِ کریم کی جامعیت اور بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

یہ آیتِ پاک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے دُو رخ پیش کر رہی ہے۔

ایک یہ کہ حضور کی نبوت خدا تعالیٰ کا اپنی مخلوق پر بڑا فضل وکرم ہے، خدا تعالیٰ نے اپنے فضل واحسان کے طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کو نبی بنا کر بھیجا ہے۔

دُوسرا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی جہاں والوں کے حق میں رحمت اور خدا کا فضل واحسان ہے۔

پہلے مفہوم کے لحاظ سے خدا تعالیٰ کی رحمت اور اس کا فضل وکرم نمایاں ہوتا ہے، اور دوسرے مفہوم کے لحاظ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت کا پہلو روشن ہوتا ہے۔

اور آیتِ پاک میں یہ دونوں مفہوم صرف رَحۡمَةً کی نحوی ترکیب کے فرق سے پیدا ہوتے ہیں۔

مترجمین میں سے سعدی شیرازی (یا شریف جرجانی) نے اپنے فارسی ترجمہ میں اور حضرت مولانا شاہ رفیع الدین دہلویؒ نے اپنے اردو ترجمہ میں یہی مفہوم اختیار کیا ہے

دوسری ترکیب یہ ہے کہ رحمۃً کو اَرۡسَلۡنَا کا مفعول لہٗ اور رَحۡمَةً کا فاعل خدا تعالیٰ کو بنایا جائے، اس صورت میں آیت کا ترجمہ یہ ہوگا

"نہ فرستادیم ترا مگر از روئے مہربانی بر عالمہا (شاہ ولی اللہ)

شاہ عبدالقادرؒ اردو میں فرماتے ہیں۔ "اور تجھ کو جو ہم نے بھیجا سو مہربانی کر جہاں کے لوگوں پر":

متاخرین علماء میں سے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے بھی یہی معنی اختیار کئے ہیں

خدا تعالیٰ کے کلام کی بلاغت کا کمال یہ ہے کہ ایک ہی لفظ دو مفہوم ادا کر رہا ہے اور دونوں معانی مل کر خدا تعالیٰ کے پورے مقصد کو واضح کر رہے ہیں۔

مقصد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے تمام عالم والوں پر رحم فرما کر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے

اور آپؐ کی ذاتِ گرامی کو خدا تعالیٰ نے رسول بنا کر کائناتِ انسانی پر بڑا رحم فرمایا ہے کیونکہ آپؐ کی ذات عالم والوں کے حق میں بہت بڑی رحمت ہے۔

قرآنِ کریم نے یہ دونوں معانی الگ الگ آیتوں کے اندر بھی بیان کئے ہیں۔

حسبِ ذیل آیات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے سلسلہ میں اپنی رحمت اور اپنے انعام و اکرام کو نمایاں کیا ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (سورہ آل عمران آیت ۱۶۴)

"بے شک اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں پر احسان فرمایا، جب بھیجا ایک رسول انہی میں سے"۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (سورہ آل عمران آیت ۱۵۹) — "خدا کے فضل و کرم سے تم اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)! نرم دل واقع ہوئے ہو اور اگر سخت دل واقع ہوتے اور سخت مزاج تو یہ لوگ آپؐ کے ارد گرد سے بھاگ جاتے"۔

ان آیات میں خدا تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو اہل ایمان پر اپنا فضل و کرم قرار دیا اور یہ اشارہ فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت خدا تعالیٰ کی رحمت و ربوبیت کا عکس کامل اور مظہر اکمل ہے، حقیقی رحمت، خدا تعالیٰ کی ہے۔

جن حضرات نے آیت کے دوسرے معنی کو اختیار کیا ہے ان کے سامنے قرآنِ کریم کی یہ آیت

پاک ہے: ـــــ عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (سورہ توبہ آیت ۱۲۸) ـــــ "تم پر جو سختی آتی ہے وہ اس رسول پر گراں گذرتی ہے وہ تمھاری بھلائی پر حریص ہے اور اہلِ ایمان کے حق میں بے حد مہربان اور مشفق ہے۔"

اس آیت میں خدا تعالیٰ نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کو رحمت اور رافت کی صفتوں سے براہِ راست متصف فرمایا ہے ؎

یا رب تو کریمے و رسولِ تو کریم
صد شکر کہ ہستیم میانِ دو کریم

یَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰی حَبِیْبِکَ دَائِمًا اَبَدًا اَبَدًا

رحمۃ للعالمین ہونے کے مختلف پہلو

"رحمۃ و رافت"، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام اخلاقی صفات کا عنوان ہے خدا تعالیٰ نے آپؐ کو اسی اخلاقی صفت سے متعارف کرایا ہے اور آپؐ کو تمام جہان والوں کے لئے رحمۃ اور رؤف الرحیم فرمایا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ کی اخلاقی خوبیاں نہ صرف اپنی ذات کے حسن و کمال کے لئے تھیں اور نہ صرف اپنی امت کو اخلاقی روشنی اور دینی و دنیاوی فائدہ پہنچانے کے لئے بلکہ اپنی ذات اور اپنی امت کے علاوہ تمام جہان والوں کو روحانی اور مادی فلاح و سعادت کی منزل پر پہنچانا آپؐ کے خلقِ عظیم اور آپؐ کے رحمۃ للعالمین ہوتے کا اصلی مشن تھا۔

اخلاقی صفات میں دو قسم کی صفتیں ہیں، ایک متعدی صفات، جیسے رحم[۱] و کرم، جود[۲] و سخا، عدل[۳] و انصاف، صبر[۴] و تحمل اور عفو و درگذر یہ صفات براہ راست خدا کی مخلوق کو فائدہ پہنچاتی ہیں۔ دوسری قسم لازمی حسنات کی ہے، جیسے عفت، صدق، تواضع اور زہد ـــــ ان

صفتوں کا براہِ راست تعلق موصوف کے اندر ملکوتی حسن و جمال پیدا کرنے سے ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ بالواسطہ ان صفتوں سے مخلوقِ خدا کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔

ذیل میں ان صفات کی تشریح کی جاتی ہے۔

عفّت:

عفّت کے معنی علمائے اخلاق کے نزدیک یہ ہیں کہ انسان کھانے پینے اور جنسی خواہش میں اعتدال رکھے عفّت پیدا کرنے کے لئے ناجائز چیزوں سے پرہیز رکھنا تو بہرحال ضروری ہوتا ہی ہے لیکن کبھی کبھی حلال چیزوں سے اپنے آپ کو روکنا پڑتا ہے۔

قرآنِ کریم نے عفّت کے لفظ کو تین موقعوں پر استعمال کیا ہے۔

(۱) شرمگاہ کی حفاظت میں ــــــ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتَّىٰ يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ (سورہ نور: ۳۳) ــــــ "اور اپنے آپ کو تھامتے رہتے ہیں جن کو نہیں ملتا سامان نکاح کا، جب تک کہ مقدور دے ان کو اللہ اپنے فضل سے۔" (شاہ عبدالقادرؒ)

تھامنا، قابو میں رکھنا، ضبط کرنا ــــــ یہی مفہوم ہے عفّت کا، عورت کے حق میں ــــــ عفّت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔

عورت کے لئے عفّت یہ ہے کہ اپنے ناموس کی حفاظت اور ناموس کو خطرہ میں ڈالنے والے بناؤ سنگار اور جسمانی نمائش سے پرہیز، یعنی موتی کی حفاظت اور موتی کے آب کی حفاظت۔ موتی رہے اور اس پر "آب" نہ ہو تو "بے آب موتی" کی قیمت گر جاتی ہے۔

سورہ نور میں آگے چل کر کہا گیا ہے:

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاءِ اللَّاتِي لَا يَرْجُونَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ أَن يَضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجَاتٍ بِزِينَةٍ وَأَن يَسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (سورہ نور: ۶۰)

ــــــ "اور جو بیٹھ رہی ہیں گھروں میں تمہاری عورتوں میں سے، جن کو توقع نہیں رہی نکاح کی ان پر گناہ نہیں کہ اُتار رکھیں اپنے کپڑے، یہ نہیں کہ دکھاتی پھریں اپنا سنگار اور اس سے بھی بچیں تو بہتر

ہے ان کے لئے اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔"

شاہ صاحب حاشیہ پر لکھتے ہیں ——— "یعنی بوڑھی عورتیں گھر میں تھوڑے کپڑوں میں رہیں تو درست ہے اور پورا پردہ رکھیں تو اور بہتر ہے۔

مولانا عثمانی لکھتے ہیں ——— اور گھر سے باہر نکلتے وقت بھی زائد کپڑے مثلاً برقع وغیرہ اتار دیں تو کچھ مضائقہ نہیں بشرطیکہ زینت کا اظہار نہ ہو (حمائل ص ۴۶۴)

(۲) دوسرے معنی امانت کا خیال رکھنا ——— یتیموں کے مال کے متعلق فرمایا ——— وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ——— یتیموں کے کفیل اور سرپرست اگر غنی ہوں تو یتیم کے مال سے بچنا ہی بہتر ہے البتہ اگر غریب ہوں تو ——— وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ (سورہ نساء: ۶) تب بقدر ضرورت استعمال کر سکتے ہیں اور اپنے کام میں لا سکتے ہیں۔

(۳) تیسرے معنی ضرورت اور احتیاج کے باوجود کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا خوددار غریبوں کے متعلق فرمایا يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ (بقرہ رکوع ۳۷) ——— "انجان آدمی انھیں مالدار سمجھتا ہے، ان کے سوال نہ کرنے سے" یہ شیخ الہندؒ کا ترجمہ ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ "تعفف" کا ترجمہ کر رہے ہیں "طمع نہ کردن" طمع اور لالچ نہ کرنے کی وجہ سے وہ لوگ غنی اور مالدار نظر آتے ہیں ——— تَعْرِفُهُم بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا ——— تم ایسے لوگوں کو علامت و آثار سے پہچانتے ہو، وہ لوگ گڑگڑا کر سوال نہیں کرتے۔

بہرحال قرآنِ کریم میں عفت کا لفظ چار جگہ آیا ہے دو جگہ سورہ نور میں ایک جگہ سورہ بقرہ میں اور ایک جگہ سورۂ نساء میں اور ان تمام موقعوں کو سامنے رکھ کر عفت کے معنی وہی نکلتے ہیں جو اوپر مذکور ہوئے

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس میں عفت کی مکمل شان جلوہ گر تھی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بیان ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں کنواری لڑکیوں سے بھی زیادہ شرم وحیا کی صفت موجود تھی:

كَانَ أَشَدُّ حَيَاءً مِنَ الْعَذْرَاءِ فِي خِدْرِهَا (احیاء العلوم ج ۲ ص ۳۱۶ صحیح مسلم ج ۲ ص)

"یعنی آپ پردہ نشین کنواری لڑکیوں سے زیادہ حیادار تھے۔"

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عفت کا کمال و جمال دیکھنا ہو تو نبوت سے پہلے گانے بجانے اور بتوں کا چڑھاوا کھانے سے پرہیز، دشمنوں کی بُرائی سننے سے پرہیز، بُرا کہنے سے پرہیز، زبان پر بد دعا کے الفاظ لانے سے پرہیز اور ازواجِ مطہرات کے ساتھ پاکیزہ معاشرت اور ایک بیوہ کے ساتھ جوانی کا بہترین حصہ ہنسی خوشی گذارنے کے واقعات پر ایک نظر ڈالی جائے۔

یہ واقعات جلد اول اور پیشِ نظر جلد ثانی دونوں میں مختلف عنوانات کے تحت پیش کئے گئے ہیں

حضرت شاہ ولی اللہ رح نے تعفّف کا ترجمہ "بسبب طمع نہ کردن" کر کے یہ بتایا ہے کہ عفت سے خودداری، بے نیازی اور قناعت کی صفات پیدا ہوتی ہیں اور علماءِ اخلاق نے لکھا ہے کہ عفت کی صفت سے امانت، عدل، قناعت، ایثار اور زہد کی صفات پیدا ہوتی ہیں۔[1]

معلوم ہوا کہ جو انسان عفت کی دولت سے مالا مال ہوگا وہ اپنے عدل سے، اپنی امانت سے اور اپنے ایثار سے مخلوقِ خدا کو فائدہ پہنچائے گا۔

یہی حال دوسری لازمی صفات، صدق، اور تواضع کا ہے، انسان سچ بولے گا، اسی سے اس کی ذات قابلِ اعتماد بنے گی، وہ تواضع اختیار کرے گا، اس سے اس کی ذات دوسروں کی نظروں میں محبوب ہو جائے گی۔

اور ایک قابلِ اعتماد اور پسندیدہ شخصیت عوام کو صحیح راہ بتانے اور ان کے بُرے بھلے کی نشاندہی کر کے انھیں غلط راستے سے بچانے میں کامیاب ثابت ہوگی۔

یہی ان لازمی صفات کا متعدی اثر اور ثمرہ ہے۔

اب متعدی صفات کی تشریح ملاحظہ ہو۔

رحم و کرم:

یہ صفت بھی جمالی اخلاق کا سرچشمہ ہے، جب مخلوقِ خدا کسی قسم کی پریشانی، کسی قسم کی بےچینی اور کسی قسم کی مظلومیت کا شکار ہوتی ہے تو خدا تعالیٰ کی یہ صفتِ رحمت اس کے خاص بندوں میں

جلوہ گر ہوتی ہے اور وہ اس کے بندوں کو ظلم وستم اور اضطراب و بے چینی سے نجات دلاتے ہیں۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی خدا کی رحمت اور اُس کے فضل وکرم کا آخری اور مکمل ظہور رہے، اور آپؐ نے مخلوقِ خدا کو ہر قسم کی تکلیف سے بچانے کی کوشش کی ہے جس نے آپؐ کی رحمت کا دامن تھاما ہے اور آپؐ کی رحمت سے فائدہ اٹھایا ہے، آپؐ کے پیغام کو قبول کیا ہے، آپؐ کے نظامِ زندگی کے جتنے حصّہ کو اپنایا ہے۔ اس نے اپنی محبت اور اطاعت واتباع کے مطابق اس سے فائدہ اٹھایا ہے، البتہ جس بدنصیب نے آفتابِ رحمت سے آنکھیں بند کر لی ہیں اس کی نورانی شعاعوں سے بھاگ کر اپنے آپ کو تاریکی کے تہ خانہ میں بند کر لیا ہے وہ محروم رہا ہے اور اس میں قصور بھاگنے والے کا ہے، آفتابِ رسالت کی تابانی تو سب کے لئے عام ہے۔

جود وسخا:

خدا کی مخلوق اور اس کے بندوں کو جب بھوک پیاس کی ضرورت پیش آتی تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت نے ——— جود وکرم اور سخاوت کی شکل اختیار کر لی اور آپؐ کا ابرِ کرم اس طرح برسا کہ بڑے بڑے سخی اور فیاض ششدر رہ گئے۔

امانت ودیانت:

بندگانِ خدا کے حقوق ادا کرنے کا وقت آیا، تو آپؐ کی رحمت نے "امانت" کی صورت میں ظہور کیا اور ہر حق دار کو اس کا واجب حق عطا کر دیا۔

صبر وتحمل:

ظالموں اور نادانوں کے ظلم وستم کے وقت سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت صبر وتحمل کی صورت میں سامنے آئی۔

عفو ودرگذر:

صبر وبرداشت سے آگے بڑھ کر ان کی ایذا رسانیوں کو معاف کرنے کا وقت آیا تو آپؐ کی رحمت نے عفو ودرگذر بن کر دشمنوں کو اپنے سینے سے لگالیا۔

لہ من اخلاق النبیؐ ص ۱۰۸۔ تالیف ڈاکٹر احمد محمد الموتی مصری

عدل وانصاف:

خدا کے مظلوم اور ستم رسیدہ بندوں کو ظالم طاقت وروں کے ظلم سے بچانے اور جبر واکراہ کی حالت ختم کرنے، آزادی کی فضا پیدا کرنے کی ضرورت پیش آئی تو رحمتِ محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ـــــ عدل ـــــ کی صورت اختیار کرلی اور آپؐ ایک عادل حکمراں اور عادل جج بن کر مظلوموں کی دستگیری فرمانے لگے۔

علماء اخلاق نے لکھا ہے کہ عدل تین صفتوں سے مل کر بنتا ہے، حکمت، عفت اور شجاعت۔

خدا تعالیٰ نے قیامِ عدل کو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص مشن قرار دیا تھا اس لئے آپؐ کے اندر حکمت وتدبیر، پاک دامنی اور نیک کرداری اور شجاعت وجرأت کی تمام صفات ودیعت فرمائی تھیں۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ اخلاقی صفتیں سماجی اور معاشرتی زندگی میں بھی مکمل طور پر نمایاں ہوئیں اور سیاسی اور غرض ذاتی زندگی میں بھی پورے کمال کے ساتھ دنیا کے سامنے آئیں اور دنیا سے اپنی بے مثال عظمت کا لوہا منوایا، پیشِ نظر حصۂ ثانی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی اخلاقی اور میدانِ جنگ میں دشمنوں کے ساتھ رحم وکرم کے پہلو کو پیش کیا گیا ہے۔

سماجی اور معاشرتی زندگی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمانہ کے واقعات پہلے حصّہ میں بیان کئے جاچکے ہیں۔

اخلاقی فضائل، روحانی کمالات اور سیاسی تدبر کا مکمل اور جامع نمونہ

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک کے دائمی ہدایت، عالمی مذہب اور عالم گیر طریقہ زندگی ہونے کی ایک واضح دلیل یہ ہے کہ آپؐ کی حیات اپنے اندر انسانی کمالات و اوصاف کا مکمل عکس رکھتی ہے۔ اگلے پیغمبر جس دور میں تشریف لائے اس دور میں انسانی زندگی محدود ضرورتیں رکھتی تھی، اس لئے وہ رسول و نبی بھی محدود صلاحیتوں کے مالک تھے، رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم جس دور میں تشریف لائے اس دور میں زندگی کا پھیلاؤ وسیع سے وسیع تر ہو گیا اس لیے اس دور کی رہنمائی کرنے والے رسول میں بھی رہنمائی اور ہدایت کا ہر رنگ نظر آتا ہے۔

آج کا انسان زندگی کے ہر شعبہ میں کسی ایک رسول و نبی کو اپنا ہادی بنانے کے لئے منتخب کرنا چاہے تو وہ ہزار تلاش و جستجو کے بعد اگلے رسولوں میں سے کسی ایک رسول سے اپنی پیاس نہیں بجھا سکتا اس جامعیت اور کمال کا ہادی جو زندگی کے ہر شعبہ میں تنہا ہر انسان کو کامیاب ترین زندگی کی طرف رہنمائی کرے تو وہ صرف رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور تاریخ اسے تسلیم کرتی ہے کہ انبیائے کرام اور پیشوایانِ عالم میں صرف رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ایسی ہے جو زندگی کی گوناگوں متضاد اور انواع و اقسام کی تمام صفتوں کا حسین ترین گلدستہ اور تمام انسانی اوصاف کا نہایت متوازن مجموعہ ہے۔

گوتم بدھ کے پاس صرف ترکِ دنیا اور زہد کا نمونہ ہے، تجارت، حکمرانی اور سماجی زندگی کا کوئی نمونہ نہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں جوش و جذبہ اور جلال ہے لیکن عفو و کرم اور درگذر کی کوئی اعلیٰ مثال نہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں عفو و کرم اور رحم دلی اور مسکینی ہے، لیکن برائی اور ظلم کی سرکوبی کی کوئی مثال نہیں اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں یہ تمام نمونے موجود ہیں

اخلاقی اعتبار سے دیکھو، عفو و کرم کے وقت بے مثال عفو و کرم ہے اور ظلم کے مقابلہ میں بے مثال شجاعت اور جلال ہے، مسکینی اور خاکساری ہے لیکن ضرورت کے وقت عظمت و رفعت کا اظہار بھی ہے

سماجی زندگی کو دیکھو، سر پہ مٹی کی ٹوکری ہے اور ایک جج، ایک حکمران اور سپہ سالار کا دبدبہ اور شوکت بھی ہے، ماں، باپ کے لئے ادب بھی ہے اور اولاد کے لئے محبت اور تربیت کی سختی بھی ہے، ایک شریف شوہر کا پیار بھی ہے اور اسی کے ساتھ ایک صاحب کردار شوہر کا کنٹرول بھی ہے۔

داؤد و سلیمان علیہما السلام سے زیادہ امیری اور دولت مندی بھی ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے زیادہ زہد اور غریبی بھی ہے، حدیبیہ میں صلح پسندی ہے تو طائف و حنین میں شجاعت و دلیری ہے۔ ایک کامیاب تاجر بھی ہیں اور کامیاب داعی اور مبلغ بھی، ممبر پہ بے مثال خطیب بھی ہیں اور صُفّہ پر خاموش معلّم اور مربّی بھی۔

حاصل یہ کہ وہ ایک زندگی جو جملہ رسولوں کے کمالات کا مظہر اور انسانی حسن و جمال کا بے مثال پیکر ہے اور تاریخ انسانی اس شانِ کمال کی کوئی زندگی نہ اب تک پیش کر سکی ہے اور نہ آئندہ پیش کر سکے گی، وہی زندگی آج تمام انسانوں کے لئے بہترین ہادی اور قائد بن سکتی ہے اور وہ زندگی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی خدا تعالیٰ نے قسم کھائی :

اسی لئے خدا تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی قسم کھائی اور اسے شہادت اور دلیل کے طور پر پیش کرتے ہوئے کہا ـــــ لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ ـــ "قسم ہے تیری زندگی کی، یہ (منکرین) گمراہی میں سرگرداں ہیں" (حجر، رکوع ۵)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ قیمتی اور سب سے زیادہ محبوب زندگی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے جس کی اس نے قسم کھائی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے سوا کوئی زندگی ایسی نہیں جس کی خدا نے قسم کھائی ہو۔

عربی میں قسم کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس چیز کی قسم کھائی جا رہی ہے اسے دلیل و شاہد کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔

اس لحاظ سے خدا تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو حق و صداقت کی سب سے زیادہ مؤثر دلیل بنا کر پیش کیا

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اپنی زندگی سے اپنی صداقت پر استدلال کرتے ہوئے فرمایا —— فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (یونس رکوع ۲) —

"میں نے تم میں اس سے پہلے عمر کا بڑا حصہ گذارا، کیا تم غور و فکر نہیں کرتے؟"

مطلب یہ کہ نبوت کے دعوے سے پہلے میں نے تم میں زندگی کے چالیس سال گذارے یہ عمر کا بڑا حصہ ہے۔ تو کیا میری وہ زندگی میرے سچا ہونے کی کافی دلیل نہیں ہے۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی آپؐ کے صادق، سچا اور دیانت دار ہونے کی شہادت اور دلیل کیسے ہے اس پر انصاف پسند مغربی مصنفین کے حسبِ ذیل تاثرات ملاحظہ ہوں۔

مغربی دانشوروں کا الگ الگ استدلال:

سر ولیم میور نے "لائف آف محمد" لکھی تو اسے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں بیوی خدیجہ کبریٰؓ، دوست ابو بکر صدیق رضؓ اور بھائی علی رضؓ اور خادم زیدؓ کے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ پر خلوص ایمان لانے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت نظر آئی اور اس نے اعتراف کیا کہ ایک مکار اور دھوکہ باز شخص باہر والوں کو تو اپنے فریب اور جھوٹ میں پھانس سکتا ہے لیکن اپنے گھر والوں کو زیادہ دیر تک اپنے دامِ فریب میں گرفتار نہیں رکھ سکتا۔

سر ولیم ایک بہت بڑے محقق عیسائی تھے اور ۱۸۶۸ء سے ۱۸۷۴ء تک سات سال یوپی کے گورنر رہ چکے ہیں اور چار جلدوں میں انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی لکھی ہے

دوسرے عیسائی عالم مسٹر گاڈفرے ہگنس ایک بڑے انصاف پسند محقق تھے انہوں نے متعصب عیسائیوں کے لگائے ہوئے الزامات کی تردید میں "اپالوجی فار محمدؐ" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔

مسٹر گاڈفرے کو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اس بات میں نظر آئی کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے سب سے پہلے عرب کے با اثر، دولت مند اور بڑے لوگ تھے جو اسلام قبول کرنے کے بعد بڑے بڑے کامیاب حکمران، کامیاب سپہ سالار اور نہایت منتظم ثابت ہوئے ——— جیسے ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، ابوعبیدہؓ، زبیرؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، عبدالرحمٰنؓ بن عوف وغیرہ ——— کم حیثیت لوگوں میں صرف زیدؓ اور بلالؓ وغیرہ تھے۔

وہ کہتا ہے کہ ایسے بڑی حیثیت اور عقل و دانش رکھنے والے لوگ آسانی سے کسی فریب میں گرفتار نہیں ہوسکتے تھے۔

بعض عیسائی علما دینِ عیسوی کی یہ خوبی سمجھتے ہیں کہ آپؑ پر سب سے پہلے کم حیثیت کے لوگ ایمان لائے، لیکن مجھ سے کوئی پوچھے تو مجھے اس سے زیادہ خوشی ہوتی کہ حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لانے والوں میں "لاک" اور "نیوٹن" جیسی حیثیت کے دانش ور اور فلاسفر ہوتے۔ (فقرہ نمبر ۱۵)
آگے چل کر (فقرہ ۴۲) میں گارڈفرے لکھتا ہے کہ تمام عیسائی بالاتفاق تسلیم کرتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم چالیس سال تک نہایت پاک طینت، نیک چلن اور صادق دامین رہے، پھر یہ کیسے مان لیا جائے کہ ایک شخص چالیس سال تک صادق و امین رہ کر اکتالیسویں سال ایک دم فریب کار اور جھوٹا بن گیا؟ پھر اس ایک دم بدل جانے کی دو وجہیں ہو سکتی تھیں۔

۱۔ دولت و ثروت کی خواہش ۲۔ عورت کی خواہش

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر دولت کے خواہشمند ہوتے تو کعبہ کی تولیت کا منصب حاصل کرنے کی کوشش کرتے جو ان کا خاندانی منصب تھا، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا، رہا عورت کا معاملہ تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسے نیک چلن نوجوان نے اپنی عمر (۲۵ برس) سے پندرہ برس بڑی ایک بیوہ عورت

سے شادی کی اور جب تک وہ زندہ رہیں دوسری کوئی شادی نہ کی اور نہایت پیار اور محبت سے سارا وقت گذارا — کیا اس کے بعد بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صداقت پر شبہ کیا جا سکتا ہے؟

انگلستان کے مشہور مورخ ایڈورڈ گبن کی نظر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چاروں خلفاء آپ کی صداقت کی ناقابلِ تردید دلیل ہیں۔

وہ کہتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے یہ چاروں ابتدائی شریک کار، جو بعد میں نہایت کامیاب حکمراں ثابت ہوئے اور انھوں نے دنیا کے بڑے حصہ کو فتح کر ڈالا اور نہایت سادگی اور اخلاص کے ساتھ حکومت کی، پھر ایسی قابلیت کے لوگ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر سب سے پہلے ایمان لائے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وجہ سے ان لوگوں نے طرح طرح کی تکلیفیں سہیں اور گھر سے بے گھر ہوئے تو کیا ایک فریب کار شخص کی وجہ سے یہ لوگ ایسی تکلیفیں اٹھا سکتے تھے؟

گاڈفرے (فقرہ ۱۲۳) میں لکھتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے ان متبعین میں جو دینی نشہ پیدا کیا وہ ایک چھوٹے انسان کا کام نہیں ہو سکتا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کے ابتدائی پیرو عیسیٰ علیہ السلام کے سولی دیئے جانے کے بعد انہیں چھوڑ کر بھاگ گئے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے یہ پیرو آخر وقت تک ان کے ارد گرد جمے رہے اور اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈال کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تمام دشمنوں پر غالب کر دیا۔

مسٹر کارلائل انگلستان کے مشہور مصنف ہیں وہ اپنی شہرہ آفاق کتاب (ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ لکچر دوم س ۴۳) پر لکھتے ہیں۔

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو پیغام دیا وہ بارہ سو برس سے قائم ہے اور آج اٹھارہ کروڑ انسان اس پر نہایت اعتقاد کے ساتھ قائم ہیں۔

تو کیا جس پیغام پر خدا کی اتنی مخلوق اپنی زندگی بسر کر کے مر گئی اور آج بھی اتنی مخلوق اس پر قائم ہے، کیا وہ پیغام ایک بازی گر کا کھیل تھا؟

سر سید احمد خاں نے اپنے خطبات میں اس پر ایک حاشیہ لکھا اور کہا کہ آج بھی مسلم حکومتوں

کے علاوہ جہاں اسلام کا سیاسی اقتدار نہیں ہے لاکھوں مسلمان بغیر کسی لالچ اور بغیر کسی دھونس کے پیغامِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پر قائم ہیں کیا یہ اس پیغام کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہے؟

یہ ہیں دنیا کے دانشوروں کے تاثرات ـــــــ

حقیقت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت عقل کو بھی مطمئن کرتی ہے اور جذبات کو بھی تسکین پہنچاتی ہے، عقل کی آنکھ سے دیکھو یا محبت کی آنکھ سے، ہر پہلو سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی اپنے آپ کو روشن اور ثابت کر کے دکھاتی ہے۔

تمام رسول سچے ہیں، لیکن محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں

قرآنِ کریم کی تعلیم یہ ہے کہ ہر قوم کی ہدایت کے لئے رسول بھیجا گیا ہے ـــــــ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُولٌ (سورہ یونس: ۴۷) ـــــــ "ہر قوم کے لئے رسول آیا ہے۔" ـــــــ دوسری جگہ ارشادِ گرامی ہے ـــــــ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (رعد: ۷) ـــــــ "ہر قوم کے لئے ہادی آیا ہے۔" ـــــــ

قرآنِ کریم نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ ہر رسول کی رسالت پر ایمان رکھا جائے اور رسولوں کے درمیان فرق نہ کیا جائے ـــــــ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (سورہ بقرہ ۲۸۵) ـــــــ "اہلِ ایمان یہ اقرار کرتے ہیں کہ ہم خدا کے رسولوں کے درمیان امتیاز نہیں کرتے۔" ـــــــ اسی کے ساتھ قرآنِ کریم نے یہ بھی واضح کر دیا کہ قرآن میں تمام رسولوں کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ بعض کا ذکر کیا گیا اور بعض کا ذکر چھوڑ دیا گیا ـــــــ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ (سورہ نساء: ۱۶۴، سورہ غافر: ۷۸) ـــــــ "ان رسولوں میں سے کچھ کا ذکر تو ہم نے تمھیں سنا دیا ہے اور کچھ کا ذکر نہیں سنایا۔" ـــــــ

قرآنِ کریم کی اس تعلیم کا حاصل یہ ہے کہ خدا نے ہر قوم میں اور ہر دور میں رسول بھیجے اور یہ رسول اس خاص دور کے لئے اپنے ساتھ خاص دین لے کر تشریف لائے وہ دین اس خاص دور کے لئے کافی

رہا اور اس دور کے لوگوں نے ان مذہبوں سے پوری پوری رہنمائی حاصل کی لیکن ان رسولوں کے بعد ایک آخری اور کامل رسول کی ضرورت باقی رہی جو ہمیشہ کے لئے پوری نوعِ انسانی کو قیامت تک ہدایت دیتا رہے، وہ ہدایت دائمی ہو، وہ کتاب مکمل ہو، وہ شریعت جامع ہو اور تاریخ پوری حفاظت کے ساتھ ہر دور کے انسانوں کے ہاتھوں میں پہنچاتی رہے، انقلاباتِ زمانہ اس شریعت کے کسی جزء کو خراب نہ کر سکیں، کوئی دماغ اس میں ترمیم کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرے۔

بلا شبہ یہ خصوصیات خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت میں موجود ہیں آپؐ کی لائی ہوئی کتاب قرآنِ حکیم میں موجود ہیں، آپؐ کے اسوۂ حسنہ کے اندر موجود ہیں۔

رومیوں اور یونانیوں کے دور بالخصوص سکندرِ اعظم کی فتوحات سے تاریخ کا وہ دور شروع ہوتا ہے جسے تاریخی عہد قرار دیا جاتا ہے، اس دورِ تاریخی کے لحاظ سے کئی مقدس رسولوں کو تاریخی حیثیت حاصل ہے اور تاریخ انھیں پورے وثوق اور یقین کے ساتھ پیش کرتی ہے مگر اس حیثیت سے جو حیثیت ایک قومی رسول کی ہو سکتی ہے ایک عالمی رسول کی حیثیت سے تاریخ نے اگر کسی رسول کو محفوظ رکھا ہے تو وہ رسول رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

پچھلے رسولوں کی ماننے والی قومیں (یہود، نصاریٰ وغیرہ) جب اپنے مذہب اپنی کتاب اور اپنے نبی کے لئے یہ دعویٰ کرتی ہیں کہ ان کا مذہب بھی عالمی اور دائمی ہے اور انسانیت کے موجودہ ترقی یافتہ دور کے لئے بھی کافی ہے تو یہ دعویٰ بڑی الجھنیں پیدا کر دیتا ہے اور اہلِ علم اس دعویٰ کو تحقیق کی کسوٹی پر کسنا شروع کر دیتے ہیں اور اس سے پیشوایانِ دین میں تقابلی مطالعہ کی نوبت آجاتی ہے۔ اور اس طریقۂ مطالعہ میں مذہبی پیشواؤں کے درمیان ادب واحترام قائم نہیں رہتا۔ اس لئے قرآنِ کریم کے نظریہ سے بہتر دوسرا کوئی نظریہ نہیں معلوم ہوتا کہ تمام مذہبی پیشواؤں اور تمام مذہبی کتابوں کو اپنے اپنے دور اور اپنے اپنے حالات کے لحاظ سے صحیح اور برحق مانا جائے اور دائمی اور آخری آسمانی پیغام کے لئے قرآن کریم کو اور آخری نبی کے لئے رسولِ عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے ایمان وعقیدت کا مرکز بنایا جائے۔

کیوں کہ آپ ہی کی تعلیم اور آپ ہی کی عملی زندگی کو جامعیت، کمال اور مکمل تاریخی حفاظت حاصل ہے، ہندوستان کے مشہور قومی اور سیاسی رہنما گاندھی جی نے بڑی صاف گوئی سے کہا ہے

Simplicity is not the monoply of Congressites I am not going to mention the names of Rama and Krishna because they were not historic personalities I am compelled to mention the names of (Hazrat) ''ABU BAKAR'' and (Hazrat) ''UMAR''. Though they were masters of Vast Empire, yet they lived the life of paupers (Harijan - dated 27 -7 - 73)

جس کا ترجمہ یہ ہے:۔ سادگی کانگریسیوں ہی کا اجارہ نہیں ہیں رام چندر اور کرشن کا ذکر نہیں کرتا کیونکہ وہ تاریخی شخصیتیں نہ تھیں ہیں ابوبکر رضؓ و عمر رضؓ کا ذکر کرنے پر مجبور رہوں، اگرچہ وہ بڑی وسیع مملکتوں کے مالک تھے تاہم انھوں نے فقیروں کی زندگی بسر کی (ہری جن مورخہ ۲۷ رجولائی ۱۹۷۳ء)

یہ آپؐ کے غلاموں اور آپؐ کے فیض یافتگان کے بارے میں اظہارِ عقیدت کیا جارہا ہے۔
پھر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کس درجہ عقیدت کی مستحق ہے؟

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی مقام کی تشریح میں

افراط و تفریط کے دو نقطۂ نظر

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی اور سیاسی حکمرانی کے بارے میں افراط و تفریط کے دو انتہا پسندانہ خیال پائے جاتے ہیں۔

ایک گروہ کے نزدیک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغی اور دعوتی جد و جہد کا مقصد سیاسی قوت حاصل کرنا تھا اور آپؐ نے اس مقصد کو ایک کامیاب اور مدبر سیاست داں کی طرح حاصل کیا

دوسرے گروہ کے خیال میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی کمالات، روحانیت، عبادت و ریاضت اور تعلیم و تزکیہ کے اعمال تھے اور سیاسی اقتدار خدا تعالیٰ کی طرف سے انعام و اجر کے طور پر عطا ہوا تھا۔

پہلے گروہ نے اپنے نظریہ کی تائید میں قرآنِ کریم کی جو تفسیر کی ہے اس کا ایک نمونہ درجِ ذیل کیا جاتا ہے۔

سورۂ حدید کی آیت ـــــ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ ـــــ کی تفسیر میں لکھتے ہیں ـــــ یہ آیت اپنے مفہوم میں بہت ہی صاف ہے۔ یہ بتاتی ہے کہ دین کو اللہ تعالیٰ نے صرف اس لئے مرتب کیا ہے اور اس لئے انبیاء کرام کو بھیجا ہے اور کتابوں کو نازل کیا ہے کہ وہ اپنی تبلیغی جد وجہد سے سیاسی قوت فراہم کر کے دین کے نظامِ اجتماعی کو برپا کریں۔

(معاشی ناہمواریوں کا اسلامی علاج ترجمان القرآن جولائی ۱۹۴۹ء)

دوسرا نمونہ ملاحظہ ہو، مولفۃ القلوب کی تشریح میں لکھتے ہیں ـــــ تالیفِ قلب کے معنی ہیں "دل کا موہنا"، اس حکم سے مقصود یہ ہے کہ جو لوگ اسلام کی مخالفت میں سرگرم ہوں اور مال دے کر ان کے جوشِ عداوت کو ٹھنڈا کیا جا سکتا ہو، یا جو لوگ کفار کے کیمپ میں ایسے ہوں کہ اگر

مال سے ان کو توڑا جائے تو ٹوٹ کر مسلمانوں کے مددگار بن سکتے ہیں تو لوگوں کو مستقل وظیفہ یا وقتی عطیے دے کر اسلام کے حامی و مددگار یا کم سے کم بے ضرر دشمن بنا لیا جائے (تفہیم القرآن سورہ توبہ)

دوسرے گروہ کے خیالات کا نمونہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی حسب ذیل عبارت ہے:

"علامہ شبلی نعمانیؒ کی سیرت النبی دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک بادشاہ وسلطان کی سوانح حیات ہے، کیونکہ اس میں بس یہ ذکر ہے کہ حضورؐ نے قریش کے مقابلہ میں تدبر وتحمل کا کس طرح مظاہرہ کیا، مدینہ والوں میں کس طرح اتفاق پیدا کیا، جنگ بدر میں یوں انتظام کیا اور احد و خندق میں ایسا کیا۔

بھلا یہ نبی کی سیرت ہے، ہم نے مانا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ملک وسلطان بھی ہیں مگر آپ اول نبی ہیں پھر ملک ہیں۔ محض بادشاہ ہونا آپ کا مخصوص کمال نہیں، بادشاہت تو کسریٰ وہرقل کو بھی نصیب تھی مگر وہ محض بادشاہ تھے اور حضور نبی وملک تھے، نبوت وسلطنت کے جامع تھے، تو سب سے پہلے آپؐ کی سیرت وتذکرہ میں کمالات نبوت کا ذکر ہونا چاہئے مگر آجکل اکثر سیرتیں اس سے خالی ہیں۔ (التبلیغ ۱۱ ص ۶، مطبوعہ ادارہ تالیفات اولیاء۔ دیوبند)

پہلے نقطۂ نظر کے نتیجہ میں ایک گروہ ایسا بھی پیدا ہوا جس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عام سیاسی مدبرین اور عام فوجی جرنیلوں کی صف میں کھڑا کر دیا اور آپؐ کی طرف سیاسی مکروفریب اور فوجی تشدد کو بھی بلا تکلف منسوب کرنا شروع کر دیا اس کی تازہ مثال "عہد نبوی کا تاریخی جائزہ" کے عنوان سے شائع ہونے والے مضامین میں دیکھی جاسکتی ہے جو ڈاکٹر فارق صاحب کی رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہیں اور ماہنامہ برہان میں ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئے ہیں اور اسی قسم کی تحریروں سے غیر مسلم معاندین اسلام کے خلاف یہ پروپگنڈہ کرتے ہیں کہ اسلام تلوار کے ذریعہ پھیلا ہے۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو محدود مفہوم میں صرف ایک روحانی پیشوا تھے اور نہ مروجہ سیاسی اصطلاح میں ایک کامیاب سیاسی لیڈر اور فاتح حکمران بلکہ آپؐ ایک کامل دینی رہنما اور آسمانی معلم اخلاق تھے، خدا کے آخری رسول اور رحمۃ للعالمین تھے۔

بلاشبہ آپؐ کا مقصد عرب کی سرزمین پر صرف سیاسی اقتدار حاصل کرنا نہیں تھا اور نہ صرف

اپنے آپ کو دنیا کا فاتحِ اعظم بنا کر عرب وعجم کے اقتدار کو اپنے قبضہ میں لینا تھا، مقصد آپ کا صرف یہ تھا کہ خدا تعالیٰ کی زمین پر انسانیت کو نجات اور سرفرازی حاصل ہو اور ظلم و تشدد کے دور کا خاتمہ ہو ۱۳ برس کامل مکہ کی زندگی میں آپ نے دنیا کو انہی اصولوں کی دعوت دی۔

آپ کے مخالفین نے اگر آپ پر الزام لگایا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم عرب کا سیاسی اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں، دولت چاہتے ہیں یا کسی اعلیٰ خاندان کی لڑکی ــــــ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے جواب میں یہی ارشاد فرماتے ہیں:

مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ (سورہ ص: ۸۶) ــــــ

"میں تم سے کوئی صلہ اور معاوضہ نہیں چاہتا اور میں یہ بات بناوٹ کے طور پر نہیں کہہ رہا۔"

مکہ کے سرداروں نے آپ کو کچھ دے لے کر راضی کرنا چاہا اور آپ کے سامنے سمجھوتہ کی پیشکش کی مگر آپ نے صاف انکار کر دیا، کیونکہ آپ سیاسی اقتدار کے حصول کی خاطر میدانِ اصلاح و دعوت میں نہیں اُترے تھے، آپ کا مقصد واضح اور آپ کی نیت صاف تھی کہ آپ دنیا میں توحید و اخلاق کی روشنی پھیلانا چاہتے تھے اور اس کے لئے خدا کی طرف سے مامور تھے۔

البتہ اسلام کی مکمل اصلاحی دعوت کا منطقی نتیجہ یہ نکلنے والا تھا کہ گمراہ طاقتیں تمام اسلحہ سے لیس ہو کر دعوتِ اسلام کو ختم کرنے کی کوشش کریں اور اس کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ابوجہل کی قیادت میں عرب کی جابر قوتیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ پر آگئیں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی پیش آنے والی صورتِ حال سے باخبر تھے، آپ اپنی سرکش اور ضدی قوم کے مزاج سے واقف تھے کہ ابوجہل اور ابوسفیان قریش کی قیادت سے دست بردار ہونے کیلئے تیار نہیں ہوں گے اور اس بناء پر وہ محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت اور برتری کو تسلیم نہیں کریں گے۔

چنانچہ آپ کو ایسا ہی تجربہ ہوا اور ۱۳ سال کے بعد جب آپ نے مکہ سے ہجرت فرمائی اور قریش کے ہاتھوں اپنے آپ کو قتل ہونے سے بچا لیا تو قریش کے سورما تلواریں لے کر مدینہ پر چڑھ آئے۔ اب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بچاؤ اور حفاظت کے لئے میدانِ جنگ میں مجبور ہو کر آنا پڑا۔

یہیں سے آپؐ کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ خدا تعالیٰ نے دعوتِ حق کے لئے غیب سے سروسامان مہیا کیا اور ہر میدان کی کامیابی خدا کا انعام و اکرام بن کر مسلمانوں کے پاس آئی، مگر خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسبابِ ظاہری کے درجہ میں دینِ حق کو کامیاب بنانے اور قریش سے میدان جیتنے کے لئے ہر ممکن تدبیر اختیار کی، اور اس طرح نصرتِ غیبی اور رسولِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیاب تدبیروں ——— دونوں باتوں ——— نے دعوتِ حق کو منزلِ مقصود پر پہنچایا۔

نصرت آسمانی کے واقعات کو دیکھ کر یہ سمجھنا کہ اسلام کی سیاسی سربلندی محض ایک آسمانی معجزہ تھا ——— حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تدبر اور شجاعت کو اس میں کوئی دخل نہ تھا ——— واقعہ کے خلاف ہے۔

اسی طرح رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیاب سیاسی تدبیروں اور مجاہدانہ حوصلوں کو دیکھ کر یہ رائے قائم کرنا کہ اول دن ہی سے آپؐ کا مقصدِ اصلی عرب پر سیاسی غلبہ حاصل کرنا تھا، ——— یہ بھی اصلیت اور حقیقت کا انکار ہے۔

آگے آرہا ہے کہ جب ابوسفیانؓ نے فتح مکّہ کے دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم عسکری طاقت کو دیکھ کر یہ کہا، عباس! تمھارے بھتیجے کی سلطنت بڑی ہوگئی، تو حضرت عباس رضؓ نے فرمایا۔ ابوسفیان! یہ سلطنت نہیں، نبوت ہے حضرت عباسؓ نے ابوسفیان رضؓ کی اسی غلط فہمی کو دُور کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طاقت ایک قومی حکمراں کی طاقت نہیں بلکہ ایک داعی حق اور معلمِ اخلاق کی طاقت ہے۔

دعوتِ حق اور سیاسی تحریک میں فرق:

اوپر کہا گیا ہے کہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی جدوجہد "دعوت و اصلاح" کی سعی و کوشش کی تھی. کوئی سیاسی تحریک نہ تھی۔

دعوتِ حق اور سیاسی اقتدار کی تحریک میں یہ فرق ہے کہ دعوتِ حق میں اصولِ حق کی سربلندی،

ان کی اشاعت اور بندگانِ خدا کے دلوں میں ان اصولوں کا اتارنا، داعی حق کا حقیقی منشاء ہوتا ہے۔ دنیوی اقتدار

کی خواہش اس کے دل میں اور دنیوی اقتدار حاصل کرنے کا نعرہ اس کی زبان پر نہیں ہوتا۔

اس لئے داعیانِ حق اپنے اعلیٰ اصولوں کو پھیلانے میں ادنیٰ درجہ کے جھوٹ، مکروفریب، دھونس اور دھاندلی اور گھٹیا قسم کے سودے بازی اور ترغیب و طمع سے کام نہیں لیتے، کیونکہ جن اصولوں کے لئے وہ کھڑے ہوتے ہیں انہی اصولوں کو وہ خود پامال کریں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے اور خدائے برتر و بزرگ اس دو عملی کو کیسے گوارا کر سکتا ہے؟

اس کے برعکس سیاسی اقتدار کی تحریک میں اصل مقصود کرسی پر قبضہ کرنا ہوتا ہے اور اس کے لئے ہر قسم کی اخلاقی برائیوں کو نہ صرف جائز سمجھا جاتا ہے بلکہ ضروری قرار دیا جاتا ہے۔

قرآنِ کریم نے بار بار مسلمانوں کو توجہ دلائی کہ وہ اپنی جدوجہد میں خدا تعالیٰ کی خوشنودی کو سامنے رکھیں، دنیا کے مفادات کو پیشِ نظر نہ رکھیں، قرآن مسلمانوں کے سامنے آخرت کی سرفرازی اور آخرت کے عیش کو بار بار پیش کرتا ہے۔

غزوۂ اُحد میں چند مسلمانوں نے مالِ غنیمت کی خاطر رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو نظر انداز کر دیا، اس پر قرآنِ کریم نے کس قدر فہمائش کی۔

اوپر اسلامی جہاد کی تشریح میں گزر چکا ہے کہ دنیوی جاہ و حشمت اور مال و متاع کے تصور سے کس طرح جہاد کے مفہوم کو پاک کیا گیا ہے یہ سب اس لئے کہ اسلامی دعوت، اخلاق و توحید کے اعلیٰ اصولوں کو بندگانِ الٰہی سے تسلیم کرانے اور ان پر عمل کرنے کی دعوت ہے، تخت و تاج کے حصول کی جدوجہد نہیں۔

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ کے دعوتی دور میں لوگوں سے ایمان لانے پر دنیوی اقتدار کا جو وعدہ کیا اور ان کے دل میں اس کا جو شوق پیدا کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے

اعلیٰ اصولوں پر چل کر مسلمانوں کی زندگی میں ہر قسم کی فکری، سماجی، معاشی اور معاشرتی خوبیاں اور بھلائیاں پیدا ہو جائیں گی اور ان کو زندگی کے ہر میدان میں عظمت و برتری حاصل ہو جائے گی۔

جو گمراہ طاقتیں آج برسرِ اقتدار ہیں یا وہ برضا و رغبت اسلام کے کامیاب اصولوں کو تسلیم کر لیں گی اور یا مسلمانوں سے آمادہ جنگ و پیکار ہو جائیں گی اور پھر اس جنگ و پیکار میں آخری غلبہ مسلمانوں کو حاصل ہوگا ——— ایک موقعہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ عرب سے کہا:

کلمۃ واحدۃ تعطونیھا تملکون بھا العرب وتدین لکم بھا العجم (ابن ہشام ج ۲ ص ۷۲) ——— "یہ کلمۂ وحدت ایک ایسا کلمہ ہے کہ اگر اسے تم لوگ قبول کر لوگے تو اس کے ذریعہ تمام عرب کو اپنے اقتدار میں لے آؤگے اور تمام عجم اس کلمے کی وجہ سے تمہارے پیچھے چلے گا"

اس کے علاوہ بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہا لوگوں کو سرزمینِ عرب پر سیاسی غلبہ کی خوشخبری سنائی اور ان سے وعدہ فرمایا کہ اگر تم لوگ اسلام کے اعلیٰ اصولوں کو اپنالوگے تو تمھیں امن وامان اور خوشحالی کی زندگی ملے گی۔

اس کا مطلب بھی یہی تھا کہ اس دور میں کفر و انکار کے اندر ڈوبی ہوئی قومیں جس طرح تباہ و برباد ہو رہی ہیں، عوام کو سیاسی حکمراں مظلوم و محکوم بنائے بیٹھے ہیں اور یہ سیاسی حکمراں اپنی عیاشیوں اور بداخلاقیوں کی بدولت ہلاکت کے کنارہ پر کھڑے ہیں، اسلام دونوں طبقوں کو اس سے نجات دلائے گا۔

اور دنیا ایک ایسے نئے ماحول میں پہنچ جائے گی جہاں امن و عافیت اور اخوت وانسانیت کا دور دورہ ہوگا۔

حاصل یہ کہ دعوتِ حق اور سیاسی تحریک کے درمیان واضح فرق موجود ہے ——— اور یہ فرق حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی میں قدم قدم پر نمایاں ہوتا ہے، آپ نے نازک سے نازک سیاسی اور حربی موقعہ پر جھوٹ بول کر کام نکالنے، دغا و فریب دے کر دشمن کو قتل کرنے، کسی عورت اور بچے اور مذہبی پیشوا کو ہلاک کرتے، امن پسند مخالفین کے اوپر چڑھ دوڑنے کی قطعاً

اجازت نہیں دیتے بلکہ ہر ہر قدم پر انسانی محبت، خیر خواہی، صدق و دیانت، عفو و کرم کے اسلامی اصولوں کی پابندی کرتے ہیں اور اپنے رفقاء سے پابندی کراتے ہیں۔

سیاسی تحریک کا یہ مزاج نہیں ہوتا، سیاسی لیڈر ہر قیمت پر ہر حربہ سے ظلم سے، جبر سے دھوکہ سے اور لالچ سے دشمنوں پر فتح حاصل کرنے اور سیاسی اقتدار پر قبضہ جمانے کی کوشش کرتا ہے وہ سیاسی لیڈر ایک رسول و نبی کی طرح بلند اخلاق پاک دامن اور پاک باطن نہیں ہوتا۔

حضرت خدیجہؓ کا تدبّر؟

قومی لیڈر اور رسول میں فرق

حضرت خدیجہؓ بڑی عقل مند خاتون تھیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں اور جب آپؐ نے پہلی وحی کے نزول کی کیفیت اپنی رفیقہ حیات سے آکر بیان کی تو آپؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے آپؐ کے پانچ اخلاقی اوصاف بیان کیے اور بتایا کہ جس انسان میں یہ خوبیاں موجود ہوتی ہیں اس پر کسی بھوت پریت کا اثر نہیں ہو سکتا، آپؐ کے پاس آنے والا اس عجیب و غریب شان سے کوئی گندی ہستی نہیں ہو سکتی۔ ان پانچ صفتوں میں سے آخری صفت یہ تھی۔

وتعین علی نوائب الحق (بخاری بدء الوحی) ——— "اور آپؐ مدد کرتے ہیں آسمانی مصائب پر لوگوں کی"۔

"مصائبِ حق" کا مطلب یہ ہے کہ آسمانی مصائب اچانک حادثے، جن میں لوگ گرفتار ہو جاتے ہیں، ان میں آپؐ لوگوں کے کام آتے ہیں "حق" کے لفظ نے خدا کے رسول کو ایک قومی لیڈر سے ممتاز اور الگ کر دیا ——— قومی لیڈر یا خاندانی سردار تو اپنی قوم اور اپنے خاندان کا ہر معاملہ میں ساتھ دیتا ہے، بخار اور کھانسی کا مریض آئے تو اسے ہسپتال لے جاتا ہے اور چوری اور ڈکیتی کا مجرم آئے تو اس کے ساتھ سفارش کے لئے پولیس چوکی میں چلا جاتا ہے

کیونکہ قومی لیڈر تو اپنی پارٹی کا ساتھ دیتا ہے، حق میں بھی اور ناحق میں بھی۔ خواہ برے آدمیوں کی حوصلہ افزائی سے علاقہ کے اور ملک کے عوام کو کتنی ہی تکلیف پہنچے۔ آج ہمارے ملک میں جو قانونی ابتری پھیلی ہوئی ہے، اس کی ذمہ داری اسی جمہوری نظام پر ہے جس میں ہر چور، ڈاکو اور بدمعاش کی حمایت کے لئے لیڈروں کے فون کھڑکنے لگتے ہیں، لیکن ایک نبی و رسول اور ایک حق پرست صرف حق و ناحق کو دیکھتا ہے، اپنے اور پرائے کو نہیں دیکھتا۔

حضرت خدیجہ کبریٰ رضی اللہ عنہا کے قول میں یہی اشارہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک حق پرست ہیں، قوم پرست یا وطن پرست نہیں ہیں کوئی شخص جائز مصیبت سے کمر آتا ہے آپ اس کی مدد کرتے ہیں اور غلط کام میں کسی قسم کا تعاون نہیں کرتے بلکہ اس کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نبوت سے پہلے ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر حق پرستی کی یہ شان پیدا ہو گئی تھی، آپ کی فطرت کو خدا تعالیٰ نے اسی سانچہ میں ڈھالا تھا۔

پھر آگے چل کر اسلام نے جس بے لاگ عدل وانصاف کا حکم دیا، اس میں بھی یہی تعلیم دی گئی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ وہ بے لاگ عدل وانصاف بہت جلد پورے معاشرے میں نافذ اور برپا ہو گیا۔

مالِ غنیمت سے دلچسپی پر مواخذہ:

یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رفقاء کرام کے اندر مالِ غنیمت سے دلچسپی پیدا نہ ہونے دی، تاکہ مسلمانوں میں یہ ذہن نشو ونما نہ پائے کہ تخت و تاج اور مال و دولت کے لئے تلوار اٹھاؤ اور کمزور قوموں کو اپنا غلام بنالو، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ذہن کو سختی سے روکا اور جہاد کے معاملات پر ہر پہلو سے کڑی نگاہ رکھی، احادیث میں آتا ہے کہ غزوۂ خیبر میں ایک صحابی رضی اللہ عنہ کی وفات ہو گئی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز جنازہ پڑھنے کی درخواست دی، آپ نے فرمایا ــــــــ صلوا علی صاحبکم ــــــــ "اس کی نماز خود پڑھ لو"، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گھبرا گئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ سے کیوں انکار کر دیا۔

فتغیرت وجوہ الناس لذالک فقال ان صاحبکم غل فی سبیل اللہ ففتشنا متاعہ فوجدنا خرزا من خرز یہود لا یساوی درھمین ــــــ "صحابہؓ کے چہرے بدل گئے، آپؐ نے فرمایا، تمہارے اس ساتھی نے مال غنیمت میں خیانت کی تھی، صحابہ کرام نے یہ سن کر اس اپنے ساتھی کے سامان کی تلاشی لی تو اس میں ایک معمولی ہار نکلا جو کسی یہودی کا تھا اور وہ دو درہم کی قیمت کا بھی نہ تھا۔"

اسی طرح ایک واقعہ آپؐ کے خادم خاص حضرت مِدعم کا ہے، ایک غزوہ میں یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اونٹ کے کجاوہ اتار رہے تھے کہ ان پر کسی دشمن کا تیر آ کر لگا اور یہ شہید ہو گئے صحابہ کرامؓ کے منہ سے نکلا ــــــ ھَنِیْئًا لہ الجنۃ ــــــ "اسے جنت مبارک ہو" آپؐ نے فرمایا:

ــــــ کلّا والذی نفسی بیدہ ان الشملۃ التی اخذھا یوم خیبر من المغانم لم تصبھا المقاسم لتشتعل علیہ نارًا ــــــ "ہرگز نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، انھوں نے خیبر کے دن جو چادر لی تھی، غنیمت تقسیم ہونے سے پہلے، وہ چادر ان پر آگ بن کر بھڑکے گی۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مدعمؓ کے متعلق جو شدید تنبیہ فرمائی، اسے ایک صحابیؓ سُن کر گھبرا اُٹھے اور دوڑے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور جوتی کا ایک تسمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں پیش کر دیا، آپؐ نے فرمایا:

شراک من النار ــــــ "یہ ایک تسمہ بھی آگ بن جاتا"۔

خلیفہ دوم حضرت فاروقِ اعظمؓ نے صحابہ کرامؓ میں اعلان کرا دیا تھا:

اذا وجدتم الرجل قد غل فاحرقوا متاعہ واضربوہ "جب تم کسی شخص کو مالِ غنیمت میں خیانت کرتے پاؤ تو اس کا سامان جلا دو اور اسے مارو۔"

اوپر کی احادیث مستند محدثین نے روایت کی ہیں اور ان کے پیش کرنے کا منشا صرف یہ دکھانا ہے کہ اسلام میں جہاد تخت و تاج اور دولت کے حصول کا ذریعہ نہیں بلکہ وہ فتنہ و فساد کی

سرکوبی کے لئے ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

ان واقعات سے حضرات صحابہؓ کی شان میں کسی قسم کی بدگمانی کو راہ نہ دی جائے صحابہ کرامؓ دنیا کی سب سے زیادہ پاکیزہ اخلاق اور پاک طینت جماعت تھی، البتہ وہ حضرات بشر تھے اور کبھی کبھی بشری کمزوری انھیں گھیر لیتی تھی اور اللہ تعالیٰ ان کی عظیم نیکیوں کی وجہ سے ان کی معمولی کمزوریوں کو معاف فرما دیتا تھا۔

ایک صحابی کی انسانی اور بشری کمزوری پر ہی خدا تعالیٰ نے یہ اعلان فرمایا تھا۔

اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ (سورہ ہود: ۱۱۴)

"بیشک بڑی نیکیاں بُرائیوں کو مٹا دیتی ہیں، یہ نصیحت ہے، نصیحت حاصل کرنے والوں کے لئے۔"

یہ حضرات صحابہؓ ہی تھے جن کے حق میں بلا کسی استثناء کے حق تعالیٰ نے فرمایا تھا:

اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۙ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ط (سورہ حجرات: ۸) —

"یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں خدا کے فضل و احسان سے۔"

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی

اور قدیم مؤرّخین اسلام

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال وصفی نے "محمدؐ اور بنی اسرائیل" کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ مسلمان اہلِ قلم نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ حسنہ آپؐ کی نرمی، ہمدردی اور شفقت پر بہت کچھ لکھا ہے اور کثرت سے اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواجِ مطہرات، اپنے عزیزوں، اپنے رفیقوں اور اپنی اولاد کے ساتھ کس قدر پیار اور محبت کا برتاؤ کیا ہے — لیکن ان اربابِ قلم نے اس عنوان پر بہت کم توجہ دی ہے

سرکوبی کے لئے ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

ان واقعات سے حضرات صحابہؓ کی شان میں کسی قسم کی بدگمانی کو راہ نہ دی جائے صحابہ کرامؓ دنیا کی سب سے زیادہ پاکیزہ اخلاق اور پاک طینت جماعت تھی، البتہ وہ حضرات بشر تھے اور کبھی کبھی بشری کمزوری انھیں گھیر لیتی تھی اور اللہ تعالیٰ ان کی عظیم نیکیوں کی وجہ سے ان کی معمولی کمزوریوں کو معاف فرمادیتا تھا۔

ایک صحابی کی انسانی اور بشری کمزوری پر ہی خدا تعالیٰ نے یہ اعلان فرمایا تھا۔

اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِیْنَ (سورہ ہود: ۱۱۴)

"بیشک بڑی نیکیاں بُرائیوں کو مٹا دیتی ہیں، یہ نصیحت ہے، نصیحت حاصل کرنے والوں کے لئے"۔

یہ حضرات صحابہؓ ہی تھے جن کے حق میں بلا کسی استثناء کے حق تعالیٰ نے فرمایا تھا:

اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۝ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ؕ (سورہ حجرات: ۸)

"یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں خدا کے فضل و احسان سے"۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی

اور قدیم مؤرخین اسلام

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال وصفی نے "محمدؐ اور بنی اسرائیل" کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ مسلمان اہل قلم نے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ حسنہ آپؐ کی نرمی، ہمدردی اور شفقت پر بہت کچھ لکھا ہے اور کثرت سے اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواجِ مطہرات، اپنے عزیزوں، اپنے رفیقوں اور اپنی اولاد کے ساتھ کس قدر پیار اور محبت کا برتاؤ کیا ہے — لیکن ان اربابِ قلم نے اس عنوان پر بہت کم توجہ دی ہے

کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دشمنوں اور مخالفوں کا کس تدبر اور مضبوطی کے ساتھ سامنا کیا ہے، اور آپؐ نے اپنے سخت ترین مخالفوں کے مقابلہ میں شدید سے شدید سیاسی حالات کے اندر کمزور اور ناتواں مسلمانوں کو کس طرح ایک سیاسی قوت بنا کر کھڑا کر دیا؟

اور اس ساری جدوجہد میں ایک طرف آپؐ کے ہاتھ سے اخلاق کریمانہ اور انسانی محبت کا دامن نہیں چھوٹا اور دوسری طرف آپؐ نے آمریت پسند اور خونخوار مزاج رکھنے والے دشمنوں کو ہر سیاسی اور فوجی میدان میں شکست دے کر عرب کی سرزمین پر ایک حکومتِ عادلہ کی بنیاد رکھ دی —— اور یہ اخلاقی اور سیاسی کمالات —— اور متضاد اور متباین صلاحیتیں عرب کے ایک بدوی اور اُمّی کے اندر جمع ہوئیں، اگر قسطنطنیہ، انطاکیہ، اسکندریہ اور روما جیسے متمدن اور مہذب ملکوں میں اس طرح کا انسان کامل پیدا ہوتا تو زیادہ تعجب کی بات نہ ہوتی لیکن ایسا کامل انسان اگر پیدا ہوا تو حجاز کی اس سرزمین پر جو اس وقت کے لحاظ سے تہذیب و تمدن کی روشنی سے محروم تھی۔

یہ اس امر کی کھلی دلیل ہے کہ وہ انسانِ کامل خدا کی طرف سے کھڑا کیا گیا، اور اس نے جو کچھ کیا وہ خدا کی تائید سے کیا اپنی طرف سے کچھ نہ کیا —— وان اجتماع الرافة الشديدة واللين والرحمة مع العزم والشدة والقوة فی شخصه صلی الله عليه وسلم دليل كماله الانسانی فالكمال فی التوسط بين النقائص وعلاج المواقف بما يناسبها:

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خالص روحانی آدمی تھے اور دنیا داری کے معاملات سے آپؐ کا کوئی تعلق نہ تھا —— یہ جہل یا تجاہل ہے ——

خدا تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو انسانِ کامل کہا ہے، جس میں روحانی اور سیاسی دونوں قوتیں جمع تھیں اور دنیا اور آخرت دونوں کے معاملات کا مکمل علم و ادراک آپؐ کے اندر ودیعت کیا گیا تھا

میں نے اس مسئلہ میں غیر جانب دار غیر مسلم مورخین کی طرف رجوع کیا تو میں نے دیکھا کہ ان مورخین نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کے اہم ترین سیاسی رہنماؤں میں جگہ دی ہے، کیونکہ ان لوگوں نے دنیا کے جدید سیاسی حالات کی روشنی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی کارناموں کا تجزیہ کیا اور آپؐ کی سیاسی سرگرمیوں کے شاندار نتائج دیکھے تب وہ مجبور ہو گئے کہ آپؐ کو رجالِ سیاست میں بلند ترین مقام دیں۔

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مصنّف نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے "معاہدۂ مدینہ" پر یہ لکھا ہے کہ یہ معاہدہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ایک بہت بڑا سیاسی انعام تھا۔ یعنی آپؐ نے ہجرت کے بعد مدینہ کے یہود اور مسلمانوں کے درمیان اپنی سربراہی میں جو "دفاعی معاہدہ" مرتب کیا وہ آپؐ کی بہترین سیاسی صلاحیت اور سیاسی قیادت کی دلیل ہے اور خدا کی طرف سے آپؐ کے لئے بہترین سیاسی تحفہ ہے۔

ہمارے قدیم مورخین حبیب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان عظیم سیاسی کارناموں اور سیاسی فتوحات پر پہنچتے ہیں تو وہاں پہنچ کر اس اعتراف پر بات ختم کر دیتے ہیں کہ آپؐ پر وحی الٰہی نازل ہوتی تھی اور آپؐ کا ہر قدم خدا کی ہدایت کے مطابق اٹھتا تھا اور وحی الٰہی آپؐ کو ہر قسم کی لغزشوں سے محفوظ رکھتی تھی ——— اس کے بعد یہ حضرات اس دور کے سیاسی تقاضوں اور ان کے مطابق حضورؐ کے کامیاب اقدامات پر غور و فکر کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

ان مورخین قدیم نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی اقدامات و ہدایات کو "سیاسۃ شرعیہ" کا نام دیا ہے اور وہ حضرات اسے "فقہ" کے عام مسائل کی طرح بیان کر دیتے ہیں اور علم سیاست کے مسلمہ اصولوں پر اس دور کے سیاسی معاملات کو منطبق کر کے یہ نہیں دکھاتے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس کامیاب تدبر کے ساتھ ان شدید حالات میں "خلافتِ اسلامیہ" کی بنیاد رکھ دی اور بے سر و سامان مسلمانوں کو ایک با اقتدار سیاسی قوت بنا کر کھڑا کر دیا۔

ان قدیم مورخین میں شیخ ابو الحسن ماوردی، ابو یعلیٰ الفراء، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ علامہ ابن قیم جوزیہ اور ابن قتیبہ وغیرہ ہیں۔

ان حضرات نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست پر کچھ لکھا ہے مگر بہت اختصار کے ساتھ اور اس میں بھی یہ حضرات اپنے دور کے تقاضوں سے متاثر نظر آتے ہیں۔

علامہ ابن خلدون نے مقدمہ میں سیاسی آراء پر روشنی ڈالی ہے۔ اسی طرح بعض اصحابِ اخبار نے اغانی اور امالی، عقد الفرید اور صبح الاعشیٰ میں بعض سیاسی لطائف بیان کئے ہیں اور بعض عرب فلسفیوں نے بھی اس دور کی سیاست کے بعض گوشوں پر بحث کی ہے لیکن اس دور کی سیاست پر جس اہتمام اور تدبر کے ساتھ بحث کرنے کی ضرورت تھی وہ کہیں موجود نہیں ہے۔

(محمدؐ و بنو اسرائیل مطبوعہ مصر ص ۶)

ڈاکٹر صاحب موصوف اور دنیائے عرب کے دوسرے جدید مورخین نے اس موضوع پر توجہ دی ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی کارناموں پر جدید علم سیاست کے اصولوں کی روشنی میں قلم اُٹھایا ہے۔

اوپر کے مقدمہ میں اس مصری عالم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست اور "وحی الٰہی" کے جس تعلق پر اختصار کے ساتھ چند جملے لکھے ہیں، یہ عنوان بہت تفصیل چاہتا ہے۔

مطالب یہ ہے کہ اصولاً یہ حقیقت قابلِ تسلیم ہے کہ ہر نبی کے کمالات کا حقیقی سرچشمہ "وحی الٰہی" اور علمِ آسمانی ہوتا ہے ——— لیکن اس میں کچھ تفصیل ہے۔

اور وُہ یہ ہے کہ سیاسی اور تمدنی معاملات میں وحی آسمانی کی طرف سے ہر ہر کل و جزء میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کا ہمیں کچھ علم نہیں ہے، جن معاملات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی واضح کر دیا ہے کہ اس معاملہ میں خدا کی طرف سے مجھے یہ ہدایت ملی، ان کے سوا جس قدر سیاسی اقدامات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہوئے وہ بظاہر آپؐ کے سیاسی تدبر اور بے خطاء اجتہاد و بصیرت کے ذریعہ ہوئے۔

محققینِ اسلام میں حضرت امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے حُجّۃُ اللہِ البالِغہ میں اس مسئلہ کو واضح کر دیا ہے کہ سیاست و معاشرت کے جزئیات اور تقاضے زمان و مکان کے بدلنے سے بدل جاتے ہیں، اس لئے وحی الٰہی نے اس طرح کے معاملات میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب الرائے مسلمانوں کو رائے اور عمل کی آزادی بخشتی ہے (حجۃ اللہ ج ا ص ۸۶)

زندگی کے اس (اجتماعی، سیاسی اور معاشرتی) میدان میں شریعت نے چند اصول مقرر کر دیئے ہیں، جن کے دائرے میں رہ کر ہر مسلمان کھانے، پینے، پہننے، اوڑھنے، رہنے سہنے اور صلح و جنگ کے طریقوں میں آزاد ہے۔

اس تشریح کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیاسی معاملات میں جو کامیاب اقدامات فرمائے ان میں آپؐ کے سیاسی تدبر اور فوجی حوصلہ مندی و شجاعت کو بھی بڑا دخل ہے، خدا کی توفیق کے ساتھ ساتھ ہر قدم پر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی بصیرت سیاسی تدبر، حوصلہ اور شجاعت اور مضبوط رائے اور اٹل قوتِ فیصلہ نے حالات کو بنایا اور سدھارا اور آپؐ کو تاریخِ عالم میں ایک بہترین مدبر اور سیاسی قائد کے مقام پر پہنچا دیا۔

اس موقعہ پر یہ بات بھی صاف کر دینی ضروری ہے کہ بعض جدید اہلِ قلم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی تدبر اور دفاعی اقدامات کی بہترین صلاحیت کو دیکھ کر آپؐ کے لئے "سیاسی مدبر" اور "بہترین سپہ سالار" قسم کے خطاب اور عنوان اختیار کرتے ہیں، اس پر تنبیہ کرتے ہوئے مصر کے مشہور مؤرخ ڈاکٹر احمد محمد الحوفی نے اپنی کتاب الجہاد میں لکھا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے موجودہ سیاسی خطابات استعمال کرنا مناسب نہیں، خدا تعالیٰ نے آپؐ کے لئے "الرسول" اور "النبی" کا جو خطاب استعمال کیا ہے وہی خطاب آپؐ کی مکمل صلاحیتوں اور مکمل کمالات کے اظہار کے لئے کافی ہے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی مشن

توحید و اخلاق کی دعوت

مکّی اور مدنی زندگی میں فرق :

مکّی زندگی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے رفقاء کی مظلومانہ زندگی تھی، اس زندگی میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر معمولی اخلاقی طاقت کا مظاہرہ کیا، اخلاق و شرافت، علم و صبر، خدمت و احسان کے یہ ۱۳ سال رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی زندگی کے بے مثال کارناموں کے سال تھے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کمزوری اور بے سروسامانی کے دور میں اخلاق و شرافت کا برتاؤ کیا کیوں کہ ایک کمزور کے لئے زور آور مخالفوں کے ساتھ شرافت اور احسان کے رویہ کے سوا دوسرا کوئی رویہ ممکن نہیں ہوتا، کمزور انسان اگر زور و مقابلہ پر اُتر آتا ہے تو مخالفوں کے ہاتھ سے نقصان اُٹھاتا ہے، کمزور آدمی کو زور آور کے سامنے جھکنا ہی پڑتا ہے، اسی وجہ سے ان مخالفین کے نزدیک رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکی زندگی میں اس راستہ کو بطور ایک وقتی پالیسی کے اختیار کیا ——— لیکن انصاف پسند تاریخ داں جب یہ دیکھتے ہیں کہ مدنی زندگی میں داخل ہو کر مکہ کا کمزور اور مظلوم سیاسی قوت کا مالک بن جاتا ہے اور اس قوت و شوکت کے باوجود دشمنوں کے ساتھ اس کے اخلاق، شرافت اور صبر و احسان کا معاملہ پہلے سے زیادہ رحم و کرم کا جوش لے کر نمودار ہوتا ہے وہ طاقت ہاتھ میں لے کر بھی جب کل زور آور دشمنوں کو اپنے سامنے مغلوب و مفتوح پاتا ہے تو اس کے جذبۂ شرافت میں کمی نہیں آتی، وہ کل کے جور و ظلم کو یاد کر کے انتقام پر نہیں اُترتا، بلکہ ظالموں اور حملہ آوروں پر عفو و کرم اور رحمت و احسان کی بارش شروع کر دیتا ہے ——— تو مکہ کے اس مظلوم کو مدینہ کی تاجداری کے دور میں بھی شرافت و رحمت کا مجسمہ دیکھ کر یہ لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم واقعی رحمۃ للعالمین ہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق مکہ میں ایک وقتی پالیسی کا نتیجہ

نہ تھے بلکہ اخلاق و شرافت آپؐ کا حقیقی مشن تھا، جو کمزوری اور طاقت دونوں حالتوں میں یکساں طور پر جاری رہا۔

مکی زندگی کا دور مسلمانوں کو یہ سبق دیتا ہے کہ جب کوئی گروہ مخالفوں کے ساتھ پورے خلوص اور سچائی سے ——— نہ کہ عیاری اور وقت گذاری کی نیت سے ——— اعلیٰ اخلاق کا برتاؤ کرتا ہے تو خدا تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ اس با اخلاق اور شرافت پسند گروہ کو سرفرازی اور سربلندی عطا کر دیتا ہے، ان نیکی پہ ند صبر کرنے والوں کے لئے ظاہری اور باطنی طور پر ایسے حالات پیدا کر دیئے جاتے ہیں کہ ان کے ہاتھ میں اخلاقی قوت کے ساتھ ساتھ مادی قوت بھی آجاتی ہے اور پھر خدا تعالیٰ اس مادی اور سیاسی قوت کے دور میں اس ایمان والے گروہ کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ اس سیاسی قوت کو غرور و تکبر اور نفسانی عیش و آرام کے لئے استعمال نہ کرے بلکہ اس مادی طاقت کو اپنے اخلاقی مشن کی اشاعت اور دنیا کے ہر گوشہ سے بدی اور شیطنت کی قوتوں کو ختم کرنے کے لئے کام میں لائے۔

حاصل یہ کہ اعلیٰ اخلاق، اعلیٰ شرافت، خدمت اور صلح و سلامتی اسلام کا مستقل مشن ہے، امن و سلامتی اسلام کی مستقل پالیسی ہے، خدمت اور شرافت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مستقل اسوۂ حسنہ ہے، جسے ہر حال میں ——— مغلوبیت کا دور ہو یا غلبہ کا ——— محکومی کا دور ہو یا فرمانروائی کا ——— امت مسلمہ کو اختیار کرنا چاہئے۔

اب اس سوال کو پھر دہرائیے گا ——— مسلمان جب کسی مقام پر کمزور ہوں مغلوب اور مقہور ہوں تو وہاں اپنی قومی عزت کو اور اپنی دینی عظمت کو کس طرح قائم رکھ سکتے ہیں؟

سیاسی طاقت سے جہاں مسلمان محروم ہو جائیں وہاں اس سیاسی طاقت کی کمی کو کس طرح دُور کیا جا سکتا ہے؟

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی اس سوال کا جواب دیتی ہے کہ ——— اس دور میں اخلاقی طاقت پیدا کر کے اس کے ذریعہ سیاسی کمزوری کی تلافی کی جائے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ایسی اخلاقی طاقت جو سیاسی طاقت کا مکمل بدل اور قائم مقام بن سکے صرف ایک نبی و رسول کے پاس ہو سکتی ہے۔ یا پھر اس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے براہ راست جانشینوں اور فیض یافتگان کو حاصل ہو سکتی ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت سیاسی کمزوری کے دور میں اخلاقی کردار بنانے پر پورا زور صرف نہ کرے اور سیاسی قوت سے محروم ہو جانے کے بعد گڑھوں میں اپنے آپ کو دھکیل دے۔

اسلام کہتا ہے، مایوسی کفر ہے، امت کو ہر حال میں یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ اس کے اجتماعی اور قومی کردار میں اخلاق و روحانیت کا جمال پیدا ہو جائے اور اس جمال کے ذریعہ وہ سیاسی قوت سے محرومی کے دور میں اپنے مذہب کی عظمت کو قائم رکھنے کا فرض ادا کرے۔

اقبال مرحوم ایسے ہی حالات کے لئے مسلمانوں سے کہہ گئے ہیں ؎

ہو چکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور

اسی شانِ جمالی سے کمزور امت کو اپنے مذہبی وجود کی حفاظت کرنی چاہیئے۔

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے رفقاء نے مکی زندگی میں اسی شانِ جمالی اور اخلاقی قوت سے کام لیا اور آنے والوں کے لئے اسی راہ کی پیروی ضروری قرار دی گئی ـــــ اب بھی اسی شانِ جمالی سے کمزور امت کو اپنے مذہبی وجود کی حفاظت کرنی چاہئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے جس وقت اپنے بھائیوں کے سامنے اپنے یوسف ہونے کا اعلان کیا اور صورتِ حال کے چہرے سے نقاب الٹی تو ارشاد فرمایا : ـــــــــ

قَالَ اَنَا یُوْسُفُ وَهٰذَاۤ اَخِیْ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَاؕ اِنَّهٗ مَنْ یَّتَّقِ وَیَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ (سورہ یوسف) ـــــ "یوسف بولے، میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے بے شک خدا تعالیٰ نے ہم سب پر احسان فرمایا، بلا شبہ جو شخص بھی تقویٰ اور صبر اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔"

حضرت یوسفؑ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے ہم سب پر جو احسان فرمایا، مجھے غلامی سے

بادشاہت کے مقام پر پہنچایا اور تم سب میرے خاندان والے میرے پاس زندہ وسلامت آ گئے اور میرے بوڑھے باپ کی آرزو پوری ہو گئی، یہ حیرت انگیز ترقی اور غیر معمولی انعام واکرام ہر اُس شخص کے پاس ہو سکتا ہے جو تقوٰی اور صبر کی راہ اختیار کرتا ہے، کیونکہ خدا تعالیٰ حسنِ عمل سے آراستہ بندوں کی محنت کو برباد نہیں ہونے دیتا۔

خدائی انعام واکرام کے لئے جو قدرت کا عام قانون ہے قرآنِ کریم نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ (سورہ عنکبوت)

"جو لوگ ہماری ہدایت کے مطابق کوشش کرتے ہیں ہم ان پر کامیابی کے راستے کھول دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اچھے کام کرنے والوں کے ساتھ ہے"

قرآن نے اعلان کیا کہ خدا کی رحمت اور اس کے انعام واکرام کا راستہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے بندے جب جدّوجہد کرتے ہیں خدا تعالیٰ انھیں اپنے فضل واحسان سے نوازتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے رفقاء پر ان کے درجہ کے مطابق انعام واحسان ہوتا ہے اور ان کے بعد نیک عمل کرنے والے مسلمانوں پر ان کے درجہ کے مطابق خدا کی رحمت کا نزول ہوتا ہے سورہ رُوم میں فرمایا ——— وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ——— "اور ہم پر حق ہے مدد کرنا اہلِ ایمان کی"۔

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے کامل ۱۳ برس جس بے مثال اخلاقی قوت کا مظاہرہ کیا، خدا تعالیٰ کی طرف سے اس پر انعام واکرام نازل ہوا اور مدینہ منورہ آنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں سیاسی طاقت بھی آگئی۔

یہ اخلاقی اور سیاسی طاقت حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے بعد آپؐ کے چاروں خلفاء کے عہد تک ایک جگہ جمع رہی اور امت کا نمائندہ طبقہ اپنے نبی کے اخلاقی جمال اور سیاسی جلال دونوں کا مکمل نمونہ بنا رہا ——— اور یہ عہد چالیس سال تک رہا۔

اس کے بعد اخلاقی طاقت پر زوال آنا شروع ہو گیا، البتہ سیاسی طاقت اپنے عروج پر قائم رہی ______ مسلمانوں کی سیاسی طاقت کے دور میں اخلاقی طاقت کے انفرادی نمونے اولیاء حق اور مصلحین اُمت کی شکل میں نمودار ہوتے رہے اور ان کے ذریعہ دنیا کے کونہ کونہ میں اسلام پھیلتا رہا ہے۔

ڈاکٹر آرنلڈ کی کتاب "پریچنگ آف اسلام" کا مطالعہ بتاتا ہے کہ دنیا کے ہر گوشہ میں اور ہر دور میں اسلام کے ان اخلاقی نمائندوں نے غیر مسلم حلقوں میں اسلام کی روشنی پھیلائی اور اقبال مرحوم کو کہنا پڑا ؎ ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

اب ذیل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی اخلاق کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ یہ بات صاف ہو جائے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر حالت میں اور ہر میدان میں داعی حق، معلم اخلاق اور توحید و آخرت کے مبلغ تھے اور مسلمانوں کے لئے بھی اسی اسوۂ حسنہ کی پیروی ضروری ہے۔

کفر کی طرف سے نکالنے کی دھمکی اور

حضرات انبیاء کا جواب

قرآنِ کریم بتاتا ہے کہ باطل طاقتوں نے ہمیشہ داعیانِ حق اور مصلحین اخلاق کو وطن سے نکالنے کی دھمکی دی ہے ______ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ۭ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ ۝ (سورہ ابراہیم: ۱۳،۱۴)

______ "کفر کی طاقتوں نے رسولوں کو دھمکی دی کہ ہم تمہیں وطن سے نکال دیں گے، یا تم ہمارے دین میں واپس آجاؤ، اس پر ہم نے ان کے پاس پیغام بھیجا کہ ہم ظالموں کو ہلاک کر دیں گے اور ان کے بعد تمہیں اس سرزمین میں بسا دیں گے، مگر یہ ان کے لئے ہوگا جو میری حاضری سے ڈریگا،

اور میری وعیدوں سے "۔۔۔۔ کفر کی دھمکی کے جواب میں حضرات انبیاء کرام نے کیا کہا؟

۱۔ زبانی بات چیت کی حد تک کیا جواب دیا؟

۲۔ باطل قوتوں کی عملی دست درازی کے بعد کیا کیا؟

۳۔ خدا تعالیٰ نے اپنی غیبی امداد کے لئے کیا شرط رکھی؟

ان تینوں سوالوں کا جواب قرآنِ کریم نے دیا ہے

دھمکی کا زبانی جواب:

کفر کی دھمکی کا زبانی جواب کیا دیا گیا؟ ۔۔۔۔ اس کے لیے قرآن کریم نے حضرت شعیب علیہ السلام کا رویہ پیش کیا:

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ۝ قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ۝ ۔۔۔۔ "(تو) ان کی قوم میں جو لوگ سردار اور بڑے آدمی تھے وہ کہنے لگے کہ اے شعیبؑ! ہم تجھے اور تیرے ساتھی ایمان والوں کو وطن سے نکال دیں گے یا تم لوگ ہمارے دین میں واپس آجاؤ، شعیبؑ نے کہا، خواہ ہم اسے کتنا ہی ناپسند کریں تب بھی؟ مگر اس صورت میں ہم اللہ تعالیٰ پر افتراء کرنے والے ہوں گے، اگر نجات پانے کے بعد ہم دینِ باطل میں لوٹ جائیں گے اور ہمارے لئے مناسب نہیں کہ ہم لوٹیں، لیکن اگر اللہ تعالیٰ چاہے ہمارے رب کا علم وسیع ہے، ہم اسی پر توکل کرتے ہیں، اے خدا ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان فیصلہ کر دے حق کے ساتھ اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔"

قرآنِ کریم نے حضرت شعیبؑ کا جو جواب نقل کیا ہے اس میں چند باتیں واضح کی گئی ہیں:
ایک بات یہ واضح کی گئی ہے کہ حضرت شعیبؑ نے اس دھمکی اور دھونس کے جواب میں کوئی ناشائستہ

بات منہ سے نہیں نکالی، آپؑ نے کوئی بد اخلاقی نہیں کی، بلکہ نہایت اعلیٰ اخلاق اور تواضع وبندگی کے ساتھ جواب دیا۔

شعیبؑ نے کہا، ہمارے لئے لوٹنا ممکن نہیں مگر اللہ چاہے ——— یہ استثناء بظاہر بالکل بے جوڑ ہے، اللہ تعالیٰ کسی رسول کے حق میں خاص طور پر یہ ارادہ نہیں کرتا کہ وہ ایمان کے بعد کفر میں لوٹ جائے اور مرتد ہو جائے، معاذ اللہ، لیکن اس کے باوجود حضرت شعیبؑ اللہ کی مشیت سے ڈر رہے ہیں، یہ دراصل تواضع اور بندگی کی بات ہے۔ شعیبؑ اس نازک معاملہ میں خدا کو بیچ میں ڈال رہے ہیں، خدا کو متوجہ کر رہے ہیں کہ اے خدا! معاملہ میری ذات کا نہیں بلکہ تیرے دین اور تیرے پیغام کی عزت کا ہے۔

پھر شعیب علیہ السلام صراحت کے ساتھ خدا پر توکل کر رہے ہیں اور خدا سے بہتر فیصلہ کی دُعا کر رہے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ حضرت شعیبؑ نے کفر کی دھمکی کے جواب میں ایک بلند اخلاق انسان کا رول اختیار کیا، جوش اور اشتعال کا گھٹیا راستہ اختیار نہیں کیا۔

دوسرا واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے

ابراہیمؑ کے باپ آزر نے خلیل اللہ کو گھر سے نکالنے کی دھمکی دی اور کہا:

لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ۝ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ۝ (سورہ مریم: ۴۶، ۴۷) ——— "(آزر بولا) اے ابراہیم! اگر تو باز نہ آیا تو ہم تجھے سنگسار کر دیں گے اور تو نکل جا ایک مدت کے لئے، ابراہیم نے فرمایا: تم پر سلامتی ہو میں تمہارے لئے دعاء مغفرت کروں گا، میرا پروردگار میرے ساتھ بڑا مہربان ہے۔"

ابراہیم علیہ السلام گھر سے نکل رہے ہیں، نہ کوئی خفگی ہے۔ نہ ظالم باپ کی شان میں گستاخی ہے، بلکہ اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ ہے، سلام ہے، دعا ہے۔

شاہ عبد القادر صاحبؒ نے اپنے حاشیہ (قرآن مجید) میں لکھا ہے:

"یہ رخصت کا سلام ہے معلوم ہوا کہ اگر دین کی بات سے ماں باپ ناخوش ہوں اور گھر سے نکالنے لگیں تو بیٹا بات میٹھی کہہ کر نکل جائے وہ بیٹا عاق نہیں" (سورۂ مریم)

آزر نے بھی حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ ماماتا کی رعایت کی ہے۔ یہ نہیں کہا کہ ہمیشہ کے لئے نکل جا، بلکہ یہ کہا کہ ایک مدت کے لئے نکل جا۔

آخر باپ کی ماماتا کیسے ہمیشہ کے لئے بیٹے کو جدا کرنے پر رضامند ہو جاتی، حضرت ابراہیمؑ کی سلامتی کی دعا میں یہ راز بھی پوشیدہ ہے کہ خلیل اللہ نے اپنے گھر والوں پر عذابِ الٰہی کے نزول کو روکا، کیونکہ سنت اللہ کے مطابق ابراہیم جیسے حق پرست کو نکالنے کے بعد نکالنے والوں پر ہلاکت کے آنے کا قوی امکان تھا۔

مدینہ منوّرہ میں اسلام

اب اس امر پر غور کرو کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی کہاں سے اور کیسے شروع ہوئی؟ اور آپؐ کو مخالفینِ اسلام نے کس طرح مجبور کیا کہ آپؐ اپنا عزیز وطن چھوڑیں اور اس راہ میں قدرتِ الٰہی نے آپؐ کی کتنی مدد فرمائی اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلیٰ سیاسی بصیرت نے کس طرح راہ کی مشکلات پر قابو حاصل کیا؟

مکہ اور مدینہ میں فرق :

مکہ معظمہ کے اندر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۳ برس پیغام حق کی دعوت دی، اس دعوت میں آپؐ کو وہاں کے حالات کے مطابق بھرپور کامیابی حاصل ہوتی، دعوت و تبلیغ کا اثر انہی طبیعتوں پر پڑتا ہے جن میں ضد اور ہٹ دھرمی نہیں ہوتی اور سچی بات کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں اس لحاظ سے آپؐ کے وعظ و نصیحت کے اس دور کو کامیاب ہی کہا جاسکتا ہے، ناکام نہیں کہا جاسکتا، الجہاد کے مؤلّف نے اس سلسلہ میں لکھا ہے:

"لیکن وعظ و تلقین کی ناکامی کے بعد داعیِ اسلام نے ہاتھ میں تلوار اٹھائی"[1]

مودودی صاحب کے ان الفاظ سے ہر شخص اتفاق نہیں کرسکتا آپؐ نے وعظ و تلقین کی ناکامی کے بعد تلوار نہیں اٹھائی بلکہ صلاحیت رکھنے والی طبیعتوں کو وعظ و نصیحت سے اپنی طرف کھینچ لینے کے بعد جب صرف ضدی اور ہٹ دھرم لوگ رہ گئے اور وہ کسی طرح ظلم و تشدد سے باز آنے کے لئے تیار نہ ہوئے تو پھر آپؐ ان کے مظالم کو روکنے کے لئے تلوار اُٹھانے پر مجبور ہوگئے۔

البتہ یہ بات درست ہے کہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ منورہ کے اندر جتنے قلیل عرصہ اور تھوڑی مدت میں اشاعتِ اسلام کے اندر کامیابی حاصل ہوئی اتنی مکہ معظمہ کے اندر حاصل نہیں ہوئی۔

---

[1] الجہاد مولفہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صہ ۱۳۲

مدینہ منورہ کے چند ہفتے اور چند روز مکہ معظمہ کے ۱۳ سال سے آگے نظر آتے ہیں۔

اس کا سبب یہ تھا کہ مکہ معظمہ میں قریش کی قیادت کے تحت مکہ کی آبادی متحد اور منظم تھی اور تمام قبائل کے درمیان معاہداتی اتحاد قائم تھا، اس لئے کون اس بات کی جرأت کر سکتا تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول کر کے تمام مکہ کو اپنا مخالف بنالے۔

چنانچہ جو صاحب ہمت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو تسلیم کر کے مسلمان ہوئے انھیں تمام مکہ کی دشمنی مول لینی پڑی۔

مکہ کے مقابلہ میں مدینہ منورہ کے سیاسی حالات بالکل دوسرے تھے یہاں تین گروہ آباد تھے، ایک طرف یہودی تھے دوسری طرف انصار، یعنی اوس و خزرج —— ان دونوں گروہوں میں اقتدار کی جنگ چلتی تھی، یہود اہلِ کتاب تھے اور ایک مذہبی نظام اپنے پاس رکھتے تھے، انصار کے پاس کوئی مذہبی نظام نہ تھا اور اس کمی کو وہ برابر محسوس کرتے تھے، پھر یہ انصار (اوس و خزرج) خود بھی آپس میں لڑتے تھے اور اس آپس کی لڑائی کی وجہ سے ان میں کمزوری پیدا ہوگئی تھی ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اوس و خزرج ضرورت محسوس کرتے ہوں گے کہ دونوں قبیلے متحد ہو کر یہود کے مذہبی غرور اور اقتصادی استحصال سے نجات حاصل کریں مگر مشکل یہ ہوگی کہ ان میں سے کوئی قبیلہ دوسرے قبیلہ کی قیادت تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوتا ہوگا البتہ ان دونوں کے لئے یہ بات آسان ہو سکتی تھی کہ باہر کی تیسری قیادت کے تحت یہ اپنے آپ کو مضبوط کریں اور پھر انھیں یہود کے غلبہ سے چھٹکارا حاصل ہوئے

چنانچہ ایسا ہی ہوا اور قدرت نے ان کے سامنے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو نجات دہندہ بنا کر کھڑا کر دیا —— یہ تمام عالم کے لئے نجات دہندہ تھا، تمام عرب کے لئے عظمت و شوکت کا نشان تھا، مگر بدقسمت قریش نے ۱۳ سال تک اس کا پیغام سنا اور اس کے شہر مکہ کی اجتماعی فضا، غرور و سرکشی پر تلی رہی اور یہ ضدی لوگ ایک ہی رٹ لگاتے رہے کہ نہیں نہیں منظور نہیں —— مگر نجات و فلاح کا یہی پیغام جب مدینہ منورہ پہنچا تو اس گلِ وحدت کی نکہت

کے پہلے ہی جھونکے نے مدینہ کی روح کو سرمست و بے خود کر دیا اور اس نورانی بستی نے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے آغوش میں لے لیا اور کل کا یثرب ——— آج کا مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا شہر ——— بن گیا ———

یوں تو سب سے پہلے یثرب کے دو نوجوان (ایک سوید بن صامت اور دوسرا ایاس بن معاذ) رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام سے بہرہ اندوز ہوئے مگر یہ دونوں ہی بہت جلدی آپس کی جنگ میں مارے گئے اور اسلام کا پیغام ان کے ذریعے سے مدینہ میں آگے نہ بڑھ سکا۔ ہاں نبوت کے گیارھویں برس حج کے موقع پر قدرتِ خداوندی نے یثرب کے خوش بختوں کا باقاعدہ ہاتھ پکڑ لیا

مدینہ منورہ میں پہلی دعوت:

حضرت جابر بن عبداللہ رضؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے دس سال تک[1] مکہ معظمہ میں ایک ایک گھر پر جا کر موسم حج میں عکاظ اور مُجَنّہ (مکہ کے بازاروں اور تہواروں) میں پہنچ کر دعوتِ حق دی اور فرمایا من یاویتی ؟ من ینصرنی ؟ حتی ابلغ رسالۃ ربی وله الجنۃ ——— کون مجھے پناہ دیتا ہے؟ کون میری مدد کرتا ہے؟ تاکہ میں اپنے پروردگار کا پیغام پہنچا سکوں اور اس کو جنت ملے" ——— لیکن اس دس سالہ مدت میں مدینہ کے اوس و خزرج حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نہیں پڑے اور ان کے سامنے پیغامِ حق پیش کرنے کا موقع نہیں آیا، دس سال گذرنے کے بعد جب گیارھواں سال نبوت کا آیا تو اب خدا تعالیٰ نے اپنے دین اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سر بلند کرنے کا ارادہ فرمایا اور چند خزرجی افراد سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ہو گئی۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حسب معمول حج کے موسم میں لوگوں سے ملتے جلتے پھر رہے تھے کہ چند آدمیوں پر آپؐ کی نظر پڑی اور آپؐ ان کے پاس پہنچے اور آپؐ نے ان کے سامنے اسلام کا پیغام رکھا، انھوں نے سُنا اور سُن کر آپس میں کہنے لگے:

---

[1] محمد صلی اللہ علیہ وسلم و بنو اسرائیل از ڈاکٹر مصطفیٰ کمال وصفی مصری ص ۲۸

یا قوم تعلمون، واللّٰہ انہ النبی الذی توعدکم بہ یھود فلا یسبقنکم الیہ

"اے ساتھیو! جان لو کہ یہ وہی نبی ہے جس کے متعلق یہود پیشین گوئی کرتے ہیں، پس اب کہیں وہ تم سے آگے نہ بڑھ جائیں۔"

یہ کہہ کر ان لوگوں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:

قوم بینھم من العداوۃ والشر ما بینھم وعسیٰ ان یجمع اللّٰہ بک فسنقدم علیھم فندعوھم الی امرک وتعرض علیھم الذی اجبناک الیہ من ھذا الدین فان یجمع اللّٰہ علیک فلا رجل اعز منک (البدایہ لابن کثیر ج ۲ ص ۱۷۷)

"ہماری قوم میں آپس میں عداوت و شر پھیلا ہوا ہے، شاید اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعہ ان کو متحد کردے ہم اپنی قوم کے پاس جائیں گے اور آپ کا پیغام انھیں سنائیں گے اور اپنے ذاتی تاثرات بھی ان کے سامنے رکھیں گے جو اس دین کے بارے میں ہیں، پس اگر خدا نے اس دین پر انھیں جمع کردیا تو پھر آپ سے زیادہ کوئی دوسرا عزت والا اور قوت والا کوئی نہ ہوگا۔"

یہ چھ آدمی تھے، جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے اور مدینہ لوٹ گئے۔

ان کی گفتگو سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ جس دعوتِ حق میں قریش مکہ کو تفریق اور اختلاف کا سامان نظر آ رہا تھا، اسی پیغام میں مدینہ کے اس گروہ کو اتحاد اور قوت دکھائی دی اور انھوں نے اس آئینہ میں اپنے روشن مستقبل کی ایک جھلک دیکھی۔

ظاہری اسباب کے لحاظ سے سیاسی اور اجتماعی حالات کی یہی وہ سازگاری تھی جو مدینہ منورہ کی فضا میں اسلام کو حاصل ہوئی اور جب یہ چھ آدمی مدینہ واپس گئے اور اوس و خزرج کے سامنے اسلام اور ہادیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا مسئلہ رکھا تو بغیر کسی شدید ردّ و کدّ کے مدینہ میں دعوتِ اسلام پھیلنی شروع ہو گئی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ مدینہ منورہ میں اسلام کے پیغام کی اشاعت کے لئے فضا کو سازگار بنانے میں یہود کے ایک اعتقادی نعرے نے بڑا کام کیا، یہ لوگ مدینہ کے بت پرستوں اوس و

خزرج) سے یہ کہا کرتے تھے کہ بہت جلد ایک نبی آنے والا ہے، جس کی رہنمائی میں ہم لوگ تم پر غلبہ حاصل کرلیں گے ظاہر ہے کہ اس نبی کی آمد کا مدینہ کے گھر گھر میں چرچا ہوگا، تب ہی تو یہ ہوا کہ جیسے ہی ان کے کانوں میں ایک نبی کی آواز پہنچی تو انھوں نے اس کو تسلیم کرنے میں پہل کی اور بد قسمت یہود پیچھے رہ گئے۔

بیعتِ عقبۂ اولیٰ:

ایک سال تک مدینہ منورہ میں ان چھ بزرگوں کے ذریعہ اسلام کی روشنی پہنچی لیکن یہ روشنی محدود رہی، اگلے سال یعنی نبوت کے بارہویں سال حج کے موسم میں بارہ آدمیوں کا ایک قافلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور اس نے اسلام قبول کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سال دعوت کے کام کو اور آگے بڑھایا اور دو داعیانِ حق (عبداللہ بن ام مکتوم اور مصعب بن عمیر) کو اس قافلہ کے ہمراہ مدینہ بھیجا تاکہ یہ حضرات وہاں بیٹھ کر تعلیم و دعوت کا کام کریں۔

اس وفد سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جن باتوں پر بیعت لی وہ انفرادی نیکیوں سے متعلق تھی اس وفد نے واپس جاکر اور ان کے ساتھ داعیانِ حق نے مدینہ میں کام شروع کیا اور اب مدینہ کے بڑے لوگوں میں اسلام کی روشنی پہنچی اور دعوتِ اسلام کا کام کافی آگے بڑھا۔ اسلام قبول کرنے والے سرداروں میں اسید بن حضیر اور سعد بن معاذ جیسے صاحب اثر لوگ شامل تھے، جن کے مسلمان ہوجانے سے مدینہ میں اسلام سورج کی روشنی کی طرح پھیلنے لگا۔

جابر بن عبداللہ رضؓ مدینہ میں اسلام پھیلنے کی تیز رفتاری کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں ایک شخص گھر سے نکلتا تھا، باہر آکر وہ قرآنِ کریم سنتا اور اس کی روح بے خود ہوجاتی اور وہ اسلام قبول کرلیتا، پھر وہ اپنے گھر لوٹتا اور سارے گھر والے اسلام قبول کرلیتے اس طرح چند ہی دن میں گھر گھر اسلام کا چرچا ہونے لگا اور کوئی گھر ایسا نہ رہا جس میں اسلام قبول کرنے والوں کی اچھی خاصی تعداد نہ ہو (ابن ہشام جلد ۲، ص ۴۳۵)

بیعتِ عقبہ ثانیہ :

نبوت کے تیرہویں سال پھر مدینہ کے باثر لوگوں کا ایک وفد حج ہی کے موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا اور اسلام قبول کرنے کی درخواست کی اور آپؐ نے اسے قبول فرمایا اور یہ لوگ مسلمان ہو گئے۔

دو سال کی مدت میں مدینہ منورہ میں اسلام کی بنیادیں مضبوط ہو چکی تھیں اور اب مدینہ اپنے آپؐ کو دعوتِ حق کا مرکز بنانے کے لئے تیار تھا۔ مدینہ میں دعوتِ حق کی رفتار اور اس کے اثرات پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی گہری نظر تھی اور آپؐ حالات سے واقف تھے چنانچہ آپؐ نے دیکھا کہ اس وفد نے مجھے مدینہ چلنے کی دعوت دی ہے اور خدا تعالیٰ اب مکہ معظمہ کے تنگ و تاریک ماحول سے اسلام کو نکال کر مدینہ منورہ کی سازگار فضا میں لے جانا چاہتا ہے تو آپؐ نے اس وفد سے کھل کر بات چیت کی۔

اس موقعہ پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ بھی آپؐ کے ساتھ تھے یہ ابھی تک باقاعدہ مسلمان نہیں ہوئے تھے لیکن ان کے دل میں اپنے بھتیجے رسولِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت جاگزیں تھی، انھوں نے وفد مدینہ سے صاف صاف کہا۔

اے خزرج کے لوگو! محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خاندان میں سب سے زیادہ عزت والے ہیں مکہ کے جو لوگ ان پر ایمان لا چکے ہیں وہ تو ان کی حمایت کرتے ہیں، لیکن جو لوگ ایمان نہیں لائے ہیں وہ خاندانی تعلق کی وجہ سے ان کے لئے سینہ سپر رہتے ہیں۔

تم نے انھیں ساتھ لے جانے کی دعوت دی ہے مگر سمجھ لو! اگر تم میں سارے عرب سے دشمنی مول لینے اور مقابلہ کرنے کی طاقت ہے تب انھیں ہجرت کی دعوت دو۔

وفد میں سے مختلف لوگوں نے ہر ممکن مدد کرنے کا یقین دلایا اور اس کا اقرار کیا کہ ہم اس عہد و پیمان کے انجام کو اچھی طرح سمجھ کر آپ سے وعدہ کر رہے ہیں کہ آپؐ کی ہر طرح اعانت کریں گے ——— ادھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ داعی حضرت مصعبؓ آپؐ کے سامنے مدینہ

میں اسلام کی اشاعت کے حالات رکھ چکے تھے اور ایک سال کی رپورٹ آپؐ کو سُنا چکے تھے۔

ان حالات میں آپؐ نے محسوس کیا کہ خدائے برحق نے مدینہ کی سرزمین کو اسلام کے حق میں سازگار بنادیا ہے اور اب وقت آگیا ہے کہ اس وفد کی "دعوت ہجرت" کو منظور کیا جائے چنانچہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وفد سے اجتماعیت اور مرکزیت کی پابندی کرنے کا عہد و پیمان لیا۔

حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے شرح بخاری جلد اص ۱۴۰ پر اس مسئلہ کی وضاحت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفقاء سے ضرورت اور موقعہ کے لحاظ سے بیعت لیتے تھے اور عہد و میثاق کی تجدید اور تاکید فرماتے تھے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے عقبۂ ثانیہ کی بیعت کے متعلق لکھا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دور اندیش مدبر کی طرح مدینہ کے اس وفد سے عہد و پیمان لیا اور ہجرت کے بعد قریش مکہ کے ساتھ جو لمبی آویزش ہونے والی تھی اس کو نظر میں رکھ کر ان لوگوں سے بحیثیت امیر کے ہر حال میں فرمانبرداری اور اطاعت کا اقرار لیا۔

پہلی بیعت میں صرف انفرادی اخلاقی پابندی کا عہد لیا تھا کہ ہم چوری، بدکاری، قتل و غارت، بہتان تراشی نہیں کریں گے اور اس مرتبہ یہ اقرار لیا کہ ہم تنگی ترشی، آرام و راحت اور ہر بُرے بھلے وقت میں آپؐ کی اطاعت پر قائم رہیں گے اور ہم حق کی راہ میں کسی ملامت کرنیوالے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے، اور جس طرح اپنی جان، مال اور بال بچوں کی حفاظت کرتے ہیں اسی طرح اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لئے تیار رہیں گے (محمدؐ و بنو اسرائیل ص ۳۲)

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وفد کو نہ صرف مرکزیت کی پابندی اور حفاظت کے لئے تیار کیا بلکہ عملی طور پر اجتماعی نظم کی بنیاد بھی رکھ دی اور اس وفد میں سے ۱۲، آدمیوں کو "نقیب و نگران" بھی مقرر کر دیا جن کے ذمہ یہ کام کیا گیا کہ تم لوگ مسلمانانِ مدینہ کے تمام معاملات کی دیکھ بھال کرنا ——— یہ بارہ نقیب گویا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب تھے۔

ہجرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

اہلِ مکہ یثرب میں اسلام کی روشنی پھیلنے اور اسلامی دعوت کے لئے ایک نئے مرکز کے قیام کی خبروں سے، ظاہر ہے کہ سخت پریشان ہوئے ہوں گے۔ انھوں نے سمجھ لیا ہوگا کہ اگر مدینہ میں دعوتِ حق کے قدم جم جائیں گے تو اسلام کا پیغام ایک زندہ قوت بن جائے گا اور پھر اس کے بعد سرزمینِ مکہ بھی زیادہ دیر تک اس پیغامِ حق کے مقابلہ میں کھڑے ہونے کی تاب نہیں لائے گی۔

مدینہ میں رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے قدم جم جانے سے قریشِ مکہ کے سامنے یہ خطرہ بھی یقیناً آیا ہوگا کہ شام کی تجارتی شاہراہ چونکہ مدینہ سے ہو کر گذرتی ہے اس لئے مدینہ کا نیا اسلامی مرکز اس شاہراہ کی ناکہ بندی کر کے ہم قریش کو مخالفانہ سرگرمیوں سے باز رکھنے کی کوشش بھی کر سکتا ہے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا، قریشِ مکہ یثرب والوں کا تو کیا بگاڑ سکتے تھے انھوں نے مسلمانوں پر اور زیادہ ظلم و ستم شروع کر دیا۔

واقعات اپنی قدرتی رفتار کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے، قریشِ مکہ کے ظلم و ستم سے مجبور مسلمانوں کو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نئے مرکز کی طرف روانہ فرماتے رہے، قریش ان مظلوموں کو روکتے مگر مسلمان اپنے آقا کے حکم پر مدینہ کی جانب ہجرت کرنے سے باز نہیں آتے۔

اُدھر مہاجرین کی تعداد جوں جوں بڑھتی جاتی، دعوتِ حق کا قافلہ طاقتور ہوتا جاتا اور اسلام کی روشنی زیادہ ہوتی جاتی۔

اب مکہ میں صرف سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے چند رفیق باقی رہ گئے۔

اللہ کے رسول کو آخر وقت تک پیغمبرانہ استقلال کا مظاہرہ کرنا تھا، اتمامِ حجت میں جو کسر باقی رہ گئی تھی اسے پورا کرنا تھا، چنانچہ مشیتِ الٰہی کے راز دار مشیتِ الٰہی کے کھیل کو تکمیل

تک پہنچانے کے لئے اس وقت تک مکہ میں رہے جس وقت تک اہل مکہ نے آپ کے قتل کا فیصلہ نہ کر لیا ——— سورۂ مریم میں حق تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی نازل ہو چکا تھا:

اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ۙ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ۚ (مریم: ۸۴،۸۵) ——— "کیا تم نے غور نہیں کیا کہ ہم شیطانوں کو منکروں پر چھوڑ دیتے ہیں، وہ انھیں بھڑکاتے ہیں خوب، پس تم ان کے لئے جلد بازی سے کام نہ لو ہم ان کو اچھی طرح شمار کر رہے ہیں۔"

شیاطین منکروں کو خوب بھڑکا چکے، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ حق نے صبر و استقلال کا ثبوت بھی بہم پہنچا دیا، خدا تعالیٰ نے مظلوموں کے صبر اور ظالموں کے ظلم کی گنتی بھی پوری کر لی اور ظلم اپنی آخری سرکشی پر اُتر آیا اور داعی حق کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز
آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

بس جس رات داعیِ حق کو قتل کرنے کا فیصلہ ہوا خدا تعالیٰ نے اسی رات اپنے محبوب کو مکہ معظمہ سے ہجرت کرنے کا حکم دے دیا۔

دعوتِ حق کی اس منزل پر بھی تقدیر اور تدبیر دونوں ساتھ کام کر رہی تھیں، خدا کی غیبی رہنمائی بھی تھی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی تدبر بھی تھا۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک رفیقِ خاص حضرت ابوبکر رضؓ کو ساتھ لیا اور دوسرے رفیقِ خاص حضرت علی رضؓ کو اپنے بستر پہ سونے کی ہدایت فرمائی۔

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کی یہ منزل نہایت تدبر، احتیاط اور ہر قسم کی مکمل تیاری کے ساتھ طے فرمائی ——— امام بخاریؒ نے باب الہجرۃ میں اس واقعہ کی جو مستند روداد نقل کی ہے وہ یہ ہے کہ ادھر قریش نے آپؐ کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا، ادھر خدا تعالیٰ کی طرف سے ہجرت کرنے کا حکم ملا۔

حکم الٰہی پاکر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے حضرت ابوبکر رضؓ کے مکان پر پہنچے، دوپہر کا وقت تھا، دھوپ سے بچنے کے لئے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سر پر کپڑا ڈال رکھا تھا، حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے بے وقت گرمی کی شدت میں تشریف لانے کی وجہ پوچھی، آپؐ نے فرمایا مجھے تنہائی میں کچھ بات کرنی ہے، صدیق اکبر رضؓ نے عرض کیا، یہاں صرف آپؐ کی حرم (عائشہ رضؓ کے سوا کوئی نہیں، پھر فرمایا، مجھے ہجرت کی اجازت ہوگئی۔ ابوبکر رضؓ بولے میرے ماں باپ قربان ہوں کیا مجھے بھی رفاقت کا شرف حاصل ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا۔ ہاں! ——— سفر کی تیاری کچھ پہلے سے تھی۔ ابوبکر صدیق رضؓ نے دو اونٹنیاں اسی مقصد کے لئے پال رکھی تھیں، باقی انتظام اسی وقت کیا گیا ——— صدیق اکبر رضؓ کے گھر والوں نے اس انتظام میں بھرپور حصہ لیا ———

ابوبکر صدیق رضؓ کو اطلاع دے کر سرکار دولت خانہ پر واپس تشریف لائے اور حضرت علی رضؓ کو بھی اپنے ارادہ سے آگاہ فرمایا اور انھیں ہدایت فرمائی، تم میری چادر اوڑھ کر میرے بستر پر سو جانا ——— اور میرے بعد لوگوں کی امانتیں واپس کر دینا۔

یہ انتظام اس لئے کیا گیا، تاکہ قریش مکہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چلے جانے کا جلدی علم نہ ہو اور وہ کچھ دیر مغالطہ میں رہیں یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفیق سفر کے ساتھ قریش مکہ کے پنجۂ ظلم سے نکل جائیں۔ دوسرا سبب یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مکہ والوں کی جو امانتیں رکھی ہوئی تھیں، وہ امانتیں حضرت علی رضؓ واپس کر دیں اور ان نازک حالات میں بھی کسی شخص کو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی امانت پر انگلی اٹھانے کا موقعہ نہ ملے۔

تجویز کے مطابق قریش کے سورماؤں نے کاشانۂ نبوت کا محاصرہ کر لیا، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم رات کے کسی حصّہ میں گھر سے نکلے، قدرت نے اُن پر غفلت طاری کر دی، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ان کے نرغہ سے صاف نکل گئے۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق حضرت ابوبکر رضؓ اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم غار ثور میں پہنچے اور وہاں پناہ گزیں ہوگئے، یہ غار مکہ سے تین میل داہنی جانب ہے اور مدینہ کی سمت سے مختلف

یہ غار ایک میل بلند چوٹی پر ہے جس کا راستہ آج بھی بیحد پرخطر ہے اور اس پر چڑھنا کوئی آسان کام نہیں ہے ـــــــ اس غار میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن قیام فرمایا، اس مدت میں کھانے پینے کا سامان اور مکہ کی خبریں پہنچانے کا کام حضرت ابوبکر رضؓ کے صاحبزادے عبداللہ رضؓ ان کے غلام عامر بن فہیرہ اور ان کی صاحبزادی حضرت اسماءؓ انجام دیتی تھیں۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بخوبی اندازہ تھا کہ ان کے دشمن نہایت چالاک اور ہوشیار ہیں، اس لیے آپؐ نے نہایت دانش مندی سے مدینہ کے راستے سے ہٹ کر انتہائی پرخطر مقام غارِ ثور میں پناہ لی، مگر اس کے باوجود قریش کے قیافہ شناسوں نے نشاناتِ قدم کی مدد سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے پناہ کی کھوج لگالی اور غارِ ثور کے دہانے پر پہنچ گئے۔

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک پیغمبر کا حوصلہ اور ایک رسول کا عزم و استقلال رکھتے تھے، مگر صدیق اکبر رضؓ کو وہ مقام کہاں حاصل تھا، صدیق اکبر رضؓ قریش کے آدمیوں کے قدموں کی آہٹ سن کر گھبرا گئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی گھبراہٹ دیکھ کر نہایت صبر و سکون کے ساتھ فرمایا: ـــــــ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ـــــــ "غم نہ کرو خدا تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے"۔

قریش کے خبر رساں غار کے دہانے پر کھڑے تھے، مگر قدرتِ الٰہی نے ان کی سمجھ کو ماؤف کر دیا تھا، یہ لوگ یہ تو کہتے رہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے رفیق یہاں تک آئے ہیں، مگر سمجھ نے آگے کام نہیں کیا اور غار کے اندر داخل ہونے کی جرأت نہ کر سکے۔

ہو سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے غار پر کچھ ایسے انتظامات کر دیئے گئے ہوں کہ انھیں ان دونوں حضرات کے غار میں داخل ہونے کا یقین نہ ہوا ہو، جیسا کہ بعض مؤرخین نے مکڑی کے جالے اور کبوتر کے گھونسلے کی روایات نقل کی ہیں۔

مگر ان ظاہری انتظامات کے علاوہ بھی ممکن تھا کہ دشمنوں نے غار کے منہ پر پہنچ کر ہمت ہار دی ہو اور ان کی عقلیں وہاں جا کر گم ہو گئی ہوں، کیونکہ نصرت الٰہی اپنے ان مسافروں کی حفاظت کے لئے ان کے ہمراہ تھی، دیکھو! اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کتنا یقین افروز جملہ فرما رہے

تھے ـــــ ماظنك باثنين، الله ثالثهما ـــــ "ابوبکرؓ! تمہارا ان دو آدمیوں کے بارے میں کیا خیال ہے جن میں تیسرا "اللہ" ہے"۔

بہرحال چوتھے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم غار سے نکلے اور غیر مسلم عبداللہ بن ارنقیط کو راستہ بتانے کے لئے ساتھ لیا، یہ شخص راستہ کا ماہر تھا اور بھروسہ کا آدمی تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اجرت پر رکھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کمزور ارادہ کے انسان کی طرح عبداللہ کے بارے میں بدگمانی نہیں فرمائی، آپؐ عربوں کے کیرکٹر سے واقف تھے کہ یہ لوگ جب کسی بات کا عہد کر لیتے ہیں تو اس پر قائم رہتے ہیں، اعتماد کو مجروح نہیں کرتے۔

آپؐ کی اسی حقیقت پسندی نے رہنمائی کے لئے ایک اہل انسان کو اپنے ساتھ لیا، اور یہ بدگمانی نہ کی کہ کہیں یہ شخص اپنے ہم مذہب قریش مکہ سے ہماری جاسوسی نہ کر دے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چالاک دشمنوں کے پنجۂ ظلم سے بچنے کے لئے کس قدر تدبر، ہوشیاری اور ظاہری اسباب کے مکمل انتظام کے ساتھ ہجرت فرمائی، صرف غیبی امداد کا انتظار نہیں فرمایا، اگرچہ قدم قدم پر غیبی نصرت بھی ساتھ رہی، مگر آپؐ نے اپنی طرف سے تدبیرِ ظاہری میں کوئی کمی نہیں فرمائی۔

ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں تقریریں

مکہ معظمہ چھوڑ کر رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ کی نئی بستی میں تشریف لائے تو آپؐ نے وہاں کے باشندوں کے سامنے چند تقریریں فرمائیں۔

ان تقریروں کے ایک ایک لفظ پر غور کیجئے، جن لوگوں نے ظلم و ستم کر کے وطن سے نکالا تھا، ان کے خلاف ایک لفظ آپؐ کی زبان پر نہیں آتا، ظالموں کے ظلم کی شکایت نہیں کی جاتی، غم و غصہ کا اظہار نہیں ہوتا، ستم پیشہ قریش کے خلاف اشتعال انگیزی نہیں کی جاتی۔

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت اگر سیاسی فتوحات اور فوجی اقدامات ہوتے تو آپؐ کی تقریروں کا رنگ دوسرا ہوتا، آپؐ مدینہ میں آتے ہی قریش مکہ کے خلاف فضا ہموار کرنی شروع کر دیتے، مدینہ کے عوام کو سیاسی اقتدار حاصل کرنے کا شوق دلاتے اور مکہ معظمہ کو فتح کرنے کی ترغیب دیتے، لیکن آپؐ کی ان تقریروں میں سیاسی رنگ کے بجائے آپؐ کے مشن (دعوت الی اللہ) کا پورا پورا رنگ نظر آتا ہے۔

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے قبا کی بستی میں چند روز قیام فرمایا، پھر جمعہ کے دن قبا سے روانہ ہوئے اور بنی سالم بن عوف کے قبیلہ کے میدان (وادی رانوناء) میں جمعہ کی نماز ادا فرمائی (البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۲۱۲)

ان مقامات پر آپؐ نے جو تقریریں فرمائیں مورخین نے اُن کو جمع کیا ہے دو تقریریں ابن اسحاق نے نقل کی ہیں۔ ان کا ترجمہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

(۱)

ایہا الناس۔ (اے لوگو) خوب سمجھ لو۔ کچھ پہلے سے بھیج دو جو خود تمہارے کام آئے گا۔ خدا کی قسم! یقیناً ایسا ہوگا کہ ہر شخص پر (قیامت کی) بے ہوشی طاری ہوگی جس کے پاس جو کچھ ہے یہیں رہ جائے گا، بکریوں والا بکریاں چھوڑ جائے گا، اُن

کا کوئی گلہ بان نہ ہوگا۔ وہ اپنے رب کے سامنے کھڑا ہوگا یقیناً ایسا ہوگا کہ اس کا پروردگار براہِ راست اس سے خطاب فرمائے گا، نہ کوئی بیچ میں ترجمان ہوگا نہ کوئی رکاوٹ کی چیز درمیان میں حائل ہوگی (جو اس کے لئے آڑ بن سکے) اُس کا پروردگار کہے گا۔ کیا میرے رسول نے تمہارے پاس پہنچ کر تبلیغ نہیں کی تھی! کیا یہ تمام باتیں تمھیں نہیں بتادی تھیں۔ کیا میں نے تجھ کو مال نہیں دیا تھا۔ کیا تیرے اوپر میں نے اپنا فضل نہیں کیا تھا۔ پس بتا تو خود اپنے لئے کیا لے کر آیا ہے۔ یہ شخص اپنے دائیں دیکھے گا اپنے بائیں دیکھے گا، اس کی دولت کا کہیں نام ونشان نہ ہوگا۔ وہ آگے کی طرف نظر ڈالے گا۔ وہاں دہکتی ہوئی جہنّم کے سوا کچھ نظر نہ آئے گا۔ پس دیکھو دوزخ کی آگ سے اپنے آپ کو بچاؤ جو کچھ امکان میں ہو خرچ کرو اور اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔

کچھ نہ ہو چھوارے کا ایک ریزہ ہو

وہی خرچ کرو۔ جس کے پاس یہ بھی نہ ہو وہ میٹھے بول۔ اچھی بات سے غریبوں کی دل داری کرے۔ اس کا بھی اس کو ثواب ملے گا۔ نیکی کا ثواب دس گُنے سے شروع ہوتا ہے اور سات سو گُنے تک پہنچتا ہے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

(۲)

بے شک تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ میں اس کی حمد کرتا ہوں اس سے مدد مانگتا ہوں، ہم اپنے نفسوں کی شرارت سے اور اپنے اعمال بد کے شر سے خدا کی پناہ لیتے ہیں۔ جس پر اللہ تعالیٰ ہدایت کے راستے کھول دے، پھر کوئی اس کو گمراہ نہیں کرسکتا اور جس کو بھٹکا دے تو کوئی نہیں ہے جو اس کو سیدھی راہ پر لگا سکے۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، وہ تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے، وہ اکیلا ہے اس کا کوئی ساجھی نہیں ہے بے شک سب سے

اچھا کلام کتاب اللہ ہے۔ یقیناً وہ شخص کامیاب ہے جس کے دل میں اللہ تعالیٰ اپنے کلام کو سجا دے اور جس کو اللہ تعالیٰ کفر سے ہٹا کر اسلام میں داخل کر دے یقیناً وہ شخص کامیاب ہے، جس نے انسانوں کے کلام اور اُن کے قصّوں کے مقابلے میں اللہ کے کلام کو منتخب کیا ہو۔ کیونکہ کلام اللہ ہی سب سے بہتر بات ہے سب سے بہتر کلام اور سب سے بلیغ قصّہ ہے۔

(دیکھو) اس سے محبت کرو، جو اللہ سے محبت کرتا ہے (دیکھو) خدا سے محبت کرو دل کی گہرائی سے اپنے دلوں کو اسی میں لگا دو۔ اللہ کے کلام اور اللہ کے ذکر سے نہ اکتاؤ۔ تمہارے دلوں میں یہ سختی ہرگز نہ ہو کہ تم اس کی یاد سے غافل ہو جاؤ (یاد رکھو اور سمجھ لو) اللہ تعالیٰ جو مخلوق پیدا کرتا ہے اس میں سے کچھ کو منتخب کر کے اپنے لئے مخصوص کر لیتا ہے جو اعمال اس کو پسند ہیں جن بندوں کو وہ پسند کرتا ہے جو بات اس کو پسند ہے۔ اُس نے نام لے کر ان کو بتا دیا ہے اور معین کر دیا ہے (تم بھی اس کو پسند کرو) اُس نے حلال و حرام کو کھول کر بتا دیا ہے، بس اللہ کی عبادت کرو۔ کسی کو اس کا شریک نہ گردانو۔ پورا پورا تقویٰ کرو۔ تمہاری زبان سے جو باتیں نکلتی ہیں ان میں یہ خوبی پیدا کرو کہ اُن سے اللہ تعالیٰ کی تصدیق ہو۔ وہ اس کی مرضی کے مطابق ہوں۔ اللہ کی بھیجی ہوئی رُوح (ذاتِ اقدس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے درمیان ہے، اُس سے پوری پوری محبت کرو۔ تمہاری فطرت اپنے رب سے ایک عہد کئے ہوئے ہے (کہ رب وہی ہے اُس کے سوا کوئی رب نہیں ہے) اس عہد کو پورا کرو۔ اللہ تعالیٰ کا غضب اس پر نازل ہوتا ہے کہ اُس عہد و پیمان کو توڑا جائے جو فطرتِ انسان اپنے رب سے کئے ہوئے ہے

(سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۳۰۰)

مدینہ طیبہ میں سب سے پہلا خطبہ جمعہ

حافظ عماد الدین بن کثیر رحمہ اللہ نے ابن جریر کے حوالے سے وہ پورا خطبہ نقل کیا ہے جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی سالم بن عمرو بن عوف میں نماز جمعہ کے وقت ارشاد فرمایا تھا۔ ہم اس خطبہ کو تبرکاً پورا نقل کرتے ہیں اس کے بعد ترجمہ و مفہوم بھی بیان کر دیا گیا ہے ائمہ صاحبان جمعہ کے روز یہ خطبہ پڑھیں تو نورٌ علی نور و سعادت بالا سعادت کا مصداق ہو۔

خطبۃ التقویٰ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، اَحْمَدُہٗ وَاَسْتَعِیْنُہٗ وَاَسْتَغْفِرُہٗ وَاَسْتَھْدِیْہِ وَاُوْمِنُ بِہٖ وَلَا اَکْفُرُہٗ۔ واعادی من یکفرہ واشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ وان محمدا عبدہٗ ورسولہ ارسلہ بالھدی والنور والموعظۃ علی فترۃ من الرسل وقلۃ من العلم وضلالۃ من الناس وانقطاع من الزمان دنو من الساعۃ وقرب من الاجل۔ من یطع اللّٰہ ورسولہ فقد رشد ومن یعصھما فقد غوٰی وفرط وضل ضلالا بعیدا۔ واوصیکم بتقوی اللّٰہ فانہ خیر ما اوصٰی بہ المسلم المسلم ان یحضہ علی الاٰخرۃ وان یامرہ بتقوی اللّٰہ فاحذروا ما حذّرکم اللّٰہ من نفسہ ولا افضلُ من ذٰلک نصیحۃً ولا افضلَ من ذٰلک ذکری وانّ تقوی اللّٰہ لمن عمل بہ علی وجلٍ ومخافۃ من ربہ عون صدق علی ما تبتغون من امر الاٰخرۃ ومن یصلح الذی بینہ وبین اللّٰہ من امرہ فی السر والعلانیۃ لا ینوی بذٰلک الا وجہ اللّٰہ یکن لہ ذکرًا فی عاجل امرہ وذخرًا فیما بعد الموت حین یفتقر المرء الی ما قدم وما کان من سوی ذٰلک یود لو انّ بینہ وبینہ امدا بعیدًا۔ ویحذرکم اللّٰہ نفسہ واللّٰہ رؤف بالعباد و

الذی صدق قولہ وانجز وعدہ لا خلف لذلک فانہ یقول عزوجل ما یبدل القول لدی وما انا بظلام للعبید فاتقوا اللہ فی عاجل امرکم واٰجلہ فی السر والعلانیۃ فانہ من یتق اللہ یکفر عنہ سیاتہ ویعظم لہٗ اجرا ومن یتق اللہ فقد فاز فوزا عظیما وان علام تقوی اللہ توقی مقتہ ویوقی عقوبتہ ویوقی سخطہ وان تقوی اللہ یبیض الوجوہ ویرضی الرب ویرفع الدرجۃ۔ خذوا بحظکم ولا تفرطوا فی جنب اللہ قد علمکم اللہ کتابہ ونھج لکم سبیلہ لیعلم الذین صدقوا ویعلم الکاذبین فاحسنوا کما احسن اللہ الیکم وعادوا اعداءہ وجاھدوا فی اللہ حق جہادہ ھو اجتباکم وسماکم المسلمین لیھلک من ھلک عن بینۃ ولا قوۃ الا باللہ فاکثروا ذکر اللہ واعملوا لما بعد الموت فانہ من اصلح ما بینہ وبین اللہ یکفہ اللہ ما بینہ وبین الناس ذٰلک بان یقضی علی الناس ولا یقضون علیہ ویملک من الناس ولا یملکون منہ اللہ اکبر ولا قوۃ الا باللہ العظیم:

(تاریخ طبری ج ۲ ص ۲۵۵ والبدایہ والنہایہ ج۳ ص ۲۱۳)

ترجمہ: میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہوں اس سے مدد کی درخواست کرتا ہوں گناہوں کی مغفرت چاہتا ہوں اور نیک ہدایت کی التجا کرتا ہوں۔ میں اس پر ایمان لاتا ہوں۔ میں اس ذاتِ برحق کا منکر نہیں ہوں۔ میں اس کا دشمن ہوں جو اس ذاتِ برحق کا انکار کرے۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے بندے اور اُس کے رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دینِ حق نورِ کامل اور پند ونصیحت اور حکمت و دانش کی نعمتیں سپرد کر کے ایسے وقت مبعوث فرمایا کہ صدیاں گذر گئیں تھیں۔ سلسلہ رسالت منقطع ہو چکا تھا، علم ہولی

ناپید اور مفقود تھا۔ گمراہی کی گرم بازاری تھی۔ نورِ ہدایت پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ (دوسری طرف حالت یہ ہے) کہ یہ دنیا جس کو زمانہ کہتے ہیں اس کا سلسلہ ازل سے چل رہا ہے، اب ٹوٹنے کے قریب ہے، قیامت سر پر ہے اور اس عالم کی آخری میعاد ختم ہو رہی ہے (اب اللہ تعالیٰ کا کوئی اور پیغام آنے والا نہیں ہے) اب جس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کی اس نے ہدایت اور کامیابی حاصل کر لی اور جو اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت سے روگردانی کر رہا ہے وہ گمراہ ہے اپنا فرض ادا کرنے میں حد سے زیادہ کوتاہی کر رہا ہے اور صحیح راستہ سے بہت دور بھٹک رہا ہے۔

اے لوگو! میں تمھیں اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کرنے کی وصیت کرتا ہوں اور دیکھو سب سے بہتر نصیحت جو ایک مسلمان دوسرے کو کرے یہی ہے کہ اُس کو آخرت پر آمادہ کرے (یعنی ایسے کاموں کا شوق دلائے جو مرنے کے بعد کارآمد ہوں) اور یہ کہ خدا ترسی کی ہدایت کرتا رہے اور تاکید کرتا رہے کہ پرہیزگاری اور پارسائی کی زندگی اختیار کریں۔

اے لوگو! ان باتوں سے پرہیز کرو جن سے بچنا اور پرہیز کرنا اتنا ضروری ہے کہ خود اللہ تعالیٰ جلّ مجدہٗ نے ان سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ اس سے افضل کوئی نصیحت ہو سکتی ہے اور نہ کوئی تذکیر اور یاددہانی، اس سے زیادہ ضروری اور مفید ہو سکتی ہے۔

دیکھو! اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کرنا اور اس طرح تقویٰ کرنا کہ دل لرز رہا ہو اور خوفِ خدا ذہن و دماغ پر چھایا ہوا ہو۔ یہ تقویٰ ایک عمل کرنے والے کے لئے بہت بڑا معاون اور مددگار اور نہایت مخلص رفیق ہے۔

اور جو شخص ظاہر و باطن میں اپنا معاملہ اللہ سے درست کر لے جس سے مقصود محض رضاء خداوندی ہو۔ کوئی دنیاوی غرض اور مصلحت پیشِ نظر نہ ہو تو یہ ظاہر و باطن کی مخلصانہ اصلاح

دنیا میں اس کے لئے باعزت یادگار اور مابعد الموت کے لئے بہترین ذخیرہ ہے جس وقت انسان ان اعمال کا سب سے زیادہ ضرورت مند ہوگا جو اس نے پہلے سے بھیجے ہوں (دیکھو) خدا ترسی اور ظاہر و باطن کی اصلاح کی کوشش کارآمد چیزیں یہی ہیں جو مرنے کے بعد انسان کی بہترین رفیق ہوں گی) ان کے علاوہ جو بھی ہے وہ انسان کے لئے یہاں تک بے کار رہے کہ قیامت کے روز انسان تمنا کرے گا کہ کاش! اس عمل کے اور میرے درمیان مدّتِ دراز کی مسافت ہوتی۔

یاد رکھو۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے اس کی بے انتہا مہربانی اور اُس کے بے پایاں رحم و کرم ہی کا تقاضا ہے کہ وہ خود اپنی ذات کا تم کو خوف دلا رہا ہے (کہ تم غافل۔ لااُبالی۔ نفس پرست نہ ہو کہ اللہ کے عذاب کے مستحق ہو جاؤ کہ اللہ کا عذاب بہت سخت ہوتا ہے۔ اس کی طاقت بھی بے پایاں ہے۔ جس کو عذاب دینا چاہے تو کوئی نہیں جو اس کے عذاب کو روک سکے)۔

اللہ تعالیٰ کی ذات وُہ ہے کہ اس کا قول حق ہے جو کچھ کہتا ہے سچ کہتا ہے، جو وعدہ کرتا ہے پورا کرتا ہے، اس میں خلاف نہیں ہوتا۔ اس کا ارشاد ہے کہ اس کی بات پلٹی نہیں جاتی اور وہ بندوں پر ظلم بھی نہیں کرتا۔

پھر وہی بات ہے۔ اللہ سے تقوٰی کرو۔ موجودہ وقت اور حالت میں بھی اور مستقبل میں بھی۔ پوشیدہ بھی اور علانیہ بھی، جو اللہ تعالیٰ سے تقوٰی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کا کفارہ فرماتا ہے اور اُس کے اجر کو بڑھاتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے تقوٰی کرے وہ کامیاب ہے، پورا پورا کامیاب۔ بہت بڑی کامیابی کے ساتھ کامیاب غرض یہ ہے کہ بہر صورت خوفِ خدا کو سامنے رکھو۔ خوفِ خدا وہ اکسیر ہے جو کہ عذابِ خدا سے بچاتا ہے اُس کی سزا اور اس کی ناراضگی سے محفوظ رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے تقوٰی کرنا اور خوفِ خدا کو سامنے رکھنا وہ تریاق ہے جو چہرہ کو روشن کر دیتا ہے، رب کو راضی کرتا ہے اور درجہ کو بلند کرتا ہے۔ پس جہاں تک ممکن ہو تقوٰی کا حصّہ

پُورا پُورا حاصل کرو۔ اور دیکھو بارگاہِ ربّ العزت کے حق میں کوتاہی مت کرو۔ اللہ تعالیٰ کے اس احسانِ عظیم کی قدر کرو کہ اُس نے اپنی کتاب میں تمھیں کامل و مکمل تعلیم دی ہے۔ تمھارے لئے واضح طور پر راستہ مقرر کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اس لئے کردیا کہ جھوٹے اور سچے کھل کر سامنے آجائیں۔ پس جس طرح اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان فرمایا ہے تم بھی احسان کرو۔ تمھارا احسان یہ ہے کہ خود اپنے افعال اور اعمال کو درست کرو۔ اللہ تعالیٰ کے دوستوں سے دوستی رکھو۔ اس کے دشمنوں کو اپنا دشمن جانو، اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں پرجوش اور سرگرم جدّوجہد پوری طرح کرتے رہو۔ وہی ربّ العزّت ہے وہی مولاء برحق ہے جس نے تمھیں اپنے دین کامل کے لئے منتخب فرمایا۔ تمھارا نام "مسلم" رکھا تاکہ جو برباد ہو تو اس حالت میں برباد ہو کہ کھلی ہوئی حجت اس کے سامنے ہو اُسکو یہ عذر نہ رہے کہ اُس کے سامنے بات واضح نہ ہو سکی اور جو زندہ رہے تو اس طرح زندہ رہے کہ اپنے زندہ رہنے کی دلیل اور حجّت اس کے پاس ہو وَلَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ ـــــ "اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر ہماری نہ کوئی فکری طاقت ہے نہ عملی قوت"۔

دیکھو! مختصر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرتے رہو۔ اور مابعد الموت کے لئے عمل کرتے رہو (اور پُوری طرح سمجھ لو) کہ جو بندہ اس رشتہ کو درست کر لیتا ہے جو اس کے اور اس کے پروردگار کے مابین ہے تو خود اللہ تعالیٰ ذمہ دار بن جاتا ہے کہ اُن معاملات کو درست کر دے جو اس بندے اور دوسرے انسانوں کے درمیان ہیں۔

(بات صاف ہے) اللہ تعالیٰ کی حکومت ہے۔ وہ انسانوں پر حکومت کرتا ہے اور انسانوں کے حق میں اپنے فیصلے نافذ کرتا ہے۔ انسان اپنے پروردگار کے مالک نہیں ہیں۔ نہ انھیں خالقِ ارض وسما کی کسی بات پر کوئی قابو ہے، کبریائی اور عظمت صرف اللہ کے لئے ہے۔ ہم میں نہ کوئی طاقت ہے نہ قوت ہے، جو کچھ قدرت و طاقت ہے وُہ خدا کی مہربانی اور اس کی مدد سے ہے جو بلند و بالا اور بہت بڑی شان والا ہے۔

مدینہ منورہ میں پہلی نصیحت:

قبا (قبیلہ بنی عمرو بن عوف) میں جو فقرے پہلی مرتبہ زبانِ مبارک سے صادر ہوئے وُہ یہ تھے۔

یَا یہا الناس ۔ افشوا السلام و اطعموا الطعام ۔ وصلوا والناس نیام ۔ تدخلوا الجنۃ بسلام (ترمذی شریف ج ۲ ص ۷) ——— "اے لوگو! اسلام کا رواج عام کرو، کھانا کھلاؤ اور اس وقت نماز پڑھو جب لوگ سو رہے ہوں، اطمینان سے جنت میں داخل ہو جاؤ۔"

یعنی سلامت روی۔ میل ملاپ۔ غریبوں کی مدد اور خدا کی عبادت کا حکم فرمایا۔

"اسلام" امن و سلامتی کا مشن:

"اسلام" درحقیقت امن و سلامتی کا مشن ہے، اسلام کے ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم اس مشن کے علم بردار تھے۔

اس لئے خدا تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت اور آپؐ کے مزاج ہی کو سلامتی اور صلح جوئی کے سانچے میں ڈھالا تھا ——— قرآن کریم نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی۔

وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (انفال: ۶۱) ——— "اگر وُہ لوگ صلح کے لئے آگے بڑھیں تو آپؐ بھی صلح کے لئے آگے بڑھئے اور خدا تعالیٰ پر بھروسہ کیجئے" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عمل کیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمانہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ پر امن پسندی کا رنگ اس قدر غالب تھا کہ آپؐ لوگوں کے ایسے نام بھی پسند نہیں کرتے تھے جن میں جنگ و حرب کا مفہوم ہوتا تھا، حضرت علی رضؓ نے اپنے پہلے لڑکے کا نام حرب رکھنا چاہا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پسند نہیں کیا اور اس کی جگہ "حسن" رکھا پھر حضرت علی رضؓ نے دُوسرے لڑکے کا نام بھی حرب رکھنا چاہا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے "حسین" رکھا۔ (منہاج السنۃ النبویہ لابن ابی تیمیہؒ)

ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی کا دودھ نکالنے کے لئے ایک صحابی کو بلایا ایک صاحب آئے، آپؐ نے ان کا نام پوچھا، انھوں نے جواب دیا "مُرَّۃ" یعنی کڑوا، آپؐ نے فرمایا تم بیٹھ جاؤ، پھر فرمایا، مَنْ یَحْلِبُ ؟ اس کا دودھ کون نکالتا ہے؟ پھر ایک صاحب کھڑے ہو گئے، آپؐ نے ان کا بھی نام پوچھا، وہ بولے "یعیش" —— آپؐ نے فرمایا اُحْلِب —— ہاں تم دودھ نکالو ——

ایک اور موقعہ پر ایک آدمی سے اس کا نام پوچھا، اس نے کہا "اصرم" یعنی فقیر آپؐ نے فرمایا —— بَلْ اَنْتَ زُرْعَۃ —— بلکہ تیرا نام کھیتی ہے۔ ایک اور صاحب سے نام پوچھا؛ انھوں نے کہا "حُزْن" آپؐ نے فرمایا بل انت سھل بلکہ تمھارا نام سہل یعنی آسانی ہے [1]

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ ذی قرد کے موقعہ پر ایک کنوئیں پر پہنچے، اور اس کا نام پوچھا، لوگوں نے بتایا بئسان یعنی کھاری، آپؐ نے فرمایا نہیں، بلکہ نعمان یعنی عمدہ، پھر صحابہ کرام رضؓ نے اس کا پانی نکالا تو واقعی میٹھا اور عمدہ تھا، اس کنوئیں کو حضرت طلحہ رضؓ نے خرید کر مسلمانوں کے لئے وقف کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوا تو آپؐ نے فرمایا ما انت یا طلحۃ الا فیاض "طلحۃ! تم بڑے فیاض ہو" —— اس وقت سے طلحہ "فیاض" کے نام سے مشہور ہو گئے [2]

حضورؐ ایک قبیلہ پر گذرے، پوچھا، تم کون لوگ ہو؟ انھوں نے کہا —— بنو غیّان —— غیّان کے معنی گمراہ کے ہیں، آپؐ نے فرمایا بل انتم بنو رشدان —— بلکہ تم ہدایت یافتہ لوگوں کی اولاد ہو۔ (الخصائص ج ۱ ص ۲۶۰)

آپؐ صحابہ کرام رضؓ کو ہدایت فرماتے تھے کہ لوگوں کے پاس ایسے آدمیوں کو قاصد بنا کر بھیجا کرو جو خوبصورت اور اچھے نام والے ہوں (حسن الوجہ حسن الاسم) [3]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اچھے نام سے نیک فال لیتے تھے، صلح حدیبیہ میں جب قریش کے سفیر سہیل بن کر آئے تو آپؐ نے فرمایا:

---

[1] تیسر الوصول ج ۱ ص ۳۸ [2] سیرۃ الجلیلہ ج ۳ ص ۳۷۷ [3] احیاء ج ۲ ص ۲۶۲

سهل لكم من امركم۔ (جامع الصغیر ج ا ص ۱۰) ——— "تمہارا کام آسان ہو گیا۔"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امن پسندی اور صلح جوئی کی ناقابلِ انکار شہادت آپؐ کی غزواتی زندگی ہے۔

قریش کے ظلم و تشدد نے جب رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو میدانِ جنگ میں نکلنے پر مجبور کر دیا تو اس وقت بھی آپؐ کی روش ایک جنگ جو اور انتقام پسند فوجی لیڈر کی نہیں رہی، بلکہ ایک امن پسند اور بلند اخلاق داعی حق کی رہی۔

امن و سلامتی، صلح جوئی، انسانیت نوازی کا یہ بنیادی اصول حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری غزواتی زندگی میں قدم قدم پر ہمارے سامنے آتا ہے۔

میدانِ جنگ کے اخلاقی اصول:

ذیل میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ضابطہ جنگ کی تشریح کی جاتی ہے، جس پر آپؐ خود بھی سختی سے عمل کرتے تھے اور اپنے رفقاء کو بھی اس پر کاربند رہنے کی تاکید فرماتے تھے۔

مقصدِ جہاد میں اخلاقی اصولوں کا احترام:

اوپر بتایا گیا ہے کہ اسلام کس مقصد کے لئے تلوار اُٹھانے کی اجازت دیتا ہے۔ کوئی جابر طاقت اسلامی دعوت و تبلیغ کے راستہ میں رکاوٹ ڈالے اور جو لوگ بلا کراہ و زبردستی کے اپنی مرضی سے اسلام کی راہِ نجات قبول کریں انھیں ظلم و ستم کا نشانہ بنائے یا کسی مسلمان بستی پر حملہ کرنے کی سازش کی جائے تو ان دونوں صورتوں میں دفاعی طور پر بھی اسلام کی طرف سے جہاد کرنے اور تلوار اُٹھانے کی اجازت بلکہ حکم دیا گیا ہے۔

اس پاک مقصد کے علاوہ، تاج و تخت کے حصول کے لئے، دولت اور مال اور شہرت و عزت کے لئے جنگ کرنا اسلامی جہاد نہیں، اس قسم کی لڑائیوں سے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بے تعلقی ظاہر فرمائی ہے اور مسلمانوں کو اس مجرمانہ خونریزی سے روکا ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضؓ کا بیان ہے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر

عرض کیا ـــــ فقال، الرجل یقاتل للمغنم والرجل یقاتل لیری مکانہ فمن فی سبیل اللّٰہ؟ قال من قاتل لتکون کلمۃ اللّٰہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللّٰہ ـــــ "اے اللہ کے رسول! کوئی شخص مالِ غنیمت کے لئے، کوئی شخص شہرت اور نام آوری کے لئے، کوئی شخص اپنی شجاعت کے جوہر دکھانے کے لئے لڑتا ہے، پس ان میں سے کون سی راہ خدا کی جنگ ہے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا، راہِ خدا کی لڑائی تو صرف وہ ہے جو اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے لڑی جاتی ہے۔"

اس مقصد کی روایات متعدد طریقوں سے تمام کبار محدثین امام بخاری، امام مسلم، ابوداؤد نے صحاح وسنن میں نقل کی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص محض کسی دنیوی اقتدار اور دولت وعزت کی خاطر تلوار اٹھاتا ہے وہ آخرت میں مجرم بن کر پیش ہوگا۔

یجیٔ الرجل اٰخذا بید الرجل فیقول ان ھذا قتلنی فیقول اللّٰہ لِمَ قتلتہٗ؟ فیقول لتکون العزۃ لفلان، فیقول انھا لیست لفلان فیبوء باثمہٖ ـــــ "مقتول اپنے قاتل کا ہاتھ پکڑ کر خدا کے سامنے لائے گا اور کہے گا اس نے مجھے قتل کیا تھا، خدا تعالیٰ سوال کرے گا تو نے اسے کیوں قتل کیا؟ وہ کہے گا تاکہ اقتدار فلاں شخص کو حاصل ہو جائے، خدا تعالیٰ فرمائے گا اقتدار اور عزت کا تو وہ شخص مستحق نہیں، پھر مقتول کے قتل کا جرم اس قاتل پر لوٹ جائے گا۔"

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں اس قاتل کی سزا یہ بیان کی گئی ہے۔

ولکنک قاتلت لیقال فلان جری فقد قیل ثم امر بہ فسحب علی وجھہٖ حتی القی فی النار ـــــ "حق تعالیٰ فرمائے گا، لیکن تم نے تو اس لئے تلوار اٹھائی کہ یہ کہا جائے فلاں شخص بڑا بہادر ہے پس وہ تو خوب کہا گیا پھر خدا تعالیٰ حکم دے گا اور اس قاتل اور نام نہاد مجاہد کو چہرے کے بل گھسیٹا جائے گا اور آگ میں ڈال دیا جائے گا۔"

ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو نصیحت فرمائی:

لا تتمنوا لقاء العدو وسلوا اللہ العافیۃ فاذا لقیتموھم فاصبروا و اعلموا ان الجنۃ تحت ظلال السیوف ——— "دشمن سے مقابلہ کی آرزو مت کرو، بلکہ اللہ سے امن و عافیت کی دعا کیا کرو، مگر جب دشمن سے مقابلہ ہو ہی جائے تو پھر استقلال کے ساتھ جم کر لڑو اور یقین کر لو کہ جنت تلواروں کے سائے کے تلے ہے۔"

ان ہدایاتِ نبوت سے معلوم ہوا کہ:

(۱) جہاد ایک دینی اور اخلاقی فرض ہے، جس میں کسی دنیوی غرض طمع، لالچ، قومی اور ذاتی عداوت کا انتقام، حکومت و فرمانروائی کی خواہش کو دخل نہیں ہوتا، اور اگر ہوتا ہے تو وہ دنیوی جنگ ہو جاتی ہے جو شریعت کی نظر میں ایک سنگین جرم ہے۔

(۲) کسی جابر طاقت کی طرف سے اگر فتنہ و فساد کی ابتداء کی جاتی ہے، تب بھی مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ وہ آخری حد تک اصلاح حال کی جدوجہد کریں، اور جب شر و فساد کو دور کرنے اور روکنے کے لئے تلوار اٹھانے کے سوا کوئی چارہ کار ہی باقی نہ رہ جائے تو پھر تلوار اٹھائی جائے۔

یقیناً ایک فوجی فاتح اور توسیع پسند سیاسی لیڈر کے سامنے جنگ و قتال کا اتنا اعلیٰ اور خشک و بے مزہ مقصد نہیں ہو سکتا، ایک فوجی جرنیل کے سامنے تو صرف یہ مقصد ہوتا ہے کہ جس طرح ہو سکے ملکوں اور قوموں کو زیر کر کے انھیں غلام بنایا جائے۔

جنگ کے طریقوں میں اخلاقی اصولوں کا احترام:

جنگ و قتال کا مقصد جب یہ قرار پا گیا کہ اگر جابر طاقتیں فوجی اقدامات، سیاسی دباؤ اور دوسرے ناجائز طریقوں سے حق قبول کرنے والوں کو پریشان کریں، ان کی آزادی رائے کو چھینیں اور ظلم و تشدد پر اتر آئیں تو اپنے اور حق کے بچاؤ کے لئے تلوار کا دفاع تلوار سے کیا جائے ——— مقصد جنگ کی اس تقدیس اور پاکیزگی کے ساتھ ساتھ ظاہر ہے کہ جنگ کے طریقوں میں بھی پاکیزگی اور تقدیس کا پیدا ہونا ضروری تھا۔

چنانچہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے وحشیانہ طریقوں کو ممنوع اور حرام قرار دیتے ہوئے میدانِ جنگ کے لئے متعدد اخلاقی قوانین نافذ کئے۔

۱۔ بوڑھوں اور بچوں کا تحفظ: مجاہدین اسلام کو ہدایت فرمائی

لا تقتلوا شیخاً فانیاً ولا طفلاً صغیراً ولا امراۃً ولا تغلوا وضموا غنائمکم واصلحوا واحسنوا ان اللہ یحب المحسنین ـــــ "نہ کسی بوڑھے ضعیف کو قتل کرنا، نہ چھوٹے بچوں کو، نہ کسی عورت کو، نہ غنیمت کے اموال میں خیانت کرنا۔ جنگ میں جو سامان ملے اسے ایک جگہ جمع کرو بندگانِ الٰہی کے ساتھ نیکی اور احسان کرو، خدا تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

ایک حدیث میں ہدایت فرمائی گئی:

لا تقتلوا اصحاب الصوامع ـــــ "عبادت گاہوں کے عابدوں اور خانقاہ نشینوں کو قتل نہ کیا جائے۔"

۲۔ شب خون کی ممانعت:

آپؐ نے دشمنوں پر رات کے وقت بے خبری میں حملہ کرنے کی ممانعت فرمائی حضرت انسؓ فرماتے ہیں۔

کان اذا جاء قوماً بلیلٍ لم یغز علیہم حتی یصبح ـــــ "سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کے وقت کسی دشمن پر پہنچتے تو جب تک صبح نہ ہو جاتی اس پر حملہ نہ کرتے۔"

۳۔ آگ میں جلانے کی ممانعت:

دشمنوں پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد انھیں آگ میں جلانے اور ان کی بستیوں کو پھونک ڈالنے کی ممانعت فرمائی ـــــ لا ینبغی ان یعذب بالنار الا رب النار ـــــ "آگ کا عذاب دینا آگ پیدا کرنے والے خدا کے سوا کسی دوسرے کو سزاوار نہیں۔"

۴۔ اذیت دے کر قتل کرنے کی ممانعت:

دشمنوں کو مغلوب کرنے کے بعد انھیں تکلیفیں پہنچا کر قتل کرنے کی ممانعت فرمائی۔

نہی عن قتل الصبر ——— "حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باندھ کر قتل کرنے سے منع فرمایا"

۵۔ لوٹ مار کرنے کی ممانعت:

نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من النھبی والمثلۃ ——— "حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مال لوٹنے اور مقتول کی صورت بگاڑنے کی ممانعت فرمائی"

ایک حدیث میں ہدایت فرمائی:

لا تغدروا ولا تغلوا ولا تمثلوا ——— "میدانِ جنگ میں بدعہدی نہ کرنا غنیمت میں خیانت نہ کرنا، اور مقتولوں کی صورت نہ بگاڑنا"

۶۔ شور مچانے کی ممانعت:

میدانِ جنگ میں فخر و غرور کے نعرے بلند کرنا اور دشمنوں کو بُرا بھلا کہنا تو کجا، ذکر الٰہی کے لئے بھی آوازیں بلند کرنے کی اجازت نہیں دی گئی

ایک موقعہ پر مجاہدین نے اونچی آواز سے تکبیرات شروع کر دیں تو آپؐ نے فرمایا:

ایھا الناس اربعوا علی انفسکم فانکم لا تدعون اصم ولا غائبا انہ معکم انہ سمیع قریب ——— "اے لوگو! وقار کے ساتھ چلو، تم جس ذات کو پکار رہے ہو وہ بہرا نہیں ہے اور نہ غائب ہے وہ تو تمھارے ساتھ ہے، سب کچھ سنتا ہے اور بہت ہی قریب ہے"

ان ہدایات کی اہمیت کا اس وقت اندازہ ہو سکتا ہے، جب اس عہد کے وحشیانہ طریقوں اور ظالمانہ افعال کو سامنے رکھا جائے۔

اس دور کی وحشی قومیں اور متمدن ملک دونوں کا یہ حال تھا کہ سفراء کو قتل کر دینا، معاہدہ کے تحت رہنے والی قوم کے ساتھ غدّاری کرنا، دشمنوں کی بستیوں کو جلا ڈالنا، آگ لگا دینا، لاشوں کی بے حرمتی کرنا، بدنظمی اور شور و غل کرنا، جنگ کا لازمی معمول بن گیا تھا۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام بہیمانہ افعال کو آہستہ آہستہ ختم کر دیا اور بالآخر جنگ ایک عبادت کے درجہ میں آگئی، جس میں دشمن کو کم سے کم نقصان پہنچا کر اس کے شر و فساد کو دور کر دیا جاتا ہے۔

قیدیوں پر احسان وکرم اور دشمنوں سے سلوک

غزوۂ بدر کے قیدی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس دور میں یہ عظیم اصلاحات فرمائیں اس دور کی مشہور سیاسی طاقتیں، روما الکبریٰ کی قیصریت، فارس کی کسرویت اور عرب کے خونخوار وحشی قبائل ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے ہوئے وقت ایک دوسرے کو نیست ونابود کرنے اور دشمن کے ساتھ بدتر سے بدتر حیوانی سلوک کرنے کی جو اندوہناک تاریخ پیش کرتے ہیں اس کے مقابلہ میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات اور آپؐ کے فوجی معرکے صرف جابر طاقتوں کے لئے ایک فہمائش اور انتباہ کی حیثیت رکھتے ہیں، ہلاکت وبربادی کی حیثیت نہیں رکھتے۔

ان اخلاقی اصولوں پر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس سختی سے عمل کیا اور اپنے رفیقوں سے کرایا، اس کی تفصیل اگلے واقعات سے ظاہر ہوگی۔

قریشِ مکہ نے مدینہ منورہ پر سب سے پہلا حملہ ایک ہزار جوانوں سے کیا، جو ہر طرح کے ہتھیاروں اور ساز وسامان سے مسلح تھے، اس حملہ کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے حوصلہ سے روکا اور تین سو تیرہ ۳۱۳ بے سروسامان رفیقوں کے ساتھ قریش کے حملہ کو ناکام بنا دیا۔ اس مقابلہ میں قریش کے بڑے بڑے نامور سپہ سالار مارے گئے، شیبہ، ابوجہل، عقبہ ابوالبختری، زمعہ ابن الاسود، عاص ابن ہشام، امیہ ابن خلف، منبہ ابن الحجاج ——— یہ سب قریش کے اہم ترین سیاسی لیڈر تھے جو اس جنگ میں کام آگئے، ان سب کی تعداد ستر۷۰ کے قریب تھی ——— اسی کے ساتھ ستر آدمی اسیرانِ جنگ کے طور پر گرفتار کر لئے گئے اور انھیں مدینہ منورہ لے آیا گیا۔

اسیرانِ جنگ میں حضور کے چچا حضرت عباس اور حضرت علی رضؓ کے بھائی حضرت عقیل اور

ابو العاص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد بھی تھے۔

مہذّب قوموں کا سلوک قیدیوں کے ساتھ:

اس وقت کی مہذب دنیا جنگی قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کرتی تھی؟ ——— پہلے اس پر ایک نظر ڈالیے ——— ارسطو جیسا معلم اخلاق کہتا ہے کہ قدرت نے اس طبقہ کو محض غلامی کے لئے پیدا کیا ہے ——— (الجہاد ص ۱۶۶)

اس عقیدے نے رومیوں کے نزدیک انسانی جان و مال کو بے حقیقت چیز بنا دیا تھا۔ آغازِ اسلام کے وقت روم میں ان غلاموں کی حالت یہ تھی ——— ایک دفعہ شہنشاہ ہرقل کی بیوی کے جنازہ میں جاتے ہوئے ایک لونڈی نے زمین پر تھوک دیا تو اس گستاخی پر اس لونڈی کو قتل کر دیا گیا۔

رومی سلطنت کی طرح ایران میں بھی اسیرانِ جنگ کے ساتھ ایسے ہی وحشیانہ طریقے اختیار کئے جاتے تھے، قیصر روم (والیسریان) جب شکست کھا کر ایرانی حکومت کا قیدی بنا تو اسے زنجیروں میں باندھ کر شہر میں گشت کرایا گیا اور ساری عمر اس سے غلاموں کی طرح خدمت لی گئی اور مرنے کے بعد اس کی کھال کھنچوا کر اس میں بھس بھروا دیا گیا۔

ایرانی شہنشاہ (شاپور) کا واقعہ ہے کہ اس نے بحرین کے عربوں کو جنگ میں شکست دیکر قیدی بنایا اور ان کے شانوں میں سوراخ کرا کے ان کے اندر رسّی پروا دی اور سب کو ملا کر ایک جگہ باندھ دیا ——— (الجہاد، ص ۱۶۷)

ان حالات میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے اسیروں کے ساتھ جو سلوک فرمایا وہ اس عہد کی مہذب ترین قوموں کے دستور کے مقابلہ میں رحم و کرم اور فضل و احسان کا بے مثال سلوک تھا ——— رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عام فرمان تھا۔

لا تجھزن علی جریح ولا یتبعن مدبر ولا یقتلن اسیر ومن اغلق بابہ فھو امن (فتوح البلدان ص ۴۷)

"کسی زخمی انسان پر حملہ نہ کیا جائے، کسی بھاگنے والے

کا پیچھا نہ کیا جائے، کسی قیدی کو قتل نہ کیا جائے اور جو اپنے گھر کا دروازہ بند کرے وہ امان میں رہیگا۔"
اس کے علاوہ قرآنِ حکیم نے جنگی قیدیوں کے ساتھ انتہا درجہ نرمی اور احسان کی تاکید فرمائی ہے، ارشاد فرمایا:۔۔۔۔۔۔

وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا ۔۔۔۔۔۔ "یہ نیکوکار لوگ خدا کی خوشنودی کے لئے یتیم، مسکین اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔" (الدہر ۸)

قیدیوں کو کھانا کھلانا، سعادت اخروی میں شامل کر دیا گیا اور اسے صالحین کا فعل قرار دیا گیا ۔۔۔۔۔۔ بدر کی جنگ میں جو لوگ قیدی بن کر آئے یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے ۱۳ برس تک رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر بے حد وحساب ظلم وستم کیا تھا اور وطن سے بے وطن ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

اس کے باوجود رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قیدیوں کو دو دو چار چار کر کے صحابہ کرامؓ میں تقسیم کر دیا اور انھیں تاکید فرمائی کہ انھیں آرام کے ساتھ رکھا جائے، صحابہ کرامؓ اپنے ان مہمانوں کو کھانا کھلاتے تھے اور خود کھجوریں کھا کر گذارا کرتے تھے۔

ایک قیدی ابو عزیزؔ کا بیان ہے کہ میں جن انصاریوں کے پاس قید تھا جب وہ لوگ صبح وشام میرے سامنے کھانا لاتے تو روٹی میرے سامنے رکھ دیتے خود کھجوریں اٹھا لیتے، مجھ کو شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دے دیتا، لیکن وہ ہاتھ بھی نہ لگاتے اور مجھ کو واپس کر دیتے۔

(طبری ص ۱۳۳۸)

ان قیدیوں میں ایک شخص سہیل ابنِ عمرو تھا جو نہایت بلند پایہ خطیب تھا اور عام مجمعوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تقریریں کرتا تھا، حضرت عمرؓ نے اس کے متعلق رائے دی کہ اس کے دو نچلے دانت اکھڑوا دیئے جائیں تاکہ یہ اچھی طرح تقریر نہ کر سکے۔ لیکن رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کی یہ تجویز سُن کر فرمایا ۔۔۔۔۔۔ اگر میں اس کا چہرہ بگاڑوں گا تو گو میں رسول ہوں مگر خدا تعالیٰ میرا چہرہ ضرور بگاڑ دے گا (طبری ص ۱۳۴۴)

اسیرانِ جنگ کے کپڑے خراب ہو گئے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت کی کہ انھیں اچھے کپڑے دے کر ان کا لباس بدلوایا جائے۔

قیدیوں میں حضرت عباس کا قد نہایت بلند تھا اور کسی کا کرتہ ان کے جسم پر ٹھیک نہیں اترتا تھا، عبداللہ بن ابی نے انھیں اپنا کرتہ پیش کیا، کیونکہ یہ بھی بلند قامت انسان تھا، احادیث میں آتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس منافق کو اس کے کفن کے لئے اپنا جو کرتہ عطا فرمایا تو وہ اسی احسان کا بدلہ تھا۔ ——— (بخاری ص ۲۴۲)

اسیرانِ بدر کے واقعہ تک جنگی قیدیوں کے بارے میں کوئی مستقل قانون نازل نہیں ہوا تھا، اس لئے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قیدیوں کے بارے میں صحابہ کرام رض سے مشورہ لیا ——— حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ آپؐ سیاسی اور وقتی معاملات میں اپنے اصحاب الرائے ساتھیوں سے مشورہ لیا کرتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی طرف سے یہی ہدایت تھی ——— وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران: ۱۵۹) ——— "صحابہ کرام رض سے مشورہ لیا کیجئے"۔ ——— حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر (ج ۲ ص ۳۲۵) میں امام احمدؒ اور ترمذیؒ کے حوالہ سے حضرت عبداللہ رض اور انس رض کی زبانی نقل کیا ہے کہ:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے قیدیوں کے بارے میں صحابہ کرام رض سے مشورہ فرمایا

ما تقولون فی ھؤلاء الاساری؟ ——— "ان قیدیوں کے بارے تم کیا کہتے ہو؟"

ان اللہ قد امکنکم منھم ——— "خدا تعالیٰ نے ان لوگوں کو تمہارے قبضہ میں دے دیا ہے"۔

سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پُرجوش رفیق حضرت عمر فاروق رض کھڑے ہوئے اور عرض کیا:

یارسول اللہ! کذبوك واخرجوك فقدمهم فیضرب اعناقهم ——— "حضور صلی اللہ علیہ وسلم! انھوں نے آپؐ کو جھٹلایا، اور آپؐ کو گھر سے نکالا، پس اجازت دیجیے کہ ان کی گردنیں اڑا دی جائیں"۔ ——— رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عمر رض کے مشورہ سے سخت تکلیف پہنچی۔

فاعرض عنه النبی صلی اللہ علیہ وسلم ـــــــــ "اور آپؐ نے انکی طرف سے منہ موڑ لیا"۔

پھر آپؐ نے دوسری دفعہ سوال کیا، پھر حضرت عمرؓ کھڑے ہوئے اور اپنی وہی رائے پیش کی مگر آپؐ نے پھر ان کی طرف سے منہ موڑ لیا، تیسری دفعہ آپؐ نے پھر پوچھا تو عبداللہ ابن رواحہؓ کھڑے ہو گئے اور انھوں نے حضرت عمرؓ سے بھی زیادہ سخت رائے پیش کی اور کہا:

انت فی واد کثیر الحطب فاضرم الوادی علیهم نارا ثم القهم فیه ـــــــــ "حضور اصلی اللہ علیہ وسلم آپ ایسے ایک جنگل میں ہیں جہاں کثرت سے لکڑیاں موجود ہیں، آپ اس جنگل میں آگ لگوا دیجئے اور ان قیدیوں کو اس میں ڈلوا دیجئے"۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ ابن رواحہؓ کی رائے سن کر پھر صحابہ کرامؓ کے سامنے اپنا سوال دوہرایا اور آخر میں حضرت ابو بکر صدیق رضؓ کھڑے ہوئے اور بولے:

یا رسول اللہ! قومك واهلك استبقهم واستتبهم لعل اللہ ان یتوب علیهم ـــــــــ "حضور صلی اللہ علیہ وسلم! یہ آپؐ کی قوم ہے اور آپؐ کے گھر والے ہیں آپؐ انھیں زندہ رہنے دیجئے اور ان سے توبہ کرا لیجئے شاید خدا تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمالے"۔

اسی کے ساتھ ابو بکر صدیق رضؓ نے ان سے کچھ فدیہ لینے کی بھی رائے دی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ تمام مشورے سن کر مجمع میں سے اُٹھ کر چلے گئے صحابہ کرامؓ میں کچھ لوگ عمرؓ کے ساتھ اور کچھ لوگ ابو بکرؓ کے ساتھ ہو گئے۔

چند منٹ کے بعد آپؐ صحابہ کرام میں واپس تشریف لائے اور ارشاد فرمایا:

ان اللہ لیلین قلوب رجالٍ حتی تکون الین من اللبن وان اللہ لیشدّ قلوب رجال فیه حتی تکون اشدّ من الحجارة وان مثلك یا ابوبکرؓ کمثل ابراهیمؑ قال فمن تبعنی فانه منی الخ ـــــــــ وان مثلك کمثل عیسٰیؑ قال ان تعذ بهم فانهم عبادك الخ ـــــــــ "لوگو! خدا تعالیٰ نے بعض لوگوں کے دل دودھ سے زیادہ نرم بنائے ہیں اور بعض کے دل پتھر سے زیادہ سخت بنائے ہیں اور اے ابو بکرؓ تمھاری مثال حضرت ابراہیم جیسی ہے جنھوں نے

فرمایا تھا فمن تبعنی الخ۔ اور حضرت عیسیٰ جیسی ہے جنھوں نے فرمایا تھا ان تعذبھم الخ"۔

وان مثلك یا عمر کمثل موسیٰ قال ربنا اطمس علی اموالھم واشدد علی

قلوبھم فلا یؤمنوا حتی یروا العذاب الالیمہ ـــــــــ "اور اے عمرؓ تمھاری مثال

حضرت موسیٰؑ جیسی ہے جنھوں نے فرعون کے لئے یہ دُعا کی ربنا اطمس الخ"۔

وان مثلك یا عمر کمثل نوح قال رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیاراہ

(سورہ نوح) ـــــــــ "اور حضرت نوحؑ جیسی ہے جنھوں نے اپنی نافرمان قوم کے متعلق فرمایا رب

لاتذر علی الارض الخ"۔ ـــــــــ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انتم عالۃ فلا ینفکن احد منھم الا بفداء او ضربۃ عنق ـــــــــ "دیکھو!

اس وقت تم ضرورت مند ہو، اس لئے ان قیدیوں سے کچھ فدیہ (تاوان) وصول کر کے انھیں چھوڑ دو

اور اگر یہ انکار کریں تو پھر واقعی یہ لوگ قتل کے مستحق ہیں"۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق ان قیدیوں سے ان کی حیثیت کے مطابق فدیہ وصول کر کے انھیں چھوڑ دیا گیا، جو قیدی غریب تھے ان سے تعلیم کا کام لیا گیا اور انھوں نے دس دس مسلمان بچّوں کو لکھنا پڑھنا سکھایا، بس یہی ان کا فدیہ تھا۔

اس کے بعد خدا تعالیٰ نے جنگی قیدیوں کے متعلق مستقل قانون نازل فرمایا اور وہ قانون وہی تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے قیدیوں کے بارے میں اختیار فرمایا تھا، قرآن نے ہدایت کی کہ اسیرانِ جنگ کے متعلق امیر المومنین کو اختیار رہے۔ خواہ انھیں احسان کر کے رہا کر دیا جائے یا ان سے تاوان وصول کر کے آزاد کر دیا جائے (سورہ محمد)

بدر کے قیدیوں کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگی قیدیوں کو اکثر فدیہ لئے بغیر ہی آزاد کر دیا اور انھیں اپنے فضل و احسان سے نوازا۔

قیدیوں کا تبادلہ:

اس دور میں قیدیوں کے تبادلہ کا عام دستور نہ تھا، بلکہ اکثر قومیں اسیرانِ جنگ کو غلام

بنا لیتی تھیں، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی دوسری قوموں کے ظالمانہ طرزِ عمل کے جواب میں احسان کرنے اور معاف کرنے یا ضرورت کے وقت معمولی تاوان لینے کا طریقہ اختیار فرمایا اور اگر کسی موقعہ پر تبادلہ کا موقعہ آیا تو آپؐ نے اسے خوشی سے منظور فرمالیا۔

مسلم، ابوداؤد اور ترمذی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مسلمان قیدیوں کے بدلہ میں ایک دفعہ مشرکین کے ایک آدمی کو آزاد کیا (فتح القدیر ج ۴ ص ۳۰۶)

تمام محدثین اور فقہاء اس پر متفق ہیں کہ اگر دشمن قوم تبادلہ پر راضی ہو تو تبادلہ کرلیا جائے۔

(فتح الباری ج ۶ ص ۱۰۱)

فدیہ کی حوصلہ شکنی:

اس وقت مسلمانوں میں غربت وافلاس کی پریشانی زیادہ تھی مسلمان خود اپنا پیٹ مشکل سے بھرتے تھے، پھر وہ ان قیدیوں کی خوراک کا انتظام زیادہ دیر تک کیسے کرتے؟

پھر تیرہ سال تک ان کے ہاتھوں سخت تکلیفیں اٹھائی تھیں، اور کچھ نہ کچھ سرزنش کرنا ضروری تھا، تاکہ انھیں آئندہ جنگ کی آگ بھڑکانے کا موقعہ نہ ملے۔

اس بنا پر حضرت ابوبکر رضؓ اور دوسرے صحابہؓ نے فدیہ لینے لینی کم سے کم سرزنش کرنے کی رائے دی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے منظور فرمالیا۔

لیکن قرآنِ کریم نے صحابہ کرامؓ کے اس جذبہ کی بھی حوصلہ شکنی کی اور وحی الٰہی کے ذریعہ صحابہ کرام کو ہلکی سی فہمائش کی گئی تاکہ یہ بات واضح ہوجائے کہ اسیرانِ جنگ سے فدیہ لینے کی جو اجازت دی جارہی ہے وہ ایک ناپسندیدہ بات کی اجازت دی جارہی ہے جو بدرجہ مجبوری ضرورت کے وقت اختیار کی جاسکتی ہے۔

ورنہ اسلامی تعلیم کی حقیقی رُوح کا تقاضا یہ ہے کہ اسیرانِ جنگ کے ساتھ عفو وکرم کا برتاؤ کیا جائے:۔

میدانِ اُحد میں دشمنوں کے لئے دُعاء:

خدا تعالیٰ نے دشمنوں کی ہر سازش سے اپنے رسولؐ کو محفوظ رکھا، لیکن دشمن آخر دم تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کے پیچھے پڑے رہے، ہجرت کے بعد ان مغرور سرداروں نے مدینہ منورہ پر فوج کشی شروع کردی، بدر کے پہلے معرکہ میں خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح مند فرمایا لیکن اُحد کے دوسرے معرکہ میں چند رفیقوں کی غلطی سے جنگ کا نقشہ پلٹ گیا اور مسلمانوں کے ساتھ خود لشکر کے سپہ سالار سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی زبردست تکلیف اُٹھانی پڑی۔

دشمنوں کا نشانہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک کو ختم کرکے مسلمانوں کو بے سہارا کرنا تھا، لیکن خدا تعالیٰ نے دشمنوں کی اس ناپاک آرزو کو خاک میں ملادیا۔

میدانِ جنگ کا نقشہ پلٹ جانے کے بعد جب رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے وفادار رفیقوں کے پیر اُکھڑ گئے تو رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم عجیب پریشانی کے عالم میں گھر گئے آپؐ نے فرمایا ـــــــ من رجل یشری لنا نفسہ ـــــــ "کون ہے جو ہمارے لئے اپنی جان قربان کرے ـــــــ اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی پکار سُن کر چودہ صحابیوںؓ نے آکر آپؐ کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ان میں سات مہاجر اور سات انصار تھے (فتح الباری ج۷ ص ۲۷)

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمنوں کے بڑھتے ہوئے ہجوم کو دیکھ کر فرمایا ـــــــ کون ہے جو ان ظالموں کو مجھ سے ہٹائے وہ جنت میں میرا رفیق ہوگا (مسلم ج۲ ص ۱۰۷)

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم جیسے باہمت اور بلند حوصلہ انسان کے لئے وہ وقت کتنا عجیب ہوگا، جب آپؐ اپنے رفیقوں کو مدد کے لئے پکار رہے ہوں گے اور دشمنوں کی یلغار آپؐ پر بڑھتی جارہی ہوگی، تاریخ کہتی ہے کہ عتبہ بن ابی وقاص نے موقعہ پاکر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک پتھر پھینکا جس سے آپؐ کا نیچے کا دانت شہید ہوگیا اور نیچے کا ہونٹ زخمی ہوگیا عبداللہ ابن قمیہ قریش کا مشہور پہلوان تھا اس نے آپؐ پر نہایت زوردار حملہ کیا اس سے آپؐ کا رخسار زخمی ہوگیا اور فولادی خود کی دو کڑیاں آپؐ کے رُخسار مبارک میں گُھس گئیں، ایک پتھر عبداللہ بن شہاب زہری نے آپؐ کے مارا اور

اور اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک پیشانی زخمی ہو گئی۔

حضرت ابو عبیدہ ابن جراحؓ نے چہرۂ انور میں گھسی ہوئی کڑیاں اپنے دانتوں میں پکڑ کر کھینچیں اور اس سے ابو عبیدہؓ کے دو دانت ٹوٹ گئے۔

صحابہ کرامؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس گڑھے سے نکال کر پہاڑی کے اوپر لیجانے کی کوشش کی، آپؐ بے حد کمزور ہو گئے تھے اور اوپر چڑھنا مشکل ہو رہا تھا اس لئے حضرت طلحہؓ آپؐ کے نیچے بیٹھ گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سہارا دے کر آپؐ کو اوپر چڑھایا۔

قیس ابن حازم کہتے ہیں کہ میں نے حضرت طلحہؓ کا وہ ہاتھ دیکھا جس سے انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُحد کے دن بچایا تھا تو میں نے دیکھا کہ آپؓ کا وہ ہاتھ بالکل شل تھا۔

حضرت ابو بکر صدیق رضؓ غزوۂ اُحد کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے۔

کان ذٰلک الیوم کلہ لطلحۃ ——— "یہ دن تو سارا طلحہؓ کے لیے رہا۔"

(فتح الباری ج ۷، ص ۲۷۸)

حضرت ابو دجانہؓ سپر بن کر آپؐ کے سامنے کھڑے ہو گئے تھے اور آپؐ کو دشمنوں کے حملوں سے بچا رہے تھے۔ ابو دجانہؓ کی پیٹھ دشمنوں کی جانب تھی اور آپؓ بے حس و حرکت کھڑے رہے تاکہ کوئی تیر آپؐ کے نہ لگ جائے۔

ایسے خوفناک حالات میں بشری تقاضے کے تحت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ اقدس سے قریش کے تین سرداروں، صفوان، سہیل اور حارث کے متعلق بددعا کے چند جملے نکل گئے اس پر خدا تعالیٰ نے آپؐ کو فوراً فہمائش کی اور آپؐ کا غصہ ٹھنڈا کیا وہ آیت پاک یہ ہے:

لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ اَوْ یَتُوْبَ عَلَیْھِمْ اَوْ یُعَذِّبَھُمْ فَاِنَّھُمْ ظٰلِمُوْنَ ○ ———

"اس معاملہ میں آپؐ کو کوئی اختیار نہیں، یا خدا انھیں توبہ کی توفیق دے یا انھیں عذاب دے کیونکہ یہ بڑے ظالم ہیں" (سورہ آل عمران) ——— بس وحی الٰہی کے اس اشارے نے آپؐ کے طبعی غصہ کو ٹھنڈا کر دیا اور آپؐ نے ان ظالموں کے حق میں دعا کرنی شروع کر دی۔

عبد اللہ بن مسعود رضؓ کا بیان ہے کہ اس وقت بھی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم میری نظروں کے سامنے ہیں، آپؐ اپنی پیشانی سے خون پونچھتے جاتے ہیں اور یہ دُعا کرتے جاتے ہیں۔

رب اغفر لقومی فانھم لا یعلمون ——— "خداوندا! میری قوم کو معاف کردے یہ لوگ بے خبر ہیں، انجان اور نادان ہیں۔" (مسلم شریف غزوہ احد ج ۲ ص ۱۰۸)

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا میں اپنی ظالم قوم کے لئے رحم وکرم کا بہت گہرا جذبہ کارفرما ہے، آپؐ نے اپنی دُعا میں ان ظالموں کے لئے خود ہی معذرت پیش فرمادی اور یہ کہہ دیا کہ یہ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں وہ محض لاعلمی اور بے خبری میں کر رہے ہیں حالانکہ قریش مکہ آپؐ کے ساتھ جو جو ظلم وستم کر رہے تھے وہ جانتے بوجھتے کر رہے تھے۔ یہ لوگ یقین رکھتے تھے کہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم صادق اور امین ہیں، پھر بھی آپؐ کی جان کے لیوا بنے ہوئے تھے، رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم رحم وکرم کے بلند ترین مقام پر فائز تھے، اخلاقِ عظیم کے مالک تھے، آپؐ نے خدا کے حضور میں ان ظالم دشمنوں کی طرف سے خود ہی معذرت خواہی کی اور معافی کی درخواست کی۔

اس کی مثال اگلے رسولوں میں حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاں بھی ملتی ہے، برادرانِ یوسفؑ اپنے بھائی کے حضور میں کھڑے ہیں: بھائی مصر کا حکمران ہے اور یہ غلّہ کے بھکاری ہیں، آپس میں تعارف کا سلسلہ شروع ہو رہا ہے اور حقیقتِ حال کے چہرہ سے نقاب اٹھائی جا رہی ہے حضرت یوسفؑ سوال کرتے ہیں۔

هَلْ عَلِمْتُمْ مَا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنْتُمْ جَاهِلُونَ (سورہ یوسف)

"کیا تمھیں معلوم ہے کہ تم نے یوسف کے ساتھ کیا کیا؟ جب تم نادان تھے۔"

حضرت یوسفؑ اپنے بھائیوں کو ان کی زیادتیوں کی طرف متوجہ کرتے ہیں، انھیں پچھلی خطائیں یاد دلاتے ہیں اور ساتھ ہی ان کی طرف سے یہ عذر بھی پیش کرتے ہیں کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب تم جاہل، نادان اور انجان تھے۔ مطلب یہ کہ مجرم کو اپنی صفائی کے لئے خود حضرت یوسفؑ نے دلیل بھی عنایت فرمادی، ایسے انداز سے خطا یاد دلائی کہ مجرم کی صفائی

کا خود ہی اعلان کر دیا یہ غایتِ اخلاق اور بے حد و حساب کرم کی بات ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لا یعلمون کا جملہ کہا اور حضرت یوسفؑ نے جاھلون فرمایا اور ان دونوں جملوں میں یہ فرق ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جملہ میں شفقت و کرم کا جذبہ حضرت یوسف علیہ السلام سے زیادہ محسوس ہوتا ہے۔

(سیرت المصطفیٰ ج ۲ ص ۲۰۵)

حضرت یوسفؑ اور حضرت یعقوبؑ کے درمیان فرق

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دشمنوں پر رحم و کرم کرنے میں حضرت یوسفؑ کی مثال پر عمل کیا، حالانکہ رحم و کرم کا ایک نمونہ حضرت یعقوبؑ کے عمل میں بھی ملتا ہے، اسے آپؐ نے نظر انداز فرمایا:

قرآن کریم کہتا ہے، اولادِ یعقوبؑ نے سارا معاملہ سامنے آجانے کے بعد اپنے باپ سے کہا:

قَالُوْا يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِئِيْنَ ۝ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (سورہ یوسف) ــــــ "وہ بولے، اے باپ! ہمارے لئے مغفرت کی دُعا کیجئے۔ یعقوبؑ نے کہا، دم لو، میں تمھارے لئے دعائے مغفرت کروں گا[1]، اپنے رب سے، بے شک وہ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔"

حضرت یعقوبؑ نے اپنی اولاد کی درخواست پر ان سے دعاءِ مغفرت کرنے کا وعدہ کیا، اس کے برعکس حضرت یوسفؑ نے فوراً ہی اپنے بھائیوں کے حق میں مغفرت کی دُعا کرنی شروع کر دی

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝

مفسرین نے لکھا ہے کہ باپ بیٹے کے درمیان یہ فرق جوانی اور بڑھاپے کے مزاجوں کا ہے ــــــ جوانی میں آدمی میں جوش ہوتا ہے، رحم کا معاملہ ہو یا غضب کا، اس میں جلدی کرتا ہے اور جوش دکھاتا ہے۔

[1] شیخ الہندؒ نے سوف کا ترجمہ دم لو کیا ہے یعنی ٹھہرو۔

بُوڑھا آدمی ہر معاملہ میں تحمل اور سوچ سمجھ کا مظاہرہ کرتا ہے، اس میں جلد بازی نہیں ہوتی

یہی بات حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کے معاملہ میں نمایاں ہوتی ہے۔

فتح مکہ کے موقعہ پر ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دشمنوں پر رحم وکرم کرنے میں جوانوں کی طرح جوش وخروش سے کام لیا اور فوراً معافی کا اعلان کر دیا۔

خُدا کی رحمت، اس کے غضب پر سبقت لے جاتی ہے:

خدا کی رحمت اس کے غیظ وغضب پر سبقت لے جاتی ہے اور اپنی مخلوق کے معاملات میں، خدا تعالیٰ رحم وکرم اور عفو ودرگذر سے زیادہ کام لیتا ہے، مشہور حدیث قدسی ہے

اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ عَلٰی غَضَبِیْ ــــــ "بیشک میری رحمت میرے غصّہ اور غضب سے آگے بڑھ جاتی ہے"

خدا تعالیٰ نے اپنے رسولِ خاص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی مزاج اور آپؐ کی تعلیمات کا مزاج اسی سانچے میں ڈھالا ہے۔

کتاب کے آخر میں "سیاستِ شرعیہ" کا ایک عنوان آئے گا اس میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی تعلیمات میں رحمت، شفقت اور عامۃ الناس کے ساتھ ہمدردی کا رنگ کیوں غالب نظر آتا ہے ــــــ؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا رحم وکرم

رسولانِ کرام میں حضرت ابراہیمؑ کا رحم وکرم بھی مشہور ہے، حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے باطل معبودوں کے بارے میں حضرت حق سے فرمایا۔

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ــــــ "اے میرے رب! ان باطل معبودوں نے اکثر لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے پس جو شخص میری پیروی کرے گا وہ تو میرا ہے اور جو میری نافرمانی کرے گا سو تو تو بیشک بخشش کرنے والا

اور رحمت والا ہے۔"

حضرت ابراہیم کے انداز پر غور کرو، پیروی کرنے والے مومن کو تو اپنا فرمار ہے ہیں اسے اپنے دامن میں ڈھانک رہے ہیں اور منکر اور بے دین کو ـــــ غفور رحیم کے حوالہ فرمارہے ہیں۔ سیدھا سادہ انداز تو یہ تھا کہ مومن میرا ہے اور منکر میرا نہیں ہے، میں اس سے بے تعلق ہوں، لیکن حضرت ابراہیمؑ کا عفو و کرم اس بات کے لئے تیار نہ ہوا کہ مجرموں کو اپنے سے دور کر کے انھیں مایوس کر دیں، اس لئے ان گناہ گاروں کو اپنے مولیٰ کے حوالہ کر دیا اور یہ کہہ کر کر دیا کہ آپ غفور رحیم ہیں، آپ جانیں اور آپ کے یہ گناہ گار بندے جانیں۔

حضرت عیسیٰؑ کا رحم و کرم

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی انہی رسولوں میں سے ہیں جن کے مزاج پر رحم و کرم اور محبت و پیار کا غلبہ تھا، قرآن کریم نے بتایا کہ حضرت عیسیٰؑ قیامت کے دن خدا تعالیٰ کے روبرو جواب دیتے ہوئے گناہ گار بندوں کے متعلق فرمائیں گے۔

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○

"خداوندا! اگر تو ان گناہگاروں کو سزا دے گا تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انھیں معاف کر دے گا تو تو طاقت اور حکمت والا ہے۔"

سیدنا عیسیٰؑ یہ نہیں فرماتے ـــــ کہ اگر تو ان مجرموں کو سزا دے گا تو یقیناً یہ لوگ اس قابل ہیں، بلکہ خدا تعالیٰ کے رحم و کرم کی شان کو نمایاں کر کے فرماتے ہیں کہ یہ تیرے بندے ہیں اور تو ان کا آقا ہے، تجھے اپنے بندوں پر ہر طرح کا اختیار حاصل ہے۔ میں ان کے معاملہ میں کیا دخل دے سکتا ہوں اور اگر تو انھیں معاف کر دے گا تو کون ہے جو تیرا ہاتھ پکڑے اور کون ہے جو تیری مشیت و مصلحت میں دخل دے؟ ـــــ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے جملوں میں ایک فرق یہ بھی بہت حکیمانہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے خدا تعالیٰ کو عزیز الحکیم کہا اور حضرت ابراہیمؑ نے غفور الرحیم ـــــ اس کی

وجہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا یہ کلام قیامت کے دن سے تعلق رکھتا ہے جہاں مشرکین کے لئے مغفرت کی کوئی گنجائش نہیں اور حضرت ابراہیمؑ کا جملہ دُنیا سے تعلق رکھتا ہے، یہاں اس بات کا امکان موجود ہے کہ خدا تعالیٰ مشرکین کو ہدایت کی توفیق عطا کر کے انھیں مغفرت سے نواز دے۔

خاص بندوں میں رحم و کرم کا جذبہ پیدا کرنا

خدا تعالےٰ کا رحم و کرم ہے

اپنی مخلوق پر خدا تعالےٰ کے رحم و کرم کی شان بھی بالکل نرالی ہے، اسی شانِ کریمی نے اس کے خاص بندوں میں رحم و کرم کا جذبہ پیدا کیا ہے، رسولانِ کرام کے کردار پر خداوند قدوس کی شانِ کریمی کا عکس پڑتا ہے جس کی وجہ سے ان کے اندر رحم و کرم کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں ــــــ قرآنِ کریم نے رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ (آل عمران۔ ۱۵۹) ــــــ "یہ اسی خدا کی رحمت ہے کہ تم اے نبی! نرم دل واقع ہوئے ہو"

خدا تعالیٰ کی یہ شانِ کریمی قیامت کے دن کس طرح اپنے بندوں پر ظاہر ہو گی؟ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ بندوں سے سوال کرے گا کہ تم نے دُنیا میں میری نافرمانی کیوں کی؟ تو اس سوال کا انداز عجیب و غریب ہو گا۔ وہ فرمائے گا۔

يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ (سورہ انفطار: ۶) ــــــ

"اے انسان! تجھے ربِ کریم کے بارے میں کس نے بھلاوے میں ڈالا تھا"

امام رازیؒ اپنے تفسیری نکتہ میں فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے اپنے ساتھ کریم کی صفت لگا کر اپنے بندوں کو خود ہی جواب بھی سکھا دیا، یعنی بندوں کو بتایا کہ میرے سوال کے جواب میں کوئی اناپ شناپ بات منہ سے نہ نکالنا، بلکہ یہ کہہ دینا کہ اے خدا! تیری شانِ کریمی نے ہم گنہگاروں کو تیری طرف سے بھلاوے میں ڈال دیا، تیرے رحم و کرم کی وجہ سے ہم میں کچھ غفلت پیدا ہو گئی، ہم یہ سمجھے کہ تو رحیم و کریم ہے، غفار و ستار ہے۔ یہ جواب خدا تعالیٰ کی رحمت کو جوش میں لے آئے گا اور پھر وہ اپنے بندوں کے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ کرے گا۔

فتح مکہ کے موقعہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمانہ

مکہ میں بنی خزاعہ اور بنی بکر دو قبیلوں کے درمیان جھگڑا شروع ہوا، قریشِ مکہ نے اس لڑائی میں بنی بکر کا ساتھ دیا اور اس کے مخالف قبیلے بنی خزاعہ کے آدمیوں کو حرم شریف کے اندر نہایت بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا، بنی خزاعہ مسلمانوں کا حلیف قبیلہ تھا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قبیلہ کے ساتھ امن وحفاظت کا معاہدہ کر رکھا تھا، اس قبیلہ کے لوگوں نے قریش کا سفاکانہ ظلم وستم دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد کی درخواست کی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے تو سردارانِ قریش کو سمجھایا اور انہیں ظلم وستم سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن جب قریشِ مکہ ظلم وتشدد پر اڑے رہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مظلوم بنی خزاعہ کو قریش کے ظلم سے نجات دلانے کا فیصلہ کر لیا، کیونکہ آپؐ ازروئے معاہدہ اس کے پابند تھے۔

مدینہ سے روانگی:

اسلامی تاریخ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اقدام اپنے اندر اسلامی اخلاق وشرافت اور عفو وکرم کا بے مثال سبق رکھتا ہے، آپؐ دس ہزار پاکباز مسلمانوں کی جماعت لے کر دسویں رمضان المبارک کو مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے (فتح الباری ج ۸ ص ۲)

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قافلہ جب مکہ اور مدینہ کے درمیان ابواء کے مقام پر پہنچا تو آپؐ کو اپنے دو نہایت گستاخ دشمن مکہ سے مدینہ جاتے ہوئے ملے، یہ دونوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اسلام قبول کرنے جا رہے تھے، ان میں سے ایک ابوسفیان بن حارث تھے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی بھی تھے اور دودھ شریک بھائی بھی اور نبوت سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی دوستی بھی تھی۔

نبی ہونے کے بعد یہ ابوسفیان بن حارث حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت مخالف ہو گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی شان میں گستاخیاں کرنے لگے اور آپؐ کی ہجو میں اشعار کہنے لگے، حضرت حسّان بن ثابتؓ ان کی ہجو کا جواب دیتے تھے۔

دوسرا آدمی عبداللہ بن امیہ تھا جو آپؐ کا پھوپھی زاد بھائی تھا، یہ شخص بھی آپؐ کا شدید مخالف تھا۔ یہ دونوں کٹر مخالف اسلام کا بڑھتا ہوا اثر دیکھ کر مسلمان ہونے کا فیصلہ کر کے گھر سے نکلے تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم راستہ میں مل گئے ——— ان لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کی اجازت طلب کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کو ان لوگوں نے سخت اذیت پہنچائی تھی، آپؐ نے ملنے سے انکار کر دیا ——— آپؐ کی رفیقہ حیات حضرت اُمِّ سلمہؓ اس سفر میں آپؐ کے ساتھ تھیں، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا غصہ دیکھ کر ان دونوں کے لیئے سفارش کی اور عرض کیا:

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جب آپؐ کے عفو و کرم سے کوئی شخص محروم نہیں رہتا تو پھر یہ آپؐ کے چچازاد اور پھوپھی زاد بھائی کیوں محروم کیئے جا رہے ہیں ——— ؟

ابوسفیان نے آگے بڑھ کر عرض کیا، اے رسول محترم! اگر آپؐ نے اپنی بارگاہِ رحمت میں مجھے حاضر ہونے کی اجازت نہ دی تو میں اپنے اس لڑکے جعفر کو ساتھ لے کر صحرائے عرب کی طرف نکل جاؤں گا اور وہیں بھوکا اور پیاسا مر جاؤں گا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا غصہ، ابوسفیان کے یہ چند جملے سن کر اُتر گیا اور دل موم ہو گیا اور ابوسفیان کو معاف فرما کر حاضری کی اجازت دی، ابوسفیانؓ نے حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔

ایک روایت میں یہ ہے کہ ابوسفیان بن حارث کے خلاف آپؐ کا غصہ دیکھ کر حضرت علیؓ نے ابوسفیان کو یہ تدبیر بتائی کہ ابوسفیان حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو کھڑے ہو کر وہی بات کہیں جو حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حضرت یوسفؑ سے کہا تھا اور وہ یہ ہے۔

تَاللّٰہِ لَقَدْ اٰثَرَکَ اللّٰہُ عَلَیْنَا وَاِنْ کُنَّا لَخٰطِئِیْنَ (سورۂ یوسف) ——— "خدا کی قسم! اے بھائی! بے شک خدا تعالیٰ نے تم کو ہم سب پر بزرگی عطا فرمائی اور ہم سب خطاوار ہیں"

حضرت علی رضؓ نے ابو سفیان کو حضورؐ کے سامنے کھڑے ہونے کا مشورہ اس لئے دیا کہ علی رضؓ جانتے تھے کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں میں بے حد شرم و حیا اور بے انتہا لحاظ و مروت ہے، ابو سفیان جیسا دشمن بھی جب سامنے آئے گا تو آپؐ کے چہرۂ انور کی حیا اور شرمگیں آنکھیں آپؐ کے غصہ کے لئے حجاب بن جائیں گی اور آپؐ ابو سفیان کو معاف فرما دیں گے۔

حضرت علی رضؓ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج شناس تھے، چنانچہ جیسا انھوں نے کہا تھا اسی طرح پیش آیا، اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو سفیان کی زبان سے وہ آیتِ پاک سُن کر اس کے جواب میں وہی کہا جو حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا، آپؐ نے فرمایا

لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ یَغْفِرُ اللّٰہُ لَکُمْ وَھُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ (سورہ یوسف ۹۲)

"آج کے دن تم پر کوئی الزام اور ملامت نہیں، اللہ تعالیٰ تمھارا قصور معاف کرے وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رحم و کرم نے ابو سفیان کے دل کی تمام دنیا بدل ڈالی اور جو دل اس وقت تک نفرت اور عناد کا نشیمن تھا، اس دل سے محبتِ رسول کے چشمے اُبلنے لگے۔

ابو سفیان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رحم و کرم سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ تمام عمر آپؐ سے آنکھ ملا کر بات نہیں کی اور پوری زندگی آپؐ کے ساتھ وفاداری اور جاں نثاری میں گزار دی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ابو سفیان کے لئے جنت کی خوشخبری دی۔ (اسیر المصطفیٰ ص ج ۲)

ابو سفیان کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پھوپھی زاد بھائی عبداللہ بن ابی امیہ کیساتھ بھی رحم و کرم کا برتاؤ کیا اور وہ بھی مشرف باسلام ہو گئے۔

ابو سفیان بن حرب پر رسول اکرم کا رحم و کرم

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قافلہ جب مرّ الظہران کے مقام پر پہنچا تو قریش کے مشہور سردار ابو سفیان بن حرب آپؐ کی خدمت میں لائے گئے۔

ابو سفیان اور بدیل بن ورقاء، قریش کی طرف سے مسلمانوں کے حالات معلوم کرنے نکلے

تھے، ظہران پر پہنچ کر انھیں مسلمانوں کا عظیم قافلہ نظر آیا، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چوکیدار دل کی نظر بھی ان دونوں پر پڑ گئی، اور انھوں نے ان دونوں کو گرفتار کر لیا، حضرت عباسؓ اسی وقت ادھر نکلے، رات کا وقت تھا، حضرت عباس رضؓ نے ابوسفیان کی آواز پہچان لی اور ابوسفیان سے کہا —— ابوسفیان! یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثاروں کا لشکر ہے آج قریش کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت قبول کر کے آپؐ سے امن طلب کر لیں، ابوسفیان نے کہا، عباس رضؓ! پھر اس کی کیا صورت ہو، حضرت عباس رضؓ نے کہا، تم میرے خچر پر سوار ہو جاؤ، میں تمھیں سرکارِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے کر چلتا ہوں اور تمھارے لئے امن حاصل کرتا ہوں۔

راستہ میں حضرت عمر رضؓ ملے اور ابوسفیان کو دیکھ کر جوش میں آگئے اور بولے، یہ سفیان، خدا اور اس کے رسول کا دشمن ہے، یہ کسی عہد اور اقرار کے بغیر ہاتھ آگیا ہے، حضرت عباس رضؓ نے عمر رضؓ کا جوش دیکھا اور اپنی سواری کو تیزی کے ساتھ آگے لے گئے، عمر فاروق پیچھے پیچھے تلوار سونتے ہوئے چلتے رہے، یہاں تک کہ یہ سب لوگ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گئے، حضرت عمر رضؓ نے کہا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم! اجازت دیجئے، ابوسفیان کو ختم کر دوں، حضرت عباس رضؓ نے فوراً کہا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے انھیں اپنی پناہ دیدی ہے، حضرت عمر رضؓ اس کٹّر دشمن اور مسلمانوں کے قاتل کو ختم کرنے کے لئے اپنے آقا کے اشارہ کا انتظار کرتے رہے۔

ابوسفیان کے معاملہ میں حضرت عمر رضؓ اور حضرت عباس رضؓ کے درمیان کچھ تیز کلامی بھی ہوئی اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نقشہ دیکھ کر حضرت عباس رضؓ سے کہا چچا جان! اس وقت ابوسفیان کو اپنے خیمہ میں لے جاؤ، صبح ہو جانے کے بعد انھیں پیش کرنا، حضرت عباس رضؓ نے حکم کی تعمیل کی، صبح ہوئی، حضرت عباس رضؓ نے ابوسفیان اور بدیل کو رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا —— حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان کو مخاطب کر کے فرمایا ابوسفیان!

ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوگا اُسے امن دیا جائے گا۔ ابوسفیان بولے حضور اصلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں اتنی گنجائش نہیں کہ تمام لوگ اس میں سما سکیں، آپؐ نے فرمایا: اچھا، اعلان کر دو جو شخص مسجدِ حرام میں داخل ہوگا وہ بھی امن پائے گا، ابوسفیان نے پھر عرض کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام بھی کافی نہیں، آپؐ نے فرمایا، اچھا، جو شخص اپنے گھر کا دروازہ بند کرے گا اسے بھی امن عطا کیا جائے گا، ابوسفیان نے عرض کیا، ہاں، اس میں بہت گنجائش ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے امن وسلامتی کا پیغام حاصل کر کے ابوسفیان فوراً مکہ روانہ ہو گئے اور مکہ میں آکر اعلان کر دیا کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بہت بڑی جمعیت کے ساتھ مکہ میں داخل ہو رہے ہیں، میری رائے یہ ہے کہ اب قریش کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت قبول کرلیں اور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے امن وسلامتی کا پیغام لے کر آیا ہوں۔

مکہ کے عوام نے یہ اعلان سُنا اور سنتے ہی کوئی شخص مسجد حرام کی طرف بھاگا، اور کوئی اپنے گھر کی طرف دوڑا (سیرت المصطفیٰ ج ۳ ص ۷۰)

داخلہ کے وقت خاکساری اور بندگی:

حضرت عباسؓ نے ابوسفیانؓ سے کہا تھا کہ ابوسفیان! محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آج جو کچھ ہے وہ سلطنت کی شوکت نہیں، نبوّت کی عظمت ہے ——— حضرت عباسؓ نے جو کچھ کہا تھا وہ صحیح تھا اور اس وقت وہ حقیقت آنکھوں کے سامنے نمودار ہو کر آگئی تھی۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی مشن اخلاقِ کریمانہ کو سربلند کرنا تھا، آج آپؐ اسی شان سے مکہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت مکہ میں داخل ہوئے اس وقت آپؐ کا سرِ اقدس تواضع سے جھکا ہوا تھا، حضرت عبد اللہ بن مغفلؓ بیان کرتے ہیں کہ اس وقت میں نے دیکھا کہ آپؐ اپنی ناقہ پر سوار ہیں اور خوش الحانی کے ساتھ سورۂ انا فتحنا لک فتحاً مبیناً کی تلاوت فرما رہے ہیں۔

بخاری کی روایت میں ہے کہ فتح وکامرانی کی خوشی میں آپؐ کا سرِ اقدس خداوندِ عالم کی جناب میں جھکا ہوا تھا اور آپؐ کی ریشِ مبارک کجاوہ کی لکڑی سے مس کر رہی تھی اور آپؐ کے پیچھے آپؐ کے خادم زادہ حضرت اسامہ بن زیدؓ بیٹھے ہوئے تھے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم محض ایک فاتح حکمراں ہوتے تو فتح وکامرانی کے اس موقعہ پر آپؐ پر اور آپؐ کے ساتھیوں پر غرور وتکبر کی شان طاری ہوتی مگر آپؐ اخلاق وروحانیت کے علم بردار تھے، اس لئے تواضع وعبدیت آپؐ کی ذات میں جلوہ گر ہوئی۔

مکہ میں داخل ہو کر سب سے پہلے آپؐ اپنی چچازاد بہن ام ہانی بنت ابی طالب کے گھر تشریف لے گئے اور وہاں غسل کر کے آپؐ نے آٹھ رکعتیں نماز کی ادا فرمائیں، یہ چاشت کا وقت تھا۔

علماءِ اسلام اس نماز کو "صلوٰۃ الفتح" کہتے ہیں، سعد بن ابی وقاصؓ ایران کو فتح کر کے جب شاہِ ایران کسریٰ کے محل میں داخل ہوئے تو انھوں نے بھی اپنی آٹھ رکعت نماز ایک سلام سے ادا فرمائی (بحوالہ روض الانف ج ۲ ص ۲۷۳)

نماز سے فارغ ہو کر آپؐ اس مقام پر تشریف لائے جہاں آپؐ کی قوم نے تین سال تک آپؐ کو نظر بند کر رکھا تھا، اس مقام پر آپؐ کے لئے ایک خیمہ نصب کر دیا گیا تھا، یہ شِعب ابی طالب یعنی وہ گھاٹی تھی جو ابی طالب کے نام سے موسوم تھی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قیام کے لئے اس جگہ کو اس لئے پسند فرمایا تاکہ اپنی مظلومیت کا پہلا دور آپؐ کے سامنے رہے اور آپؐ کے اندر فتح مندی کا غرور پیدا نہ ہونے پائے (فتح الباری ج ۸ ص ۱۶)۔

مسجد حرام میں داخلہ اور مجرموں کی معافی:

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام میں داخل ہوئے، خانہ کعبہ کا طواف فرمایا کعبہ کے اندر جا کر کعبہ کو مخلوق پرستی کے نشانات سے پاک کیا، پھر خدا کے سامنے سر جھکایا اور نماز ادا کی، باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ تمام مسجد حرام میں قریش کے چھوٹے بڑے لوگ کھڑے ہیں اور انتظار کر رہے ہیں

کہ رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وسلم، مجرموں کے لئے کیا حکم صادر فرماتے ہیں ــــــ یہ رمضان المبارک کی ۱۳ر تاریخ تھی (اس قول پر اکثر محدثین اور سیرت نگاروں کا اتفاق ہے، ایک قول ۲۰ر رمضان کا بھی ہے)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ شریف سے باہر نکلے، باب کعبہ پر کھڑے ہوئے کعبہ کی کنجی آپؐ کے ہاتھ میں تھی، سامنے وہ تمام مجرم کھڑے تھے، آپؐ نے ایک تقریر فرمائی جس میں نسلی غرور کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے ساتھ ساتھ عفو و کرم کا اعلانِ عام کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

یا معشر قریش! ان اللہ قد اذھب عنکم نخوۃ الجاھلیۃ و تعظمھا بالآباء، الناس من آدم و آدم من تراب، یایھا الناس انا خلقنا کم من ذکر و انثی وجعلنا کم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم ان اللہ علیم خبیر ــــــ "اے قریش کے لوگو! خدا تعالیٰ نے عہدِ جاہلیت کی نخوت اور تکبّر اور باپ دادوں پر فخر کرنے کو باطل کر دیا ہے۔ سب لوگ آدمؑ سے ہیں اور آدمؑ مٹی سے ہے۔ خدا تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے اور تمھیں مختلف خاندانوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا ہے تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو، بے شک خدا تعالیٰ جاننے والا اور خبردار ہے۔"

اس کے بعد قریش کو مخاطب کر کے کہا: ــــــ یا معشر قریش! ما ترون انی فاعل بکم ــــــ "اے قریش تمھارا کیا خیال ہے، اب میں تمھارے ساتھ کیا کرنے والا ہوں"۔

قریش کی طرف سے سہیل بن عمرو نے کہا:

نقول خیراً و نظن خیراً اخ کریم و ابن اخ کریم و قد قدرت ــــــ "ہم سب بھلائی کی بات کہتے ہیں اور بھلائی کا گمان رکھتے ہیں، آپؐ شریف و کریم بھائی ہیں اور شریف بھائی کے بیٹے (بھتیجے) ہیں اور بدلہ لینے کی قدرت بھی آپؐ کے پاس موجود ہے۔

قال فانی اقول لکم کما قال یوسف علیہ السلام اذھبوا فانتم الطلقاء ــــــ "میں تم سے وہی بات کہتا ہوں جو حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہی، تم پر آج کوئی ملامت نہیں، جاؤ! تم سب آزاد ہو"۔ (بحوالہ البدایہ ج ۴ ص ۳۰۰ و اصابہ ترجمہ سہیل بن عمرو)

کعبہ کی کنجی واپس کردی گئی:

فتح مکہ کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عفو و کرم کا نہایت سبق آموز واقعہ بیت اللہ کی کنجی واپس کرنے کا ہے، حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں فتح مکہ کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بیت اللہ شریف کی زیارت سے روک دیا تھا، آپؐ نے عثمان کو بلاکر فرمایا، عثمان بیت اللہ کی کنجی میرے حوالہ کرو۔

ادنی المفتاح فاتاہ بہ، فلما بسط یدہ الیہ قام الیہ العباس، قال یارسول اللہ! بابی انت وامی اجمعہ لی مع السقایہ، فکف عثمان یدہ ——— "عثمان نے کنجی دینے کے لئے ہاتھ بڑھایا، حضرت عباس کھڑے ہوگئے اور کہا حضور! یہ کنجی ہمیں عطا کردیجئے، تاکہ بنی ہاشم کے پاس زمزم اور کلید دونوں جمع ہوجائیں، حضرت عباسؓ کے اس کہنے پر عثمان نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان کو پھر حکم دیا کہ کنجی دکھاؤ، عثمان نے پھر ہاتھ بڑھایا عباسؓ نے پھر وہی درخواست دُہرائی، عثمان نے پھر اپنا ہاتھ کھینچ لیا، اس دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——— یا عثمان! ان کنت تؤمن باللہ والیوم الآخر فہاتہ فقال ھاک امانۃ اللہ ——— "اے عثمان! اگر اللہ اور آخرت پر یقین ہے تو کنجی مجھے دیدے، عثمان بولا، یہ لیجیے! خدا کی امانت۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کنجی لے لی اور کعبہ کو کھول کر اس کی زیارت کی اور اسے پاک صاف کیا، پھر طواف ودعا سے فارغ ہوکر عثمان کو آواز دی، عثمان حاضر ہوئے، آپؐ نے فرمایا: ——— ھاک مفتاحک یا عثمان! الیوم یوم وفاء وبرٍ ———

"یہ لو عثمان اپنی کنجی، آج کا دن وفا و بھلائی کا دن ہے۔"

ابن جریج کی روایت میں یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب بیت اللہ سے باہر نکلے تو آپؐ کی زبانِ اقدس پر یہ آیت پاک جاری تھی۔ ۱۴۱

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا ——— "اللہ تعالیٰ تمھیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حق داروں کے سپرد کردو۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بیت اللہ شریف میں وحی نازل ہوئی اور آپؐ نے وحی الٰہی کی ہدایت کے مطابق بیت اللہ کی کنجی عثمان بن طلحہ کے سپرد کر دی اور حضرت عباسؓ کی درخواست کو نامنظور فرمادیا۔

ابن عباس اور محمدؐ بن حنفیہ نے اس آیت کے تحت فرمایا ہے کہ یہ حکم نیک و بد (بروفاجر) سب کے لئے عام ہے یعنی امانت نیک کی ہو یا بُرے آدمی کی، دونوں کو واپس کرنی ضروری ہے (ابن کثیر ج ۱ ص ۵۱۶ سورۂ نساء)

ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا:
عثمان! یہ کنجی میں نہیں، بلکہ میرا خدا تمھارے سپرد کر رہا ہے، اس لئے قیامت تک کوئی ظالم تم سے یہ کنجی نہ چھین سکے گا، یعنی یہ عہدہ ہمیشہ تمھارے خاندان میں رہے گا۔
(فتح الباری ج ۸ ص ۱۵)

دُنیا کی تاریخ ایسے فاتح اور غالب کی مثال پیش کرنے سے ہمیشہ قاصر رہے گی جس نے سیاسی فتح مندی کے بعد جانی دشمنوں کو اس طرح معاف کر دیا ہو اور ان سے ان کا کوئی اعزاز نہ چھینا ہو، بلکہ مغلوب ہو جانے کے بعد بھی مفتوح دشمنوں کو ان کے سابق اعزاز و اکرام پر قائم رہنے دیا ہو، آج اس واقعہ کو تیرہ سو ۱۳۰۰ برس گذر گئے، مگر کعبہ کی کلید برداری کا اعزاز عثمان ہی کے خاندان میں موجود ہے۔

فاتح حکمران ملکہ بلقیس کی نظر میں:

قرآنِ کریم نے حضرت سلیمانؑ کے عہد کی مشہور ملکہ "بلقیس" کا تذکرہ کرتے ہوئے فاتح اور غالب حکمران کے بارے میں اس کا قول نقل کیا ہے واقعہ اس طرح پیش آیا کہ حضرت سلیمانؑ نے بلقیس کے پاس توحیدِ حق کا پیغام بھیجا، یہ مخلوق پرست قوم کی بادشاہ تھی، پیغام

پا کر اس نے اپنے ارکانِ حکومت کو طلب کیا۔

قَالَتۡ يٰۤاَيُّهَا الۡمَلَؤُا اَفۡتُوۡنِىۡ فِىۡۤ اَمۡرِىۡ‌ۚ مَا كُنۡتُ قَاطِعَةً اَمۡرًا حَتّٰى تَشۡهَدُوۡنِ‏ ۔۔۔۔۔ "اور کہا، اے سردارانِ قوم! میرے معاملہ میں مجھے مشورہ دو، میں کسی بات کا قطعی فیصلہ نہیں کرتی، جب تک کہ تم لوگ حاضر نہیں ہوتے۔"

قَالُوۡا نَحۡنُ اُولُوۡا قُوَّةٍ وَّاُولُوۡا بَاۡسٍ شَدِيۡدٍ ۙ وَّالۡاَمۡرُ اِلَيۡكِ فَانْظُرِىۡ مَاذَا تَاۡمُرِيۡنَ ۔۔۔۔۔ "وہ بولے، ہم بڑے طاقتور ہیں اور سخت جنگجو ہیں اور اختیار تیرے ہاتھ میں ہے، پس تو غور کر، جو حکم دے۔"

قَالَتۡ اِنَّ الۡمُلُوۡكَ اِذَا دَخَلُوۡا قَرۡيَةً اَفۡسَدُوۡهَا وَجَعَلُوۡۤا اَعِزَّةَ اَهۡلِهَاۤ اَذِلَّةً‌ ۚ وَكَذٰلِكَ يَفۡعَلُوۡنَ‏ (النمل: ۳۴) ۔۔۔۔۔ "وہ بولی، بے شک بادشاہ جب کسی بستی میں (غالب ہو کر) داخل ہوتے ہیں تو اسے برباد کر دیتے ہیں اور اس کے باعزت باشندوں کو ذلیل کر دیتے ہیں، اور یہ ایسا ہی کچھ کریں گے۔"

پھر اس نے حضرت سلیمانؑ کو خوش کرنے کے لئے قیمتی تحائف بھیجے، مگر سلیمانؑ نے قاصد سے کہا: ۔۔۔۔۔ اِرۡجِعۡ اِلَيۡهِمۡ فَلَنَاۡتِيَنَّهُمۡ بِجُنُوۡدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمۡ بِهَا وَلَـنُخۡرِجَنَّهُمۡ مِّنۡهَاۤ اَذِلَّةً وَّهُمۡ صٰغِرُوۡنَ‏ ۔۔۔۔۔ "واپس جاؤ ان کے پاس، ہم اپنے لشکر کے ساتھ ان کے پاس پہنچتے ہیں، جس کا مقابلہ ان سے نہیں ہو سکتا اور ہم انہیں وہاں سے نکال دیں گے ذلیل کر کے اور وہ مغلوب ہوں گے۔" (النمل: ۳۷)

بلقیس نے فاتح حکمرانوں کے بارے میں جو کچھ کہا وہ دنیوی بادشاہوں کی بات تھی مگر حضرت سلیمانؑ تو ایک رسول و نبی بھی تھے، سلیمانؑ نے قاصد کو جن الفاظ میں دھمکی دی، وہ بظاہر ایک رسول کی شایانِ شان معلوم نہیں ہوتی، حضرت شاہ عبد القادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات کو محسوس کیا اور اس کا جواب دیتے ہوئے کہا:

"اور کسی پیغمبر نے اس طرح کی بات نہیں فرمائی، سلیمانؑ کو حق تعالیٰ کی سلطنت کا زور تھا

جو یہ فرمایا۔" (حمائل مولانا عثمانی ص ۲۹۲)

شاہ صاحبؒ کا مطلب یہ ہے کہ ایک رسول کسی دشمن پر غالب ہو کر ایسی کارروائی نہیں کرتا، جس کی دھمکی حضرت سلیمانؑ نے دی، حضرت سلیمانؑ نے جو کچھ کہا وہ دراصل ملکہ سبا کے سرداروں کے مغرورانہ قول کا جواب تھا، طاقت کے جواب میں سلیمانؑ نے طاقت کی زبان استعمال کی، تاکہ وہ اس دھمکی سے مرعوب ہو کر شرک و کفر کی راہ چھوڑ دیں۔

حضرت سلیمانؑ جانتے تھے کہ اس دھمکی پر عمل کرنے کی نوبت نہیں آئے گی، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ملکۂ بلقیس نے سلیمانؑ کے پاس حاضر ہو کر کہا:

وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ ——— "اور ہم تو اس سے پہلے ہی جان چکے تھے اور آپ کے فرمانبردار بن چکے تھے۔" (النحل)

حاصل یہ ہے کہ ایک رسول و نبی کی شان سیاسی حکمرانوں سے مختلف ہوتی ہے، سیاسی حکمران مغلوب قوم پر قتل و غارت گری کرتے ہیں اور خدا کے رسول و نبی کمزوروں پر رحم و کرم کی بارش کرتے ہیں۔

فتح مکہ کے موقع پر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا کریمانہ سلوک اس کی شاندار مثال ہے۔

کعبہ پر اذان، ابو محذورہ پر شفقت:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال حبشیؓ کو حکم دیا کہ کعبہ پر چڑھ کر اذان دو، بلالؓ نے اذان دی، ابو محذورہ اور اس کے ساتھ چند لڑکوں نے اذان کا مذاق اڑایا اور بلالؓ کی نقل اتارنے لگے، ابو محذورہ بہت خوش آواز تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آواز سن لی تھی، اذان کے بعد آپؐ نے ان مذاق اڑانے والے لڑکوں کو بلایا اور ان سے پوچھا، وہ آواز کس کی تھی، لڑکوں نے ابو محذورہ کی طرف اشارہ کیا، ابو محذورہ حضور کے سامنے پیش کیے گئے اور ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اب میں قتل کر دیا جاؤں گا، لیکن خُلقِ عظیم والے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو محذورہ سے کہا ہاں، میاں! اب کہو، تم کیا کہہ رہے تھے، ابو محذورہ نے اذان کے

کلمات دُہرا دیئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں درہموں کی ایک تھیلی عطا فرمائی اور ان کے سر اور پیشانی پر اپنا دستِ مبارک پھیرا اور یہ دُعا دی بَارَکَ اللّٰہُ فِیْکَ وَبَارَکَ اللّٰہُ عَلَیْکَ "خدا تعالیٰ تمھیں اپنی رحمت اور برکت سے نوازے"۔

ابو محذورہ کا بیان ہے کہ میرے سر پر آپؐ نے ہاتھ پھیرا اور فوراً میرے دل سے آپؐ کی نفرت نکل گئی اور اس کی جگہ میرا دل آپؐ کی محبت سے لبریز ہو گیا، اور میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم! آپؐ مجھے مکہ کا موذن مقرر کر دیجیے، آپؐ نے انکی درخواست منظور کر لی اور ابو محذورہؓ تمام عمر مسجد حرام کے موذن رہے، ابو محذورہؓ کے بعد ان کی اولاد در اولاد تک یہ منصب قائم رہا (سیرت المصطفیٰ ج ۳ ص ۷۹)

ثمامہ بن آثال پر رحم وکرم:

ثمامہ بن آثال بنی حنیفہ کا سردار تھا، ایک لڑائی میں یہ گرفتار ہو کر آیا، مسلمانوں نے اسے مسجد کے ستون سے باندھ دیا، تاکہ مسلمانوں کی نماز اور بارگاہ الٰہی میں مسلمانوں کے عجز و نیاز کا منظر دیکھ کر اس کے دل کی سختی دُور ہو جائے اور حق سے نفرت کا جذبہ محبت میں بدل جائے۔ چنانچہ جب نماز کا وقت آیا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص کے پاس سے گذرے اور اس سے فرمایا، ثمامہ! میرے متعلق تمھارا کیا خیال ہے؟ ثمامہ نے جواب دیا،

عندی خیر یامحمد! ان تقتل تقتل ذادم وان تنعم تنعم علی شاکر وان کنت ترید المال فسل منه ما شئت ——— "اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس خیر ہے اگر آپ مجھے قتل کریں گے تو ایک بیش قیمت جان کو قتل کریں گے اور اگر انعام فرمائیں گے تو ایک شکر گذار پر انعام فرمائیں گے اور اگر مال درکار ہو تو جتنا چاہیں حاضر کر دوں"۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ثمامہ کی بات سن کر خاموش ہو گئے، دوسرے دن پھر آپؐ نے اس غلام سردار سے پوچھا تو اس نے صرف اتنا کہا:

"اگر آپؐ رحم وکرم فرمائیں تو ایک شکر گذار پر احسان ہوگا" ——— آپؐ پھر خاموشی سے گذر گئے۔

تیسرے روز پھر آپؐ نے پوچھا تو اُس نے دوسرے روز کا جملہ دہرا دیا ۔۔۔۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے عفو و کرم کا اعلان فرما دیا اور ثمامہ کو آزاد کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:
قَدْ عَفَوْتُ عَنْكَ يَا ثمامة و أَعْتَقْتُكَ ۔۔۔۔ "اے ثمامہ! میں نے تجھے معاف کیا اور آزاد کیا"

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ثمامہ پر نہ مذہب قبول کرنے کے لئے دباؤ ڈالا، نہ کسی قسم کا لالچ دے کر اسے مسلمان ہونے پر آمادہ کیا، بلکہ بغیر کسی شرط کے اسے معاف کر دیا۔
ثمامہ پر آپؐ کے اخلاقِ کریمانہ کا اتنا اثر پڑا کہ وہ مسجد نبوی کے قریب ایک باغ میں گیا اور وہاں نہا دھو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام قبول کر لیا۔
ثمامہؓ مسلمان ہو کر مکہ آیا، مکہ والوں نے اسے بے دین قرار دے کر بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا اس نے غصہ میں آکر یہ اعلان کر دیا کہ میں اپنی بستی یمامہ سے تمہارے پاس غلہ نہیں آنے دونگا۔
مکہ والوں کا گذارہ یمامہ سے آنے والے اناج پر ہوتا تھا، چنانچہ اناج بند ہو جانے سے مکہ میں قحط پڑ گیا۔
مکہ والوں نے پریشان ہو کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھا کہ ہم اپنی رشتہ داری کا واسطہ دے کر آپؐ سے درخواست کرتے ہیں کہ آپؐ ثمامہ کو حکم بھیج دیں کہ حسبِ دستور یمامہ سے غلہ کی آمد شروع ہو جائے، رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ والوں پر رحم فرمایا اور ان کے ظالمانہ رویہ کے باوجود ان کے لئے یمامہ سے غلہ بھجوانا شروع کر دیا (فتح الباری ج ۸ ص ۶۸)

مکہ میں قحط اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا رحم و کرم:

اوپر مکہ کے جس قحط کا ذکر کیا گیا ہے، قرآنِ کریم کی سورۂ دخان پارہ ۲۵ میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مفسرین نے ان آیات کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب مکہ والوں کے ظلم و تشدد نے انتہائی سفاکی اور درندگی کی شکل اختیار کر لی تو رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا تعالیٰ سے دُعا فرمائی کہ ان لوگوں کو قحط کی آزمائش میں ڈال کر انھیں ایک تنبیہ کر دے، شاید یہ

لوگ اس آسمانی تنبیہ سے ڈر کر اپنے ظلم و تشدد سے باز آجائیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دُعا پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ۙ يَّغْشَى النَّاسَ ۚ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ۝ اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ۝ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ۝ اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ ۝ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ۝ —— "اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)! تم اس دن کا انتظار کرو جب آسمان کی طرف ایک نظر آنے والا دھواں نمودار ہو اور وہ ان مکہ والوں کے لئے ایک تکلیف دہ سزا ہوگی اس وقت یہ کہیں گے، اے پروردگار! ہم سے اس تکلیف کو دُور کر دے، ہم تیرے نبی کی صداقت کو تسلیم کرلیں گے۔ لیکن ان لوگوں کو نصیحت کب ہوسکتی ہے؟ ان کے پاس تو ایک ظاہر اور کھلی شان کا نبی آیا اور انھوں نے اب تک اس سے اعراض کیا، اور یہی کہتے رہے کہ یہ شخص تو دوسروں کا پڑھایا ہوا ایک دیوانہ ہے، اے مکہ والو! ہم تمھاری درخواست پر اس سزا کو دُور کردیں گے، تھوڑی مدت کے لئے، مگر تم پھر اپنی پہلی حالت (نافرمانی) پر لوٹ آؤ گے، پھر اس عہد شکنی کے بعد ہم جب (قیامت کے دن ایک شدید گرفت میں پکڑیں گے تو اس روز ان کی مسلسل نافرمانیوں کا بدلہ لیں گے۔"

قرآنِ کریم کی اس پیشین گوئی کے مطابق مکہ والوں کی آزمائش شروع ہوئی، ایک طرف اس ریگستانی علاقہ میں جو تھوڑی بہت بارش ہوتی تھی وہ بند ہوگئی دوسری طرف یمامہ کے سردار ثمامہ رضؓ نے یمامہ سے آنے والا غلّہ روک دیا۔

اس قحط سے مکہ میں بھوک پھیل گئی اور بھوک کی شدّت سے لوگوں کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھانے لگا، اور آسمان کی طرف بھی انھیں دھواں سا نظر آنے لگا۔

اس شدید پریشانی سے تنگ آکر قریش کے سردار ابوسفیان نے دوسرے سرداروں کو ساتھ لے کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ داری کا واسطہ دے کر رحم وکرم کی درخواست کی اور عرض کیا، اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، آپ تو اپنے آپ کو رحمۃ للعالمین کہتے ہیں، حالانکہ آپؐ کی قوم قحط

اور خشک سالی سے تباہ ہو رہی ہے، ہم آپؐ کو قرابت داری کا واسطہ دے کر آپؐ سے دعا کی درخواست کرتے ہیں، اگر آپؐ کی دُعا سے یہ قحط دُور ہو گیا تو ہم ایمان لے آئیں گے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان ظالموں کی تنگ حالی دیکھ کر ان پر ترس آ گیا اور آپؐ نے مکّہ والوں کے لئے جس آزمائش کی دعاء کی تھی اس کا مقصد بھی بس اتنا ہی تھا، اس لئے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب سے دُعا کی اور خدا تعالیٰ نے آپؐ کی دعاء سے صحرائے حجاز میں بارانِ رحمت شروع کر دی۔

اسی کے ساتھ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ثمامہ بن اثال کو یمامہ سے غلّہ بھیجنے کی ہدایت فرما دی اور اس طرح مکہ والے قحط کی سزا سے بچا لئے گئے۔

لیکن مکہ والوں نے اس آزمائش سے کوئی سبق نہ سیکھا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمانہ کا یہ اہم واقعہ بھی ان کے دلوں کی سختی کو نہ توڑ سکا، ابوسفیان جو حق کو تسلیم کرنے کا وعدہ کر کے گیا تھا، اس سے پھر گیا اور قرآن کریم نے جو پیشین گوئی کی تھی وہ پوری ہو گئی۔

علامہ محمود آلوسی بغدادی نے روح المعانی میں سورۂ دخان کی تفسیر کرتے ہوئے یہ تمام حالات بیان کئے ہیں اور حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر ج ۴ ص ۱۳۸ میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کا بیان نقل کیا ہے جس میں ابن مسعودؓ نے سورۂ دخان کی آیات بالا کی تشریح کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ جو لوگ ان آیات کا تعلق علامات قیامت سے قائم کرتے ہیں ان کی رائے صحیح نہیں ہے بلکہ ان آیات کا تعلق مکہ معظمہ کے اس قحط سے ہے جو تنبیہ کے طور پر ان پر مسلط کیا گیا تھا اور خدا تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حسنہ کو ان دشمنوں کے سامنے ایک مرتبہ پھر واضح کر کے ان پر اتمامِ حجت کی تھی۔

حافظ ابن کثیر نے سورۂ مومنون (ج ۳ مصری ص ۲۵۲) میں حضرت ابن عباسؓ سے بھی یہی بیان نقل کیا ہے، فرماتے ہیں۔

جاء ابوسفیان الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، فقال یا محمد! انشدك اللہ

"ابو سفیان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ——— والرحم، فقد اکلنا العلھز یعنی الوبد والدم
کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا، اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) میں آپؐ کو اللہ اور رشتہ داری کا واسطہ دے کر کہتا ہوں، ہم لوگ بھوک سے تنگ آکر خون اور نجاست کھانے پر مجبور ہو رہے ہیں۔"

بعض اردو تفسیروں اور تاریخوں میں مکہ معظمہ کے قحط کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش مکہ کے لئے یہ بد دعا فرمائی حالانکہ حضور اکرمؐ نے جو الفاظ فرمائے وہ حسب ذیل ہیں، ابن کثیر نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا۔

اَللّٰھُمَّ اَعِنِّیْ عَلَیْھِمْ بِسَبْعٍ کَسَبْعِ یُوْسُفَ ——— "الٰہی قریش کے مقابلہ میں میری مدد فرما، ایسے سات سالوں کے ذریعہ جیسے سات سال حضرت یوسف کے عہد میں مصر والوں کے لئے پیدا کئے گئے تھے۔" ——— حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب واضح ہے کہ آپؐ مکہ والوں کے حق میں خشک سالی کے وہ حالات چاہتے تھے جو مصر میں حضرت یوسفؑ کے عہد میں پیدا ہوئے تھے اور حضرت یوسفؑ کی دانش مندی اور جذبۂ خدمت کے ذریعہ ان سات سالوں کی خشک سالی کی تکلیف سے مصر والے محفوظ رہے تھے، آپؐ بھی یہی چاہتے تھے کہ مکہ کے ستم گاروں پر خشک سالی کی حالت طاری ہو اور پھر وہ لوگ اس سے تنگ آکر نبی صادق کی طرف رجوع کریں اور خدا کا رسول ان کے حق میں دُعا کرے اور مکہ والے بغیر کسی شدید مصیبت میں گرفتار ہوئے اس امتحان سے نجات پائیں اور پھر خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احسان سے متاثر ہو کر انکار و ظلم کی لعنت سے توبہ کرلیں۔

اسی لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی درخواست میں یہ نہیں فرمایا کہ قریش مکہ کو ہلاک کردے بلکہ یہ فرمایا کہ خداوندا! میری مدد فرما قریش کے مقابلہ میں (الخ)

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قحط کا آغاز ہوتے ہی سردارانِ قریش کی درخواست پر دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دیئے اور خدا تعالیٰ نے بھی فوراً آپؐ کی دعا قریش کے حق میں قبول فرمائی، حالانکہ خدا تعالیٰ کے علم میں تھا کہ قریشِ مکہ اس قحط سے نجات پا کر بھی اپنے ظلم و فساد سے باز نہیں آئیں گے،

مگر خدا تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا قبول فرما کر قریش پر ایک مرتبہ پھر اتمامِ حجت کر دیا۔

حاصل یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کو قریش کے لئے ہلاکت کی بددعا نہیں کہا جا سکتا بلکہ سرکشی سے باز رکھنے کے لئے آزمائش میں ڈالنے کی درخواست کہا جا سکتا ہے، جس آزمائش میں قریشِ مکہ ناکام ثابت ہوئے۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے خصائص کبریٰ (ترجمہ اُردو مطبوعہ حیدر آباد ص ۳۹۴) میں بحوالہ بیہقی عن ابن مسعودؓ مذکورہ روایت کے سلسلہ میں یہ جملہ بھی نقل کیا ہے کہ جب ابوسفیان کی درخواست پر رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بارگاہِ الٰہی میں مکہ معظمہ کے لئے بارانِ رحمت کی دُعا کی تو اس دعاء کے بعد سات سال تک مکہ میں بارش کا سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بارگاہِ حق میں یہ درخواست کرنی پڑی۔

اَللّٰهُمَّ حَوَالَيْنَا لَا عَلَيْنَا ——— "خداوندا! چاروں طرف برسے ہم پر نہ برسے۔"

اس دعاء کے بعد بارش کا سلسلہ ختم ہوا ——— اس روایت سے معلوم ہوا کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء سے تھوڑے عرصہ کی خشک سالی کے بعد سات سال تک بارش ہوتی رہی جس نے تمام صحرائے حجاز کو شاداب کر دیا۔

حملہ آور قاتل پر رحم و کرم :

حضرت جابرؓ اور حضرت قتادہؓ کا بیان ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض دشمنوں نے ایک دیہاتی (غورث ابن حرث) کو آپؐ کے قتل کرنے کے لئے بھیجا، یہ شخص موقعہ کی تلاش میں رہا اتفاق سے ایک سفر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک سایہ دار درخت کے نیچے دوپہر کے وقت آرام فرما رہے تھے اور آپؐ کے صحابہ ادھر ادھر درختوں کے سایے میں آرام کر رہے تھے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تلوار درخت کے اوپر لٹکا دی تھی ——— اس حالت میں یہ اعرابی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا اور درخت میں سے آپؐ کی تلوار اُتار کر آپؐ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا، اور آپؐ کے سامنے آکر بولا: ——— مَنْ يَمْنَعُكَ مِنِّي ؟ "آپؐ کو مجھ سے کون بچائیگا؟"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ" بچائے گا۔

غورث نے تین دفعہ آپ ﷺ کو للکارا اور آپ ﷺ نے ہر دفعہ فرمایا، اللہ مجھے بچائے گا تیسری دفعہ جب آپ ﷺ نے کہا "اللہ" ——— تو غورث کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی ——— حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً اصحابہ کرام کو آواز دی، صحابہ کرام جمع ہو گئے ——— غورث آپ ﷺ کے پہلو میں کھڑا تھا ——— حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غورث کو چھوڑ دیا اور اس سے کسی قسم کا انتقام نہیں لیا۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے اس آیتِ کریمہ میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ هَمَّ قَوْمٌ أَنْ يَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ (مائدہ) ——— "خدا کے اس احسان کو یاد کرو جب کچھ لوگوں نے تم پر ہاتھ چھوڑنا چاہا تو خدا تعالیٰ نے ان کا ہاتھ روک دیا۔" (ابن کثیر ج ۲، ص ۳۱)

محمد بن کعب قرظی نے ایک واقعہ اسی قسم کا اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک دشمن نے کسی سفر میں درخت کے نیچے آرام کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تلوار سے حملہ کرنے کا ارادہ کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ——— آپ ﷺ کو اب مجھ سے کون بچائے گا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ تعالیٰ" ——— یہ سن کر اس اعرابی کے ہاتھ کانپنے لگے اور اس کے ہاتھ سے تلوار گر گئی اور اس کا سر درخت سے ٹکرا گیا اور اس کا بھیجا نکل گیا۔ (وضرب برأسه الشجرة حتى انتثر دماغه)

اس پر یہ آیتِ پاک نازل ہوئی۔

وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ——— "خدا تعالیٰ اے رسول! تمہاری حفاظت کرے گا۔"

جابر بن عبداللہ انصاری نے ایک واقعہ یہ بھی بیان کیا ہے کہ ایک غزوہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کنوئیں میں پیر لٹکائے رونق افروز تھے، اس حالت میں قبیلہ بنی نجار کے ایک شخص حارث نے آپ ﷺ کو دیکھ لیا اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر کے آتا ہوں، وہ بولے کیوں کر قتل کرے گا؟ یہ بولا میں ان سے تلوار مانگ لوں گا اور پھر قتل کر دوں گا۔

یہ پروگرام بنا کر حارث حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپؐ سے کہا:

یا محمد! اعطنی سیفک اشیمہ ـــــــ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! مجھے اپنی تلوار دینا، میں اسے نیام میں ڈال دوں" ـــــــ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تلوار اسے دیدی۔

حارث نے تلوار ہاتھ میں لے تو لی مگر فوراً ہی اس کے ہاتھ کانپنے لگے، یہاں تک کہ اس کے ہاتھ سے تلوار گر گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حال اللہ بینک وبین ما ترید ـــــــ "حارث! تیرے اور تیرے بُرے ارادوں کے درمیان خدا حائل ہو گیا" (ابن کثیر ج ۲، ص ۹۷)

امام غزالیؒ نے ایک واقعہ اس طرح لکھا ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ ذات الرقاع سے واپس آرہے تھے کہ کسی مقام پر آپؐ نے آرام فرمایا، صحابہ کرام بھی اپنی اپنی جگہ سو گئے۔ اس موقع پر ایک دشمن تلوار سونت کر آپؐ کے سر پر کھڑا ہو گیا اور بولا من یمنعک منی؟ ـــــــ "تم کو مجھ سے کون بچائے گا؟" ـــــــ آپؐ نے فرمایا اللہ ـــــــ یہ سن کر اس کے ہاتھ سے تلوار گر گئی، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پکڑ لیا، اور پھر اس سے پوچھا اب تجھے مجھ سے کون بچائے گا؟ وہ بولا: کن خیر اخذ ـــــــ تم بہتر پکڑنے والے ہو جاؤ۔ آپؐ نے فرمایا ـــــــ قل اشہد ان لا الہ الا اللہ وانی رسول اللہ ـــــــ اقرار کر لے توحیدِ الٰہی اور میری رسالت کا۔ وہ بولا، نہیں، ایمان نہیں لاؤں گا، ہاں، نہ میں آپؐ کا مقابلہ کروں گا، اور نہ لڑنے والوں کا ساتھ دوں گا یعنی غیر جانبدار رہوں گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے چھوڑ دیا، پھر یہ شخص اپنے گھر والوں کے پاس آیا اور کہا: جئتکم من عند خیر الناس ـــــــ "میں تو اس شخص کے پاس سے آیا ہوں جو تمام لوگوں سے بہتر ہے" (احیاء العلوم ج ۲ ص ۳۳۵ و فتح الباری ج ۳ ص ۱۲۷)

میدانِ حنین میں شیبہ پر رحم و کرم:

شیبہ بن عثمان کا بیان ہے کہ میدانِ حنین میں میں نے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حال میں

دیکھا کہ آپؐ تنہا کھڑے ہیں اور آپؐ کے ساتھیوں کے پیر اکھڑ چکے ہیں، اس وقت میری نیت خراب ہوئی اور میں آپؐ کو قتل کرنے کے ارادہ سے آپؐ کی طرف لپکا۔

پہلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں طرف گیا تو اس طرف حضرت عباسؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھڑا پایا، میں نے دل میں کہا: یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں، یہ بھتیجے کو بچانے کے لئے جان کی بازی لگادیں گے۔ پھر میں بائیں طرف گیا تو ادھر ابوسفیان بن حارث کو کھڑا پایا میں نے انھیں دیکھ کر اپنے جی میں کہا، یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے چچیرے بھائی ہیں، یہ بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بچانے کے لئے پوری طاقت لگادیں گے، پھر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے آیا اور آپؐ کے عقب کو خالی پاکر آپؐ پر تلوار کا وار کرنا چاہا۔

اِذْ رُفِعَ لِیْ شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ بینی وبینه کانه برق فخفت ان یغشنی فوضعت یدی علی بَصَرِیْ ــــــ "بس اچانک آگ کا ایک شعلہ مجھے بلند ہوتا نظر آیا گویا کہ ایک بجلی کوندی، پس میں ڈرا کہ کہیں مجھے جھلس نہ دے اور میں نے ڈر کر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا" ــــــ اور پھر میں پیچھے ہٹ گیا، سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی وقت احساس ہو گیا اور آپؐ نے مڑ کر مجھے دیکھا اور مجھے آواز دے کر کہا:

یا شیبہ یا شیبہ اُدن منی اللھم اذھب عنہ الشیطان ــــــ "اے شیبہ، اے شیبہ، میرے قریب آ، الٰہی! شیبہ کے اندر سے شیطان کو دُور کر دے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر میں نے آپؐ کی طرف دیکھا:

وَلَھُوَ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ سَمْعِیْ وَبَصَرِیْ ــــــ "تو اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے نزدیک میری آنکھوں اور میرے کانوں سے بھی زیادہ محبوب تھے۔"

مطلب یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ہی نظر محبت اور نگاہِ کرم نے میرے دل کی دنیا بدل دی اور آپؐ پر ہزار جان سے عاشق ہو گیا۔

یہ روایت امام احمدؒ نے اپنی مسند میں حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی ہے امام بیہقی نے

مصعب بن شیبہ سے نقل کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شیبہ کے سینہ پر ہاتھ مارا اور تین دفعہ دعا ردے کر فرمایا ـــــــ اَللّٰھُمَّ اھْدِ شَیْبَۃَ ـــــ "الٰہی! شیبہ کو ہدایت فرما" شیبہ کہتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعاء کے بعد میرے سینہ میں آپؐ سے زیادہ کسی دوسرے کی محبت نہ تھی (ابن کثیر سورہ توبہ ج ۲ ص ۳۴۵)

حضرت حمزہؓ کے قاتل وحشی پر لطف وکرم:

قریش کے مشہور سردار جبیر بن مطعمؓ کے غلام "وحشی" نے اُحد کے معرکہ میں حضرت حمزہؓ کو شہید کیا، مکہ معظمہ فتح ہونے کے بعد یہ وحشی قتل کیے جانے کے خوف سے طائف چلا گیا، طائف والوں کے اسلام قبول کرنے کے بعد وحشی کا بیان ہے کہ میں شام یا یمن کی طرف بھاگنے کی بات سوچنے لگا اور مجھ پر خدا کی زمین تنگ ہونے لگی۔

میں اسی پریشانی کے عالم میں تھا کہ ایک شخص مجھ سے بولا:

ویحك انه واللہ ما یقتل احدا من الناس دخل فی دینه وتشهد بشهادته ـــــــ "تجھ پر افسوس! وہ شخص (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کسی کو قتل نہیں کرتا جو اس کے دین میں داخل ہو جاتا ہے اور اس کے رسول ہونے کی گواہی دیتا ہے"

یہ خوشخبری سُن کر میں سیدھا سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ حاضر ہوا اور آپؐ کے پیچھے کھڑا ہو گیا تاکہ کلمۂ شہادت کا اعلان کر دوں، آپؐ نے فوراً مجھے دیکھ لیا اور کسی طرح پہچان لیا، پھر فرمایا:

اَوَحْشی؟ قلت نعم یا رسول اللہ ﷺ فقال اقعد فحدثنی کیف قتلت حمزۃ فحدثته، فلما فرغت من حدیثی قال ویحك! غیب عنی وجهك فلا ارینك ـــــــ "کیا تو وحشی ہے؟ میں نے کہا، جی ہاں فرمایا، بیٹھ جا اور جس طرح تو نے چچا حمزہؓ کو قتل کیا تھا، اس کی کیفیت بیان کر، میں نے ساری کیفیت بیان کی، پھر آپؐ نے فرمایا: افسوس! وحشی بس تو مجھ سے اپنا چہرہ چھپالے۔ وحشی کا بیان ہے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تک آپؐ کی

خدمت میں حاضر نہیں ہوا۔" (سیرۃ ابن ہشام ج ۳ ص ۷۶)

غور کرو! یہ محبوب چچا کا قاتل ہے، حمزہؓ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بہادر چچا تھے۔ دودھ شریک بھائی بھی تھے، چچا کی دردناک شہادت پر رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو بے حد رنج ہوا تھا اور آج آپؐ ان کے قاتل سے انتقام لینا چاہتے تو لے سکتے تھے، پھر وحشی ایک غلام تھا کوئی آزاد خاندانی عرب نہ تھا، اس کے آقا نے حمزہؓ کے قتل کرنے کے بعد اسے آزاد کر دیا تھا، اس لئے اب کوئی اس کا یار و مددگار نہ تھا۔

پھر ہر مسلمان آرزومند تھا کہ عمِّ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قاتل کا سر میں اپنے ہاتھ سے قلم کر کے اپنے آقا کو خوش کروں ——— لیکن رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم اس پر لطف و کرم فرماتے ہیں اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ میں اپنے پیارے چچا کی دردناک شہادت کو بھولا نہیں ہوں۔

بھول جاتا تو معاف کرنے میں کیا کمال ہوتا ——— حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے منہ سے وہ داستان پھر سنتے ہیں، اپنے زخموں کو تازہ کرتے ہیں اور پھر اسے عفو و کرم سے نوازتے ہیں اور صرف یہ خواہش کرتے ہیں کہ مجھ سے اپنا چہرہ چھپا لے۔

ظاہر ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں ایک حساس اور دردمند دل تھا، ایک شریف فطرت تھی، اگرچہ آپؐ حکمِ الٰہی کے تحت وحشی کو معاف فرماتے ہیں، لیکن عزیزوں اور دوستوں کی تکلیفوں کو یاد کرنے والی فطرت کو بدلنا، آپؐ کے بس کی بات نہ تھی، وحشی جب آپؐ کے سامنے آتا، آپؐ کے زخم ہرے ہو جاتے، اس سے آپؐ کو تکلیف ہوتی اور وحشی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچانے کا گناہ کماتا رہتا، اس بناء پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خواہش کی ——— وحشی اپنے محسن آقا کا حکم سن کر چلا آیا، وہ سچا مومن بن گیا تھا، یہ دُعا کرتا رہا کہ خدایا! مجھ سے کوئی ایسی نیکی کرا دے جس سے میں آخرت میں اپنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سرخرو ہو کر جاؤں اس کی دعا قبول ہوئی، نبوت کا جھوٹا مدعی مسیلمہ اسی کے ہاتھ سے مارا گیا، بدترین دشمنِ نبوت کو انہی ہاتھوں سے قتل کیا جن سے ایک محبوبِ نبوت قتل ہوئے تھے ——— وحشی سرخرو ہو گیا۔

ہندہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت اور مہربانی:

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر مکہ کے لوگوں نے اسلام کی بیعت کرنی شروع کی مردوں کے بعد عورتیں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، ان عورتوں میں ابوسفیان کی بیوی ہندہ بھی آئیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری باتوں کے ساتھ جب ان سے اس بات کا عہد لیا کہ آئندہ تم اپنی اولاد کو قتل نہ کرنا تو ہندہ بولیں ——— حضور صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے جس اولاد کو پالا پوسا، آپؐ نے اسے بدر کے میدان میں قتل کر دیا ——— بس آپؐ جانیں اور وہ جانیں ——— ہندہ عورت تھیں، اپنی فطرت کے مطابق انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بدر کے معرکہ کا طعنہ دیا حضرت عمرؓ اس وقت موجود تھے، وہ ہنس پڑے، پھر آپؐ نے ہندہ سے عہد لیا کہ کسی پر بہتان نہ باندھنا ——— ہندہ بولیں ——— وما تامرنا الا بالرشد ومکارم الاخلاق "خدا کی قسم! آپؐ ہمیں بھلائی اور بلند اخلاق کی تعلیم دے رہے ہیں" ———

ہندہ نے حاضری کے وقت اپنے چہرہ پر نقاب ڈال رکھی تھی اور شرم کی وجہ سے اپنا منہ چھپا رکھا تھا، کیونکہ ہندہ وہ سفاک خاتون تھیں جنھوں نے آپؐ کے پیارے چچا کو قتل کرایا تھا اور ان کا سینہ چاک کر کے ان کا کلیجہ چبایا تھا، لیکن رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس سنگین جرم کو نظر انداز کر کے ان پر عفو و کرم فرمایا اور ان کے حق میں دعا فرمائی۔

امام بخاریؒ نے بیعت کے بعد ہندہ کی جو گفتگو نقل کی ہے وہ یہ ہے: ما کان علی ظھر الارض من اھل خباء احب الیّ ان یذلوا من اھل خباءک ثم ما اصبح الیوم علی ظھر الارض اھل خباء احب الیّ ان یعزوا من اھل خباءک قال ایضاً والذی نفسی بیدہ (بخاری شریف ص ۵۳۹) ——— "یعنی روئے زمین کے تمام خیمہ والوں میں (تمام کنبہ والوں میں) آپؐ کے کنبہ والے تھے جن سے مجھے سب سے زیادہ بغض تھا اور میری یہ تمنا رہا کرتی تھی کہ وہ ذلیل ہوں اب یہ جذبہ بدل گیا، اب روئے زمین کے تمام خاندانوں میں سب سے زیادہ عزیز خاندان جس کے متعلق میری سب سے زیادہ تمنا یہ ہے کہ ان کی عزت ہو اور ان کی عظمت بڑھے وہ آپؐ کا

خاندان ہے ________ ہندہ کے جواب میں رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب یہ تھا ________ وایضًا والذی نفسی بیدہ الخ ________ سُن اس ذات کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ یہی کیفیت ادھر بھی ہے۔

مہاجرین کے چھوڑے ہوئے مکان مکہ والوں کے حوالہ کر دیئے:

صحابہ کرام ہجرت کے وقت اپنے مکانات، دکانیں اور زمین اور دوسرے املاک مکہ میں چھوڑ کر گئے تھے اور ان پر مکہ والوں نے قبضہ کر لیا تھا، اب صحابہ کرام رضؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ سوال رکھا کہ ہماری املاک مکہ والوں سے واپس دلائی جائیں۔

رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی ابو احمدؓ کو بلا کر ان کے کان میں چپکے سے کچھ کہا: انھوں نے اپنے مکان کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا، جسے ابو سفیان نے چار سو دینار میں فروخت کر دیا تھا، ابو احدؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سُن کر خاموش ہو گئے، لوگوں نے ابو احد سے پوچھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا، انھوں نے جواب دیا، آپؐ نے مجھ سے فرمایا:

ابو احد، اگر تم صبر کرو تو اچھا ہو، خدا تعالیٰ اس کے بدلے میں تمھیں جنّت میں مکان عطا فرمائیگا۔

میں نے عرض کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم! میں صبر کروں گا۔

پھر آپؐ نے دوسرے صحابہ کرام رضؓ سے بھی فرمایا، جو مال خدا کی راہ میں جا چکا ہے میں اس کی واپسی کو پسند نہیں کرتا، یہ سنتے ہی صحابہ کرام رضؓ خاموش ہو گئے۔

وہ مکان جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ہوئی تھی اور جس مکان میں حضرت خدیجہ رضؓ کے ساتھ آپؐ کی شادی ہوئی تھی آپؐ نے اپنے اس ذاتی مکان کا تذکرہ بھی مناسب نہیں سمجھا ________ (سیرت المصطفیٰ بحوالہ الصارم المسلول ص ۱۵۴)

سردارانِ قریش کے لئے عفو و کرم:

فتح مکہ کے بعد قریش کے کچھ بڑے سردار اپنے جرم کا احساس کر کے قتل کے خوف سے مکہ چھوڑ کر چلے گئے، ان میں سے ایک ابو جہل کا لڑکا عکرمہ بھی تھا۔

عکرمہ کے بھاگ جانے کے بعد ان کی بیوی ام حکیم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اسلام سے مشرف ہوگئیں، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے شوہر کے لئے امن کی درخواست کی، رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس درخواست کو فوراً قبول کر لیا، عکرمہ مکہ سے بھاگ کر یمن جانے کے لئے ساحل پر پہنچے اور ایک کشتی میں سوار ہو گئے، اتفاق سے ان کی کشتی بھنور میں آگئی، انھوں نے اپنے مشرکانہ عقیدہ کے مطابق اپنے دیوتاؤں (لات وعزّیٰ) کو مدد کے لئے پکارا، کشتی کے سواروں میں سے کسی اللہ کے بندے نے کہا، اس موقعہ پر نقلی خدا کچھ کام نہ دیں گے، خدائے واحد کو پکارو، خدا کی توحید کی سربلندی کا تماشا یہ مکہ کے اندر اسلام کی فتح کی صورت میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئے تھے، اس آواز نے ان کے دل پر ایک اور چوٹ لگائی، فوراً بولے اگر دریا میں خدائے واحد کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں آسکتا تو پھر خشکی میں بھی اس کے سوا کوئی کام آنے والا نہیں اور یہ کہہ کر خدا کی طرف متوجہ ہوئے اور یہ دعا کی:

اللھم لك عھد ان عافیتنی مما انا فیہ اَن اٰتی محمدا حتی اضع یدی فی یدہ فلاجد نہٗ عفوًّا غفورًا کریمًا ——— "خداوندا! میں تجھ سے عہد کرتا ہوں کہ اگر تو نے اس پریشانی سے مجھے نجات دیدی تو میں تیرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں گا اور ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے دوں گا اور ضرور میں انھیں معاف کرنیوالا اور مہربان پاؤنگا"

ادھر یہ ہوا کہ اسی پریشانی کے عالم میں عکرمہ کی بیوی ام حکیم ان کے پاس پہنچ گئیں اور انھیں آواز دے کر بتایا کہ:

یا ابن عم جئتك من ابر الناس واوصل الناس وخیر الناس لاتھلك نفسك انی قد استامنت لك رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ——— "اے ابن عم! میں تیرے پاس اُس شخص کی جانب سے آئی ہوں جو تمام لوگوں میں سب سے زیادہ نیک، سب سے زیادہ مہربانی کرنے والا، سب سے زیادہ بہتر ہے، تو اپنے آپ کو ہلاک نہ کر، میں نے تیرے لئے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے امن حاصل کر لیا ہے" ——— عکرمہ یہ سن کر کشتی سے اتر آیا اور ام حکیم کیساتھ

روانہ ہو گیا ـــــ ادھر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعہ یہ معلوم ہو گیا کہ عکرمہ خدمت اقدس میں حاضر ہو رہا ہے، آپؐ نے صحابہ کرام سے فرمایا:

یا تیکم عکرمۃ مومنا فلا تسبوا اباہ فان سب المیت یوذی الحیّ ـــــ

"لوگو! عکرمہ تمہارے پاس مومن بن کر آ رہا ہے، پس تم اس کے باپ (ابوجہل) کو بُرا بھلا نہ کہنا، کیونکہ مُردہ کو بُرا کہنے سے زندہ کو تکلیف ہوتی ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نصیحت میں اسلامی اخلاق کی تعلیم دی، ایک زندہ دوست کی دلداری کی خاطر مردہ دشمن کو بُرا بھلا کہنے سے روک دیا، ابوجہل بدترین دشمن حق تھا، اس کے کارنامے انتہائی نفرت انگیز تھے اس پر جس قدر بھی اظہار نفرت کیا جاتا کم تھا مگر باپ کو بُرا کہنے سے بیٹے کو قدرتی طور پر تکلیف پہنچتی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا احساس کیا، عکرمہ انسانی نفسیات سے خالی نہیں ہو سکتے تھے، اس لئے ان کی خاطر ضروری تھی اور ماضی کے حالات پر لعن طعن کرنے سے کوئی فائدہ پہنچنے والا بھی نہ تھا، یہ ہدایت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تدبر اور بالغ حکمت پر مبنی تھی۔

عکرمہ کی آمد:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ رضؓ کو یہ نصیحت فرما ہی رہے تھے کہ عکرمہ اپنی بیوی ام حکیم کے ساتھ تشریف لے آئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم انہیں دیکھ کر دوڑے۔

وثب الیہ وما علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم رداءٌ فرحاً بعکرمۃ ـــــ

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم دوڑ کر عکرمہ کی طرف بڑھے، خوشی کے مارے چادر شریف بھی نہ اوڑھی پھر عکرمہ کو اپنے سامنے بٹھا لیا۔"

عکرمہ کے پاس ام حکیم بیٹھی ہوئی تھیں، جن کے چہرہ پر نقاب پڑا ہوا تھا عکرمہ نے عرض کیا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! ام حکیم نے مجھے پیغام دیا ہے کہ آپؐ نے مجھے امن دیدیا ہے، آپؐ نے فرمایا: صدقت، فانت اٰمن ـــــ اس نے صحیح کہا تجھے امن ہے۔

پھر عکرمہ نے کہا، آپؐ کی دعوت کیا ہے؟ —— آپؐ نے فرمایا ادعوك الی ان تشهد ان لا اله الا الله وانی رسول الله وان تقیم الصلٰوة وتؤتی الزکٰوة وتفعل وتفعل حتی عد خصال الاسلام —— "یعنی توحید اور نبوت کا اقرار کرنے اور نماز روزہ اور اسلامی احکام کی پیروی کر" —— عکرمہ نے آپؐ کی دعوت کو قبول فرمالیا، اور عرض کیا۔

والله مادعوت الا الی الحق وامرٍ حسنٍ جمیل، قد کنت والله! فینا قبل ان تدعو الی مادعوت الیه وانت اصدقنا حدیثا وابرنا براً —— "حضور صلی اللہ علیہ وسلم! آپؐ جس پیغامِ حق کی دعوت دے رہے ہیں وہ حق ہے اور اچھا اور بہترین پیغام ہے خدا کی قسم آپؐ اس دعوت سے پہلے بھی ہم میں موجود تھے ہم نے اس وقت بھی آپؐ کو صادق القول، ہمدرد اور مہربان پایا"

ایک روایت میں عکرمہ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تجھ کو امن ہے۔

میں نے عرض کیا —— اشهد ان لا اله الا الله وحده لاشریك له وانت عبد الله ورسوله وانت ابرّ النّاسِ واصدق النّاس واوفی النّاس ——

میں یہ کہتا جا رہا تھا اور میرا سر شرم کے مارے جھکا ہوا تھا —— وانی لمطاطیٔ راسی استحیاءً مِنْهُ —— عکرمہ کہتے ہیں:

میرے اس اقرار و شہادت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا روئے انور خوشی سے چمک اٹھا

پھر میں نے عرض کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم! کوئی اچھا کلمہ مجھے تعلیم دیجیے۔

آپؐ نے فرمایا: —— یہ کلمہ شہادت ہی سب سے اچھا کلمہ ہے۔

عکرمہ بولے مجھے کچھ اور نصیحت کیجیے —— آپؐ نے فرمایا، اچھا کہو:

واشهد الله واشهد من حضرانی مسلم مجاهد مهاجرٌ —— (عکرمہ نے یہ جملے ادا کیے) یعنی میں گواہ بناتا ہوں اللہ تعالیٰ کو اور ان سب کو جو یہاں حاضر ہیں کہ میں مسلمان ہوں

مجاہد ہوں، مہاجر ہوں۔"

عکرمہ نے ان الفاظ سے اپنے خدا کو، اور تمام حاضرین کو اپنے ایمان، جہاد اور ہجرت پر گواہ بنایا ——— اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عکرمہ! آج تم مجھ سے جو سوال کرو گے میں اسے پورا کروں گا، مانگو، کیا مانگتے ہو۔

عکرمہ نے مال و دولت کا سوال نہیں کیا، ایمان و اسلام کی دولت نے انھیں بالکل بدل دیا تھا، ہاں ایک احساس انھیں تکلیف دے رہا تھا، کہ میں ایسی پاکباز، ہمدرد اور صداقت مآب ہستی کی آج تک مخالفت کرتا رہا، اس لئے عکرمہ نے جس چیز کا سوال کیا وہ یہ تھا:

فانی اسألك ان تستغفر لی کل عداوة عادیتکها او مسیر اوضعت فیه او مقام لقیتك فیه او کلام قلته فی وجهك او انت غائب عنه ———

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم! میں آپؐ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپؐ میرے لئے خدا تعالیٰ سے مغفرت اور معافی کی دعا کریں کہ میں نے آپؐ کی جو بھی مخالفت کی ہے جس جگہ بھی آپؐ کے خلاف کوشش کی ہے، جس مقام پر آپؐ کا مقابلہ کیا ہے، جو ناشائستہ بات آپؐ کے متعلق کہی ہے، آپؐ کے منہ پر یا آپ کے پیچھے، خدا تعالیٰ اسے معاف کر دے۔

سرکار نے وعدہ کے مطابق فوراً دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے اور فرمایا:

اللهم اغفرله کل عداوة عادانیها و کل مسیر سار فیه الی موضع یرید بذلك المسیر اطفاء نورك واغفر له ما قال منی عرض فی وجهی او انا غائب عنه فقال عکرمة رضیت یا رسول الله! ——— خداوندا! عکرمہ کی ہر دشمنی کو معاف کر دے، جو اس نے میرے ساتھ کی ہے اور اس نے جو قدم بھی تیرے نور کو بجھانے کے لئے اٹھایا ہے اسے بھی اور اس نے میرے ساتھ جو زیادتیاں کی ہیں، میرے سامنے یا میرے پیچھے انھیں بھی معاف کر۔"

عکرمہ اس دعا سے خوش ہو گئے اور کہا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم! اب میں مطمئن ہوں۔

اس کے بعد عکرمہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کیا ——— اما واللہ یا رسول اللہ! لا ادع نفقۃ کنت انفقتھا فی صد عن سبیل اللہ الا انفقت ضعفھا فی سبیل اللہ ولا قتالا کنت اقاتل فی صد عن سبیل اللہ الا ابلیت ضعفہ فی سبیل اللہ ——— حضور اصلی اللہ علیہ وسلم میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں نے جس قدر پیسہ راہِ حق میں رکاوٹ ڈالنے کے لئے صرف کیا، اس سے دوگنا اسلام کی سربلندی کے لئے صرف کروں گا۔ اور میں نے جس قدر اسلام کے خلاف جنگ کی ہے اس سے دوگنی طاقت اعلاء کلمۃ الحق کے لئے دوں گا (حیاتِ صحابہ ج ا ص ۱۵۰ بحوالہ کنز العمال ج ۸ ص ۵، مستدرک حاکم ج ۳ ص ۲۴۱)

عکرمہ کا وعدہ دل سے تھا وہ پورا ہوا۔ صدیقِ اکبر کے عہد میں اجنادین کی جنگ میں جہاد میں شریک ہوئے اور جام شہادت نوش فرمایا۔

صفوان بن امیہ پر رحم و کرم:

اسلام کے بدترین دشمنوں میں صفوان کا نام بھی نمایاں حیثیت رکھتا ہے، یہ آخر تک اسلام سے لڑتے رہے اور جب مکہ پر اسلام کی فتح کا جھنڈا نصب ہو گیا تو یہ مکہ سے بھاگ گئے۔ ان کی بیوی "نجوم بنت معدل" نے شوہر کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور وہ مسلمان ہو گئیں۔ صفوان اپنے غلام لیسار کے ساتھ مکہ سے نکل کر ایک پہاڑ کی گھاٹی میں چھپ گئے۔

حضرت عمیرؓ امن و امان قائم ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا! یا رسول اللہ! ہماری قوم کے سردار صفوان آپؐ کی کامیابی کو دیکھ کر مکہ سے بھاگ گئے اور وہ سمندر میں ڈوب کر خودکشی کرنا چاہتے ہیں، انھیں خطرہ ہے کہ آپؐ انھیں معاف نہیں کریں گے اور قتل کر دیں گے۔

فَاٰمِنْهُ فِدَاكَ اَبِیْ وَاُمِّیْ ——— "پس میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں انہیں آپؐ امن دے دیجیے" ——— سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا تامّل فرمایا:

قَدْ اٰمَنْتُهٗ ——— "میں نے اسے امن دے دیا"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے امن حاصل کر کے عمیر رض صفوان کی تلاش میں نکلے اور ایک گھاٹی میں صفوان کو پالیا ـــــ صفوان نے دور سے عمیر رض کو آتا دیکھ کر اپنے غلام یسار سے کہا:

وَیْحَكَ! اُنْظُرْ مَنْ تَرٰی؟ ـــــ "تجھ پر افسوس! دیکھ تو یہ کون آرہا ہے ـــ؟"

صفوان کی گھبراہٹ کو دیکھ کر غلام بولا، یہ تو عمیر بن وہب آرہے ہیں جو تمہارے قبیلے کے آدمی ہیں، صفوان نے کہا:

عمیر کو مجھ سے کیا واسطہ؟ یہ تو مجھے قتل کرنے آرہے ہیں۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مکہ پر پورا قبضہ کر چکے ہیں اور یہ ان کے ساتھی ہیں ـــــ عمیر رض جب قریب پہنچے تو صفوان نے مایوس ہو کر کہا:

عمیر رض! تم میرے ساتھ اتنا کچھ تو کر چکے، بال بچے چھوٹے، گھر بار چھوٹا، اب تم مجھے قتل کرنے آئے ہو ـــــ اپنے سردار کی مایوسی اور گھبراہٹ کو دُور کرتے ہوئے عمیر رض نے کہا:

میرے سردار! میں تجھ پر قربان جِئْتُكَ من ابر الناس واوصل الناس میں تو ایسے شخص کے پاس سے آیا ہوں جو لوگوں میں سب سے زیادہ نیک اور سب سے زیادہ احسان کرنے والے ہیں، خویش پرور ہیں۔

میں ان سے تمہارے لئے امن حاصل کر کے آیا ہوں صفوان کو اطمینان نہ ہوا کیونکہ ان کی ساری زندگی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کو تکلیفیں پہنچانے میں گذری تھی۔

صفوان نے اطمینان حاصل کرنے کے لئے کہا:

عمیر! تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے امن دینے کی کوئی سند لے کر آؤ، تاکہ میں مطمئن ہو سکوں، مجھے اطمینان حاصل نہیں ہو رہا۔

عمیر رض واپس آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے صفوان کا خوف وہراس اور بے اطمینانی پیش کی ـــــ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں بھی اپنے عفو وکرم کا مظاہرہ فرمایا اور فوراً اپنا عمامہ عطا فرما دیا۔

یہ عمامہ دراصل وہ یمنی چادر تھی جو سرکارِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے دن اپنے

سر سے لپیٹے ہوئے تھے[1] ــــ اور یہ چادر صفوان کے سامنے پیش کر کے کہا:

یا ابا وھب! جئتك من عند خیر الناس و اوصل الناس وابر الناس واحلم الناس مَجْدُہٗ مَجْدُكَ وعِزُّہٗ عزك وَمُلْكُہٗ ملكك۔ ابن امك وابیك۔ و اذكرك الله فی نفسك ــــ "اے ابو وہب! میں اس ذاتِ اقدس کی طرف سے آیا ہوں جو سب سے بہتر ہے، سب سے زیادہ بخشش کرنے والا ہے سب سے زیادہ نیک سب سے زیادہ بردبار ہے ــــ ارے صفوان! اس کا عروج تمہارا عروج ہے، اس کی عزت تمہاری عزت ہے اس کا اقتدار تمہارا اقتدار ہے ــــ وہ ددھیال اور ننھیال سے تمہارا عزیز ہے اور تمہارے دل میں خدا کی یاد پیدا کرنا چاہتا ہے۔"

صفوان پر پھر قتل کی دہشت سوار ہوئی اور بولا ــــ اَخَافُ اَنْ اُقْتَلْ "مجھے اپنے قتل کا اندیشہ ہے" ــــ اور پھر ساتھ ہی چادرِ پاک کو دیکھ کر کہا:

نعم ھو، ھو ــــ یہ وہی چادر ہے، وہی چادر ہے۔

صفوان نے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سرِ اقدس پر اسے دیکھا تھا جب آپؐ فاتحانہ جلال کے ساتھ مکہ میں داخل ہو رہے تھے۔

عمیرؓ نے پھر اطمینان دلایا اور صفوان ان کے ساتھ مکہ آ گئے۔

صفوان اور عمیرؓ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے ساتھ عصر کی نماز پڑھ رہے تھے۔

صفوان نے نماز کو دیکھ کر پوچھا:

کم یصلون فی الیوم واللیلۃ قال خمس صلوات قال یصلی بھم محمد؟ قال نعم!

---

[1] حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔ دخل فیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یومئذٍ متعجرًا بہ بردٌ حبرۃٌ یعنی فتح مکہ کے روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک یمن کی دھاری دار چادر کو سرِ اقدس سے لپیٹے ہوئے تھے اور اس کا ایک سرا آگے لٹکا ہوا تھا الاعتجار بالعمامۃ ھو ان یلفھا علی راسہ ویرد طرفھا علی وجھہ (حیات الصحابہ ج ۱ ص ۱۵۹)

"رات دن میں کتنی نمازیں ہیں؟ عمیر رضؓ نے کہا: پانچ صفوان بولا، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مسلمانوں کے ساتھ نمازیں پڑھتے ہیں؟ عمیر رضؓ نے کہا، ہاں!"

صفوان کا مطلب یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کا صرف مسلمانوں کو حکم دیتے ہیں یا خود بھی اس حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ عمیرؓ نے جواب دیا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو حکم دوسروں کو دیتے ہیں خود بھی اس کی تعمیل ان پر ضروری ہوتی ہے۔

صفوان اپنے ذہن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تصویر لے کر آئے ہوں گے کہ سرزمینِ عرب کا فاتح شہنشاہ تختِ شاہی پر با عظمت وجلال رونق افروز ہوگا، لوگ اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوں گے، وہ حکم دے رہا ہوگا اور لوگ اس کی تعمیل کر رہے ہوں گے۔

یہاں آکر صفوان نے بالکل دوسرا نقشہ دیکھا عرب کا وہ فاتح شہنشاہ خدا کے آگے سربسجود ہے اور لوگ بھی اس کے ساتھ خدا کے سامنے جھکے ہوئے ہیں، عرب کا وہ فاتح بطور امام کے عام مسلمانوں سے دو قدم آگے ہے، جس سے وہ اشارہ کر رہا ہے کہ لوگو! میں خدا کی عبادت میں تم سے دو قدم آگے رہوں گا، ہر بندگی میں تم مجھے سب سے آگے دیکھو گے۔

بس اسلام میں امامت کا یہی مطلب ہے، امامت و سرداری کے معنی یہ نہیں ہیں کہ لوگ اس کی پوجا اور پرستش کریں

صفوان عرب کے اس سردار کی نرالی سرداری دیکھ کر مسحور ہو گیا ——— اور سوال کیا، کیا ہر نماز میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کے ساتھ خود بھی عبادت کرتے ہیں؟

حضرت عمیر رضؓ نے صفوان کے جواب میں جو بات کہی قرآن نے جملہ پیغمبران علیہم السلام کے متعلق اس بات کو واضح کیا ہے کہ پیغمبر خود بھی احکامِ الٰہی کی پابندی پر مامور ہوتے ہیں۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سورۂ یونس میں یہ اعلان کیا گیا ——— وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ——— "مجھے خدا کی طرف سے حکم دیا گیا ہے کہ میں خود بھی ایمان لانے والوں میں سے ہو جاؤں"

سورۂ انعام میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اعلان نقل کیا گیا:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ——— "آپ کہہ دیجئے! میری نماز، قربانی اور مرنا جینا سب خدا کے لئے ہے جو رب العالمین ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں خدا کا سب سے پہلا فرمانبردار ہو جاؤں۔"

بہرحال جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو صفوان نے پہل کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آواز دی اور کہا:

یا محمد! ان عمیر جاءنی ببردك وزعم انك دعوتنی الی القدوم علیك فان رضیت امرًا والا سیرتنی شهرین ——— "اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ عمیر آپ کی چادر دکھا کر مجھے اپنے ساتھ لائے ہیں، یہ کہتے ہیں کہ اگر میں اسلام قبول نہ کروں تو پھر بھی مجھے دو ماہ کی مہلت مل سکتی ہے۔"

آپ نے صفوان کی گھبراہٹ دیکھ کر انھیں اطمینان دلاتے ہوئے کہا:

انزل یا ابا وھب! ——— ابو وہب تم سواری سے نیچے تو اترو ——— صفوان ابھی تک خوف وہراس میں مبتلا تھے، بولے: لا، واللہ؛ حتی تبین لی ——— "نہیں خدا کی قسم! میں نیچے نہیں اتروں گا، یہاں تک کہ آپ صاف صاف مجھے نہ بتلا دیں۔"

آپ نے فرمایا ——— دو ماہ کی مہلت نہیں، صفوان تمھیں چار ماہ کی مہلت دی جاتی ہے صفوان کو مہلت دے دی گئی۔

مہلت کے دوران صفوان غزوۂ حنین اور طائف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے یہ ابھی تک اپنے آبائی دین پر قائم تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے کسی قسم کا تعرض نہیں فرماتے تھے۔

غزوات سے فارغ ہو کر جعرانہ کے مقام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم مال غنیمت کا جائزہ لے رہے تھے، صفوان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی کھڑے تھے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بے اندازہ

مال غنیمت کو دیکھ رہے تھے کہ سازوسامان، اونٹوں اور بکریوں سے راستے بھرے پڑے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کنکھیوں سے صفوان کو دیکھا کہ یہ اس قدر مال و دولت سے حیرت زدہ ہیں، پھر صفوان کی حیرت کو توڑتے ہوئے فرمایا:

اَبَا وَهبٍ! یعجبكَ هذه الشعبُ، قال نعم، قال، هو لك وما فیه ــــ "ابووہب! یہ دولت پسند ہے؟ بولے ہاں پسند ہے، فرمایا، اس میں سے جتنا چاہو لے لو، یہ سب تمہارا ہے"۔

صفوان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عفو وکرم کا یہ اندازِ شاہانہ دیکھ کر بول اُٹھے۔

فقال صفوان عند ذلك ماطابتْ نفس اَحَدٍ بمثل هذا الا نفسُ نبيٍّ۔ اَشهدُ ان لا الٰه الا الله واشهد ان محمدا عبده ورسوله ــــ "صفوان اسی وقت بول اُٹھے: اس قدر عفو وکرم اور بخشش وعطا پر ایک رسول کا نفس ہی پہنچ سکتا ہے، ایک رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی ایسا بے مثل کرم کر سکتا ہے۔ یہ کہہ کر صفوان نے کلمہ شہادت پڑھ لیا"۔

(کنز العمال جلد ۵ ص ۲۹۴)

ابولہب کے بیٹوں کے لئے دُعا:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابولہب کا ظلم وجور مشہور ہے، اس ظالم چچا کے دونوں لڑکے عتبہ اور معتب فتح مکہ کے بعد اپنے خاندان کے دوسرے لوگوں کے ساتھ مکہ سے بھاگ گئے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے پوچھا، عتبہ اور معتب کہاں ہیں؟ ــــ آپؐ کو بتایا گیا وہ دونوں بھی قتل کے خوف سے بھاگ گئے ہیں، آپؐ نے فرمایا، انھیں میرے پاس لاؤ، حضرت عباسؓ اپنے ان بھتیجوں کو عرفہ کے مقام سے واپس لائے اور آپؐ کی خدمت میں انھیں پیش کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا، دونوں نے کلمۂ حق کا اقرار کیا، پھر آپؐ انھیں بیت اللہ کے دروازہ کے قریب ملتزم پر لائے، آپؐ نے ان دونوں کے ہاتھ پکڑ رکھے تھے، ملتزم پر آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیر تک دُعا مانگی اور پھر ہنستے ہوئے واپس آئے حضرت عباسؓ نے کہا اے رسولِ محترم! صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ آپؐ کو ہمیشہ خوش وخرم رکھے، اس وقت آپؐ کے ہنسنے کی کیا وجہ ہے؟ آپؐ نے فرمایا میں نے

اپنے پروردگار سے دُعا کی کہ میرے ان دونوں بھائیوں کو مجھے ہبہ کردے، خدا تعالیٰ نے میری دُعا قبول فرمائی اور مجھے عتبہ اور معتب عطا کردیئے گئے (زرقانی ج ۲ ص ۳۲۰)

ابولہب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا بدترین دشمن تھا، اس کے لڑکوں کے ساتھ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جذبۂ ترحم اور بے پایاں شفقت دیکھنے کے قابل ہے اور پھر ان کے اسلام کو خدا تعالیٰ کا خاص عطیہ قرار دینا ان کے اعزاز واکرام کی انتہا ہے۔

ابولہب کی بیٹی "درہ" پر لطف وکرم:

ابولہب کی بیٹی "درہ" مسلمان ہوکر مدینہ طیبہ آگئیں تو کچھ عورتوں نے اس پر ابولہب کی بیٹی ہونے کا طنز کیا "درہ" نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کردی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجمع عام میں تقریر فرمائی، سب مسلمانوں کو تنبیہ کی کہ درہ سے طنز کی کوئی بات نہ کی جائے اور فرمایا "درہ" میرے خاندان کی خاتون ہے، اس کی اذیت میری اذیت ہے اور قیامت میں صرف میرا ہی رشتہ ایسا ہوگا جو کام آئے گا (در منثور)

حنین کے قیدیوں پر رحم وکرم:

مکہ معظمہ فتح ہوجانے کے بعد دشمنانِ حق نے آخری مورچہ حنین کے میدان میں قائم کیا، یہاں آپ کا مقابلہ ہوازن اور ثقیف کے قبیلوں سے ہوا، رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں نے ظلم کی آخری شوکت کو توڑنے کے لئے زبردست مقابلہ کیا اور خدا تعالیٰ نے اہلِ حق کو کامیابی عطا فرمائی۔

اس معرکہ میں چھ ہزار جنگی قیدی مسلمانوں کے قبضہ میں آئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جعرانہ کے مقام پر ان قیدیوں کو تین ہفتہ تک اپنے ساتھ رکھا اور ہوازن کے ذمہ دار لوگوں کا انتظار کیا اور جب کوئی شخص ان قیدیوں کو چھڑانے نہ آیا تو آپ نے دستور کے مطابق ان قیدیوں کو صحابہ کرام رضؓ پر تقسیم کردیا۔

تقسیم کے بعد ہوازن کا وفد ان قیدیوں کو چھڑانے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اپنے آدمیوں کو چھڑانے کی درخواست کی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی ماں حضرت حلیمہؓ اسی قبیلہ سے تعلق رکھتی تھیں، اس وفد کے ایک ممبر زہیر بن صرد نے آپؐ سے رحم وکرم کی اپیل کرتے ہوئے کہا:

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! ان جنگی مجرموں میں آپؐ کی رضاعی خالائیں، پھوپیاں اور آپؐ کو گود میں کھلانے والیاں شامل ہیں، اگر عرب کے کسی حکمراں سے ہمارا ایسا تعلق ہوتا تو ہم پر بہت رحم وکرم ہوتا اور آپؐ کی شان اقدس تو حکمرانوں سے بہت اعلیٰ اور بلند ہے، پس آپؐ ہم پر رحم کیجئے، ہم بڑی مصیبت میں گرفتار ہیں۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میں نے تمہارا بہت انتظار کیا، اس کے بعد ان قیدیوں کو تقسیم کر دیا، اب میں اپنے اور اپنے خاندان بنی ہاشم کے حصّے کے تمام قیدیوں کو آزاد کر کے تمہارے سپرد کرتا ہوں، رہے وہ قیدی جو دوسرے مسلمانوں کے حصہ میں آئے ہیں تو تم ظہر کی نماز کے بعد مسلمانوں سے ان قیدیوں کے لئے درخواست کرنا میں بھی تمہاری سفارش کروں گا۔

ظہر کی نماز کے بعد وفد کے خطیبوں نے فصیح وبلیغ تقریریں کیں اور مسلمانوں سے قیدیوں کی رہائی کی درخواست کی، اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریر فرمائی اور مسلمانوں سے کہا:

لوگو! میں نے اپنے حصّے کے قیدیوں کو آزاد کر دیا ہے، میں تم سے بھی یہ کہتا ہوں کہ تم بھی ان تمام قیدیوں کو چھوڑ دو، اگر تم میں کوئی شخص اپنی خوشی سے رہا کرنے کے لئے تیار نہیں ہے تو میں اپنی طرف سے ان کا معاوضہ دینے کے لئے تیار ہوں۔

صحابہ کرامؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی سن کر بخوشی اپنے تمام قیدی آزاد کر دیئے انہی قیدیوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی بہن شیما بھی شامل تھیں، مسلمانوں نے جب شیما کو میدانِ جنگ سے اپنی حراست میں لیا تو انھوں نے کہا، لوگو! میں تمہارے پیغمبر کی بہن ہوں، حلیمہ کی لڑکی ہوں، اور اس کی نشانی یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپؐ نے بچپن میں میرے کاٹ لیا تھا۔ دیکھیئے! یہ اس کا نشان موجود ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت شیما کو فوراً پہچان لیا اور جوشِ مسرت

میں اپنی چادر پاک زمین پر ڈال دی اور اس پر بہن کو بٹھایا، اس وقت آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہن شیما سے کہا، اگر تم میرے ساتھ چلنا چاہو تو میرے ساتھ چلو، آرام سے زندگی گذار لینا اور اگر اپنی قوم کے ساتھ جانا چاہتی ہو تو تمھیں اختیار ہے، شیما نے واپس جانے کی خواہش کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے قیدیوں کے ساتھ انھیں بھی واپس کر دیا اور کچھ اونٹ اور بکریاں، تین خادم اور ایک لونڈی بھی انھیں عطا فرمادی۔ (اصابہ ترجمہ شیما ج ۴ ص ۳۴۴)

حاتم طائی کی بیٹی پر رحم و کرم کی بارش:

حاتم طائی مشہور عیسائی سخی گذرا ہے، اس کے قبیلہ مطے کے جنگی قیدیوں میں حاتم کی لڑکی سفانہ بھی شامل تھی، حاتم کا لڑکا عدی تو مسلمانوں کے آنے کی اطلاع پا کر ملک شام چلا گیا اور بہن مسلمانوں کی حراست میں مدینہ لے آئی گئیں، یہ لوگ مسجد نبوی کے قریب ایک احاطہ میں اتار دیئے گئے ـــــ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب اس احاطہ کے سامنے سے گذرے تو سفانہ کھڑی ہو گئیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میرا باپ حاتم خدا کو پیارا ہو گیا، میرا بھائی جو میرا سرپرست تھا، وہ شام کی طرف بھاگ گیا، اب آپؐ سے درخواست ہے کہ آپؐ ہم پر رحم فرمایئے اور احسان کیجئے۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سفانہ کی درخواست پر فرمایا تم اطمینان سے رہو ملک شام جانے والا کوئی ذمہ دار آدمی مل جائے تو میں ان کے ساتھ تمھیں بھیج دوں گا، دو تین دن کے بعد آپؐ نے سفانہ کو بڑے اعزاز واکرام کے ساتھ واپس کر دیا سفانہ نے اسلام قبول کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شکریہ ادا کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دعا دی جس کے چند جملے یہ ہیں۔

اصاب اللّٰہ یمعروفک مواضعہ ولا جعل لک الی لئیم حاجۃ ولا سلب نعمۃً عن کریمٍ الا وجعلک سببًا لِرَدِّھا علیہ ـــــ "خدا کرے آپؐ کا احسان و کرم ہمیشہ برمحل اور حق داروں پر واقع ہو، خدا کرے آپؐ کو کسی کمینہ سے کوئی ضرورت نہ پڑے

اور خدا تعالیٰ کسی شریف آدمی کی نعمت نہ چھینے اور اگر چھینے تو آپ جیسے شریف انسان کے ہاتھوں اسے واپس کرائے۔"

سفانہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے رخصت ہو کر اپنے بھائی کے پاس ملک شام پہنچیں اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ کرم سے عدی کو آگاہ کیا اور بھائی کو مشورہ دیا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر دین اور دنیا کی فضیلت حاصل کرے۔

عدی نے بہن کی زبان سے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمانہ کا حال سن کر مدینہ کا رُخ کیا اور حاضرِ خدمت ہو کر مسلمان ہو گئے۔ (بحوالہ زرقانی ج ۳ ص ۵۳)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے حاتم طائی کی بیٹی کے قیدی بن کر آنے اور آپ کے رحم و کرم پر چند اشعار لکھے ہیں، فرماتے ہیں:

در مصافِ پیش آں گردوں سریر — دخترِ سردارِ طے آمد اسیر
پائے در زنجیر و ہم بے پردہ بود — گردن از شرم و حیا خم کردہ بود
دخترک را چوں نبی بے پردہ دید — چادرِ خود پیشِ روئے او کشید
ما ازاں خاتونِ طے عریاں تریم — پیشِ اقوامِ جہاں بے چادریم

(ترجمہ) قبیلہ طے کے سردار کی بیٹی آپ کی خدمت میں بطور ایک قیدی کے آئیں، جب اس تاجدار نے اس معزز خاتون کو ننگے سر دیکھا تو اپنی چادر اتار کر اس کے سر پر ڈال دی اور بے حد رحم و کرم فرمایا۔

پس ہم مسلمان تو اس خاتون سے زیادہ عریاں اور اقوامِ عالم میں بے چارہ و بے سروسامان ہیں پھر ہم اس رحم و کرم کے کیوں مستحق نہیں۔

سراقہ بن مالک بن جیشمہ کی معافی اور انعام:

قریشِ مکہ کی طرف سے ہجرت کے موقعہ پر یہ اعلان کیا گیا کہ جو شخص محمد بن عبد اللہ اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پکڑ کر لائے گا اسے سو اونٹ انعام میں دیئے جائیں گے، سراقہ بن مالک کا بیان ہے

کہ یہ اعلان سن کر میں گھوڑے پر سوار ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ کچھ دور جا کر میں نے آپؐ کو دیکھ لیا اور آپؐ کے قریب پہنچ گیا، ابو بکر صدیقؓ کی نگاہ جب مجھ پر پڑی تو انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا، یا رسول اللہ! یہ شخص ہماری تلاش میں آرہا ہے اب ہم پکڑے گئے، آپؐ نے ابو بکرؓ کو تسلی دیتے ہوئے کہا:

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا ـــــ "ابو بکرؓ! غم نہ کرو، خدا تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔"

پھر آپؐ نے خدا تعالیٰ سے دعاء فرمائی:

اَللّٰھُمَّ اکْفِنَا بِمَا شِئْتَ "خداوندا! تو ہمارے لئے کافی ہو جا جس طرح چاہے"

(فتح الباری ج ۷، ص ۱۸۸)

سرکار کی زبانِ پاک پر بد دعاء کے الفاظ جاری نہیں ہوئے بلکہ اپنے خدا سے مدد کی درخواست کی اور خدا تعالیٰ نے اپنی طرف سے اس کی یہ صورت اختیار فرمائی کہ سراقہ کا گھوڑا گھٹنوں تک زمین میں دھنس گیا۔

سراقہ نے گھبرا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فریاد کی کہ آپؐ میرے لیے خدا تعالیٰ سے دُعا کریں کہ وُہ مجھے اس عذاب سے نجات عطا فرمائے، آپؐ نے فوراً دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے اور سراقہ کا گھوڑا زمین کے اندر سے باہر آگیا۔

سراقہ کا بیان ہے کہ میں سمجھ گیا کہ اللہ تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو غالب کرے گا اور قریش کم ناکام رہیں گے، میں نے اپنا زادِ راہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا، مگر آپؐ نے اسے قبول نہیں کیا، البتہ آپؐ نے مجھ سے کہا تم ہمارا راز کسی پر ظاہر نہ کرنا، پھر میں نے آپؐ سے عرض کیا کہ آپؐ مجھے ایک تحریری معافی نامہ لکھ دیں، آپؐ نے اپنے خادم عامر بن فہیرہ سے کہا کہ اسے چمڑے کے ٹکڑے پر معافی نامہ لکھ کر دے دو، انھوں نے وہ معافی کی سند مجھے عطا کر دی (بخاری ج ۱ ص ۵۱۰، ۵۱۵، ۵۵۷)

اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سراقہ کو خطاب کر کے فرمایا:

کَیْفَ اِذَا لَبِسْتَ سِوَارَ کِسْرٰی ـــــ "اے سراقہ اس وقت تیری کیا کیفیت ہو گی

جب تو شاہِ فارس کسریٰ کے کنگن اپنے ہاتھوں میں پہنے گا۔"

ان الفاظ میں ایک تاریخی پیشین گوئی بھی تھی اور سراقہ کے لئے ایک بڑی خوشخبری اور تسلی بھی تھی چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ ایسا ہی ہوا، فارس کی فتح کے بعد شاہِ فارس کا شاہی تاج اور کنگن و زیورات مسجد نبوی میں فاروقِ اعظم کے سامنے لاکر ڈال دیئے گئے۔

حضرت عمرؓ نے سراقہ کو بلایا اور ان کے ہاتھوں میں وہ شاہی کنگن پہنا دیئے اور کہا:

اللہ اکبر الحمد للہ الذی سلبھما من کسری ابن ھرمز والبسھما سُرَاقَۃَ الاَعْرَابِیِّ اللہ اکبر ——— "اللہ اکبر اس خدا کی تعریف ہے جس نے کسریٰ سے کنگن چھین لئے اور ایک دیہاتی سراقہ کے ہاتھ میں ڈال دیئے، اللہ سب سے بڑا ہے۔"

اس کے بعد وہ تمام زیورات مسلمانوں کے اندر تقسیم کرا دیئے (زرقانی ج ا ص ۳۴۸)

سراقہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے رخصت ہو کر مکہ معظمہ واپس ہوا اور راستہ میں ہر تعاقب کرنے والے کو یہ کہہ کر واپس کرتا گیا کہ میں دیکھ آیا ہوں، تمھارے جانے کی کوئی ضرورت نہیں، پھر سراقہ مکہ میں ابوجہل سے ملا اور اس سے کہا:

ابا حکم! واللہ لو کنت شاھداً لِاَمْرِ جوادی حین ساخت قوائمُہٗ

اے ابوجہل، واللہ اگر تو اس وقت حاضر ہوتا جب میرے گھوڑے کے قدم زمین میں دھنس رہے تھے

علمتَ وَلم تشکک بان محمداً نبیٌّ ببرھانٍ فمن ذا یُقاوِمُہٗ

تو تو اسوقت جان لیتا اور تجھے شک نہ رہتا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہیں دلیل کے ساتھ آئے ہیں، پھر کون ان کا مقابلہ کرسکتا ہے (البدایہ ج ۳ ص ۱۸۶)

منافقین کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق

منافقین وہ لوگ تھے جو زبان سے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کو مانتے تھے مگر ان کے دل ایمان ویقین سے خالی تھے، یہ لوگ اسلام کے بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر ظاہر میں مسلمانوں کے ساتھ ہو گئے تھے لیکن جب کوئی نازک موقعہ آتا تھا، یہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کو نقصان پہنچانے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔

رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی

اس گروہ کا سب سے بڑا لیڈر عبداللہ بن ابی تھا، یہ شخص مدینہ کا با اثر آدمی تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ میں تشریف آوری سے پہلے مدینہ کے لوگ اسے اپنا حکمران بنانے کی تیاریاں کر رہے تھے، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کے بعد اس کی تمام آرزوئیں خاک میں مل گئیں اور یہ اسی وقت سے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن بن گیا، البتہ ظاہر میں اپنے آپ کو مسلمان کہتا رہا ـــــ ایک سفر میں اس شخص نے مسلمانوں کے اندر پھوٹ ڈلوانے کی زبردست کوشش کی۔

حافظ ابن کثیرؒ نے سورہ منافقون کی تفسیر میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ بنی مصطلق کے غزوہ کے لئے جاتے ہوئے مسلمانوں کا ایک جگہ قیام تھا، یہاں حضرت جہجاہ بن سعید غفاریؓ (مہاجر) اور حضرت سنان بن یزید انصاریؓ کے درمیان پانی لینے پر کچھ کھٹ پٹ ہو گئی۔

بات طول پکڑ گئی، حضرت سنانؓ نے انصاریوں کو مدد کے لئے آواز دی اور جہجاہؓ نے مہاجرین کو پکارا ـــــ یہ رئیس المنافقین انصار کی ایک جماعت کے ساتھ ایک جگہ بیٹھا ہوا تھا، اس نے جب یہ جھگڑا دیکھا تو اس جھگڑے کو بڑھانے کی کوشش کرنے لگا اور انصاری مسلمانوں کو مشتعل کرنے کے لئے بولا۔

دیکھو! ہمارے ہی گھر دل میں ان پردیسیوں نے ہم پر حملے شروع کر دیئے، خدا کی قسم! مدینہ واپس ہو کر ہم حیثیت والے لوگ ان بے حیثیت لوگوں کو وہاں سے نکال دیں گے۔

قرآن کریم نے اس کا قول نقل کرتے ہوئے کہا ہے:

یَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ۚ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ ـــــ "منافقین کہتے ہیں اگر ہم مدینہ واپس ہوئے تو عزت والے ان ذلت والوں کو نکال دیں گے اور (حقیقت تو یہ ہے) عزت تو اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہے اور اہلِ ایمان کے لئے ہے لیکن یہ دوغلے لوگ اس بات کو نہیں جانتے (سورہ منافقون آیت ۸)

یہ نہایت خطرناک فتنہ انگیزی تھی جو عبداللہ بن ابی کی طرف سے کی گئی، حضرت عمرؓ نے اس شرارت پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپؐ اجازت دیں کہ فسادی منافق کو ختم کر دیا جائے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو منع کر دیا اور فرمایا، تم مسلمانوں کو اس جگہ سے روانہ ہونے کا حکم دے دو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق مسلمانوں کا قافلہ فوراً روانہ ہو گیا، اور لوگ اس جھگڑے کو بھول گئے، اس منافق کے لڑکے حضرت عبداللہؓ ایک سچے مسلمان تھے انھیں جب اپنے باپ کی گستاخی اور شرارت کا علم ہوا تو یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ سے اجازت چاہی کہ مجھے اپنے باپ کو اس فتنہ انگیزی کی سزا اپنے ہاتھ سے دینے کی اجازت دی جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ رضؓ کو بھی انتقام لینے کی اجازت نہ دی اور ان سے کہا:

بل نترفق بہ ونحسن صحبتہ ما بقی معنا ـــــ "نہیں، ہم اس کے ساتھ نرمی کریں گے اور اچھا سلوک کریں گے جب تک وہ ہمارے ساتھ ہے۔" (ابن کثیر ج ۴ ص ۲۷۲)

مورخین نے لکھا ہے کہ جب یہ لشکر مدینہ واپس ہوا تو رئیس المنافقین کا مخلص لڑکا عبداللہؓ مدینہ کے دروازہ پر تلوار نکال کر کھڑا ہو گیا، لوگ گذرتے رہے یہاں تک کہ رئیس المنافقین آپہنچا اور بیٹے کو اس حالت میں دیکھ کر بولا:

مالک ویلک؟ ـــــ "یہ کیا کر رہا ہے، افسوس تجھ پر"۔

عبد اللہ بولے:

واللہ، لا تجوز من ھھنا حتی یاذن لک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فانہ العزیز و انت الذلیل ـــــ "خدا کی قسم تو آگے نہیں بڑھ سکتا جب تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اجازت نہ دیں، بیشک رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم عزت والے ہیں اور تو بے عزت ہے۔"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ آپؐ قافلہ کے آخری حصّہ میں رہا کرتے تھے چنانچہ جب آپؐ کی سواری آئی تو اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ یہ میرا لڑکا کیا کر رہا ہے۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہؓ کو اس حرکت سے باز رکھا اور اس کے باپ کو بیٹے کے ہاتھ سے رہائی دلوائی اور شہر کے اندر داخل ہونے کی اجازت دی (ج ۴ ص ۱)

ایک سیاسی لیڈر کے لئے اپنے دشمن کو ختم کرانے کی اس سے بہتر صورت اور کیا ہو سکتی تھی کہ دشمن کا اپنا بیٹا اسے قتل کرنے کے لئے تیار تھا، لیکن رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک سیاسی لیڈر نہ تھے بلکہ اخلاق و شرافت کے معلّم اور انسانیت کے علم بردار تھے، آپؐ نے اس موقع سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا اور اس فسادی انسان پر رحم و کرم فرما کر اس کی سنگین سیاسی اور اخلاقی خطا کو معاف کر دیا۔

ابن ابی کے جنازہ کی نماز:

یہ فسادی لیڈر آخر وقت تک اپنی شرارتوں پر قائم رہا، یہاں تک کہ اسی حالت میں اس پر موت طاری ہو گئی۔

حضرت قتادہؓ کا بیان ہے کہ ابن ابی نے مرض الموت میں اپنے لڑکے عبد اللہؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیج کر آپؐ کو بلایا، سرکار صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس آئے اور اس سے کہا

اھلکَ حبّ یھود ـــــ "تجھے یہودیوں کی محبت نے ہلاک کر دیا۔"

ابن ابی اس حالت میں بھی تکبر و غرور میں گرفتار تھا، کہنے لگا:

یا رسول اللہ انما ارسلت الیک لتستغفر لی و لم ارسل الیک لتؤنبنی ـــــ

"اے نبی! (صلی اللہ علیہ وسلم) میں نے آپؐ کو اس لئے نہیں بلایا کہ آپ مجھے ڈانٹیں بلکہ اس لئے بلایا ہے کہ آپؐ میرے لئے دعائے مغفرت کریں۔"

پھر عبد اللہ رضؓ نے اپنے باپ کی خواہش کے مطابق اپنا کرتہ اس کے کفن کے لئے عطا فرمایا اور اس منافق کے غرور و تکبر کو نظر انداز فرما کر اس کے حق میں دعاءِ مغفرت فرمائی۔

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سب سے بڑے فسادی منافق کے ساتھ رحم و کرم کا جو برتاؤ کیا، حضرت عمر رضؓ کی زبانی حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اسے نقل کیا ہے حضرت عمر رضؓ فرماتے ہیں —— رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب اس منافق کی نمازِ جنازہ کے لئے کھڑے ہو گئے تو میں صف کے اندر سے نکل کر آپؐ کے سینۂ اقدس کے سامنے کھڑا ہو گیا اور عرض کیا، آپؐ اس دشمنِ حق کی نمازِ جنازہ پڑھا رہے ہیں، یہ شخص تو ایسا ہے، ایسا ہے، اس نے فلاں موقعہ پر یہ کہا، فلاں موقعہ پر یہ کہا، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم عمر رضؓ کی باتیں سنتے رہے اور تبسم فرماتے رہے۔

و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یتبسم حتی اذا اکثرت علیہ قال اخر عنی یا عمر رضؓ! خُیِّرتُ، فَخَیَّرتُ —— "حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہنستے رہے، یہاں تک کہ جب میں نے بار بار وہ دہرایا تو آپؐ نے فرمایا، عمر رضؓ! ہٹ جاؤ، خدا نے مجھے دعاء کرنے یا نہ کرنے کا اختیار دیا ہے، میں نے دعا کرنے کو ترجیح دے دی ہے۔"

وَلَو اَعلَمُ انی ان زِدتُ علی السبعین غفرلہ لزدت علیہا —— "اور اگر مجھے اس بات کا علم ہو جاتا کہ ستّر دفعہ سے زیادہ دعاء کرنے سے اس کی مغفرت ہو جائے گی تو میں ستر دفعہ سے زیادہ بار دعاءِ مغفرت کرتا۔"

یہ روایت امام احمد کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے، امام بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضؓ نے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن پکڑ کر آپؐ کو نماز پڑھانے سے روکا ——
فقام عمر رضؓ فاخذ بثوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم —— "اس کے بعد بھی جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اصرار جاری رہا تو یہ صف سے نکل کر آگے آ گئے، حضرت عمر رضؓ خود کہتے ہیں کہ اس موقعہ پر میں نے جس جرأت سے کام لیا، اس پر مجھے سخت تعجب ہوا۔" (ابن کثیر ج ۲ ص ۳۷۹)

ایک جلیل القدر ساتھی کے اصرار کے باوجود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنے بڑے

مخالف کے ساتھ شرافت و مہربانی کا یہ سلوک فرمایا، کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی مقام اخلاقِ کریمانہ کا بے مثل نمونہ پیش کر کے دنیا کو اس کی دعوت دینی تھی۔

حضرت تھانویؒ نے بیان القرآن میں حضرت قتادہؓ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے فرمایا:

میرے کرتہ سے اس منافق کو فائدہ نہ پہنچے لیکن مجھے امید ہے کہ اس کے خاندان (بنی خزرج) کے ہزاروں افراد (میرے) اس شریفانہ برتاؤ کو دیکھ کر اپنے دلوں میں سے نفرت اور بدگمانیاں دُور کر دیں گے اور میری سچائی کو تسلیم کر لیں گے (بیان القرآن ج ۴ ص ۱۳۳)

نماز کی ممانعت:

اس مسئلہ کا ایک پہلو یہ تھا کہ ایک مفسد کے ساتھ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ رحم و کرم کہ دوسرے مفسدین کی حوصلہ افزائی کا سبب بن سکتا تھا اور اس سے مدینہ کے اجتماعی امن و امان کی صورتِ حال خراب ہو سکتی تھی، اس لئے خدا تعالیٰ نے آئندہ کے لئے یہ حکم نازل کر دیا کہ جو شخص کفر و انکار پر مرے اسلامی طریقہ پر اس کے جنازہ کی نماز کے لئے ہادیٔ اسلام اور دوسرے مسلمان شرکت نہ کریں۔

منافقین کی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ختم کرنے کی کوشش اور آپؐ کا رحم و کرم:

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک سے واپسی کے وقت ایک پہاڑی درہ سے گزر رہے تھے، اس موقعہ پر بارہ منافق منہ چھپا کر ایک آڑ میں کھڑے ہو گئے، تاکہ جب حضور ادھر سے گزریں تو آپؐ پر حملہ کر کے آپؐ کو ختم کر دیں، حضرت حذیفہؓ اور حضرت عمارؓ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب آگے سے گزرے تو آپؐ ہوشیار ہو گئے اور آپؐ نے ان منافقین کو للکارا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی للکار سن کر یہ لوگ بھاگ گئے۔

خدا تعالیٰ نے آسمانی وحی کے ذریعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان منافقین کے نام بتا دیئے

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ رضؓ اور عمار کو ان کے ناموں سے آگاہ فرمایا، مگر ساتھ ہی منع فرمادیا کہ عام مسلمانوں کو ان کے ناموں کی خبر نہ دی جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمان غصہ میں ان لوگوں کو ان کی مجرمانہ حرکت پر سزا دینے لگیں اور یہ لوگ ہلاک ہو جائیں۔

یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمانہ کی انتہا تھی کہ ایسے مجرموں کی مفسدانہ کارروائیوں کی پردہ پوشی فرمائی اور ان کا راز فاش نہ ہونے دیا۔ (ابن کثیر ج ۲ ص ۳۷۳)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمانہ کو منافقین کمزوری سمجھتے تھے:

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ان منافقین کے ساتھ عفو و درگذر کا شریفانہ طرزِ عمل اختیار فرماتے یہ لوگ اسے آپؐ کی کمزوری قرار دیتے، قرآنِ کریم نے بتایا:

وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ؕ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ (سورہ توبہ) ——— "ان منافقین سے کچھ لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بدگوئی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص تو کان ہے تم کہہ دو اے نبی! صلی اللہ علیہ وسلم، نبی کان ہیں تمہارے بھلے کے واسطے، وہ ایمان رکھتا ہے اللہ پر اور یقین ہے مسلمانوں کی باتوں پر اور رحمت ہے ایمان والوں کے حق میں"

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے مولانا شبیر احمد عثمانی رحؒ لکھتے ہیں "منافقین آپس میں بیٹھ کر اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بدگوئی کرتے، جب کوئی کہتا کہ ہماری یہ باتیں پیغمبر اسلام تک پہنچ جائیں گی تو کہتے، کیا پروا ہے، ان کے سامنے ہم جھوٹی تاویلیں کرکے اپنی برأت کا یقین دلائیں گے کیونکہ وہ تو کان ہی کان ہیں جو سنتے ہیں فوراً تسلیم کر لیتے ہیں، ان کو باتوں میں لے آنا کچھ مشکل نہیں، بات یہ تھی کہ حضرت اپنے حیاء و وقار اور کریم النفس سے جھوٹے کا جھوٹ پہچانتے تب بھی نہ پکڑتے، خلق عظیم کی بناء پر مسامحت اور تغافل برتتے، وہ بے وقوف جانتے کہ آپؐ نے سمجھا ہی نہیں، حق تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ اگر وہ کان ہی کان ہیں تو تمہارے بھلے کے واسطے ہیں، نبی کی یہ خو اور عادت تمہارے حق میں بہتر ہے، نہیں تو اول تم پکڑے جاؤ گے"

(حمائل شریف ص ۲۵۴)

زہر دینے والی عورت پر رحم وکرم

خیبر کے غزوہ کے موقعہ پر سلام بن مشکم، یہودی سردار کی بیوی زینب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمالی، اس نے کسی سے پوچھا، آپؐ کو کس جگہ کا گوشت پسند ہے؟ کسی نے بتایا، بکری کی دست آپؐ کو زیادہ پسند ہے، اس نے تمام گوشت میں زہر ملادیا اور دست کے گوشت میں بہت زیادہ ملا دیا، یہ زہر آلود گوشت جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لایا گیا تو آپؐ نے اس میں سے کچھ تناول فرمایا اور پھر ہاتھ کھینچ لیا۔

ہاتھ روک کر آپؐ نے فرمایا، مجھے اس ہڈی نے خبر دی کہ میں زہر آلود ہوں ـــــ ان العظم لیخبرنی انہ مسموم ـــــ پھر آپؐ نے زینب کو بلایا، زینب نے زہر دینے کا اقرار کرلیا، آپؐ نے پوچھا تو نے ایسا کیوں کیا ـــــ؟ وہ بولی: ـــــ فقلتُ اِنْ کَانَ مَلِکًا اِسْتَرَحْتُ مِنْہُ وَاِنْ کَانَ نَبِیًّا فَسَیُخْبَرُ ـــــ "میں نے سوچا تھا، اگر یہ شخص بادشاہ ہے تو اس کے ہلاک ہوجانے سے مجھے راحت ملے گی، چھٹکارا حاصل ہوجائے گا اور اگر یہ شخص نبی ہے تو یہ اس زہر سے باخبر ہوجائے گا"

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے زینب کا یہ جواب سن کر اپنی طرف سے اسے معاف کردیا، حالانکہ زینب نے جو بات بنائی وہ بالکل جھوٹی تھی، اس نے آپؐ کو رسول جان کر اذیت پہنچانی چاہی۔

یہی زہر تھا جو مرض وفات میں آپؐ کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوا اور اسی کے اثر سے آپؐ نے وفات پائی اور شہادتِ خفی کا مرتبہ حاصل کیا۔ (ابن ہشام ج ۳ ص ۱۰۲)

بدزبان خطیب "سہیل" پر رحم وکرم:

سہیل بن عمرو قریش کا بہترین خطیب تھا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت سخت عداوت رکھتا تھا، یہ بدزبان، اپنی تقریروں اور خطبوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت بُرا بھلا کہا کرتا تھا ـــــ بدر کے قیدیوں میں جب یہ شخص بھی قیدی بن کر آیا تو حضرت عمرؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا

اعنی انزع ثنیتیه لیدلع لسانه، فلا یکون خطیبًا ابدًا، فقال علیہ السلام لا امثل به فیمثل اللہ بی وان کنت نبیًا ——— "حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس کے اگلے دو دانت توڑ دوں، پھر یہ کبھی تقریر نہ کر سکے گا، آپؐ نے فرمایا: میں اس کا (مثلہ) چہرہ نہ بگاڑوں گا، اللہ تعالیٰ میرا چہرہ بگاڑ دے گا، اگرچہ میں نبی ہوں"۔

اس سے معلوم ہوا کہ آپؐ کے رحم و کرم کے پیچھے انسانی محبت کے ساتھ ساتھ خدا کے خوف کا جذبہ کام کرتا تھا، آپؐ کے دل میں ہر وقت یہ خیال رہتا تھا کہ یہ دشمنانِ حق بھی خدا کی مخلوق ہیں، اگر میں خدا کی مرضی کے بغیر ان سے بدلہ لوں گا، تو خدا تعالیٰ مجھ سے ناراض ہو جائے گا۔

(من اخلاق النبی مصری ص ۱۷۷)۔

اسّی حملہ آوروں کو معافی:

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز میں مشغول تھے کہ تنعیم سے اسّی آدمیوں نے اُتر کر آپؐ پر حملہ کر دیا، تاکہ آپؐ کو قتل کر دیں۔

صحابہ کرامؓ نے ان حملہ آوروں کو گرفتار کر لیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں معاف کر دیا اسی واقعہ پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ (شفاء قاضی عیاض ج ۱ ص ۸۵)

وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم بِبَطْنِ مَكَّةَ مِن بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا (سورہ فتح: ۲۴) ——— "اور وہ وہی ذات ہے جس نے ان کے ہاتھ تم سے روک دیئے اور تمھارے ہاتھ ان سے روک دیئے مکہ کی وادی میں اس کے بعد تم ان پر کامیاب ہو گئے اور اللہ تعالیٰ تمھارے اعمال کا دیکھنے والا ہے"۔

غیر مسلم ماں کی عزّت کا حکم:

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیٹی حضرت اسماءؓ کہتی ہیں کہ میرے والد ابوبکرؓ نے جاہلیت کے زمانہ میں میری ماں کو طلاق دیدی تھی، میری یہ ماں میرے پاس آئیں اور میرے لئے کچھ گھی اور منقات اپنے ساتھ لائیں، یہ ابھی تک مشرک تھیں، اس لئے میں نے انھیں اپنے گھر میں داخل ہونے کی اجازت

نہ دی اور نہ ان کا ہدیہ قبول کیا، میں نے اس مسئلہ کے لئے اپنی بہن حضرت عائشہ رض کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اسماء سے کہہ دو، انھیں گھر میں آنے دیں اور ان کا ہدیہ قبول کرلیں۔

اس واقعہ پر خدا تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں اور غیر مسلموں کے ساتھ ملنے جلنے کے بارے میں ایک اصول بیان فرمادیا، ارشاد فرمایا:

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قَاتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓي اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۱۸۲ والاستیعاب ص ۹۰۵)

"خدا تعالیٰ ان غیر مسلموں کے ساتھ احسان کرنے اور عدل کرنے سے نہیں روکتا جو تم سے نہ لڑتے ہیں اور نہ انھوں نے تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا ہے، بے شک خدا تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے، ہاں خدا تعالیٰ ان غیر مسلموں کے ساتھ دوستی کرنے سے منع کرتا ہے جنھوں نے تم سے قتال کیا اور تمھارے گھروں سے تم کو نکالا اور جو لوگ ان سے دوستی کریں گے وہ ظالم ہوں گے۔"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت و شفقت نے اسے گوارا نہ کیا کہ ماں باپ اور اولاد کے فطری رشتہ کو دین و مذہب کے اختلاف کی وجہ سے ختم کرادیں، یہ فطری ممتا ہر قسم کے اختلاف سے بالاتر ہے، اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اولاد کو اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ اپنے ماں باپ سے پوچھے بغیر جہاد فی سبیل اللہ میں شرکت کرے۔

قرآنِ کریم نے اوپر والی آیات میں قتال و فساد برپا کرنے والے مشرکین کے ساتھ جس بات سے روکا ہے وہ تولّی، دوستی اور اعتماد ہے، بھلائی، انصاف اور نیکی کرنے کی اجازت اور فضیلت ہر حال میں باقی رکھی گئی ہے۔

عہد کی پابندی کے تین اہم واقعات:

بدر کا واقعہ: موجودہ دورِ تہذیب میں سیاسی معاملات کے اندر عہد و معاہدہ کی پابندی کے کوئی معنی نہیں ہیں، طاقتور فریق جب چاہتا ہے، کمزور کے ساتھ کئے گئے عہد کو توڑ کر اپنا مفاد پورا کر لیتا ہے، لیکن رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میدانِ جنگ کے اندر قتال و فساد برپا کرنے والے دشمنوں کے ساتھ پابندیٔ عہد کی وہ مثال قائم کی جس کی نظیر مشکل ہی سے تاریخ میں نظر آتی ہے ——— غزوۂ بدر کے موقعہ پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی کس قدر کمزور تھے، تعداد بھی دشمنوں سے کم اور سروسامان بھی بہت قلیل، اس دن آپؐ کے نزدیک ایک ایک مسلمان کی بڑی قیمت تھی۔ لیکن اس دن کا ایک واقعہ حضرت حذیفہؓ بن الیمانؓ بیان کرتے ہیں کہ میں اور میرے ساتھ میرے والد ابو حُسَیل مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ کی جانب روانہ ہوئے، قریش کے آدمیوں نے راستے میں ہم دونوں کو روک لیا اور کہا، تم دونوں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جانا چاہتے ہو؟ ہم نے کہا نہیں، ہم سیدھے مدینہ جانا چاہتے ہیں، ان لوگوں نے ہم سے عہد لیا کہ ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کر جہاد میں حصہ نہیں لیں گے اور سیدھے مدینہ چلے جائیں گے

ہم لوگ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے تو ہم نے بدر کی لڑائی میں حصہ لینے کا ارادہ کیا، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے عہد کا علم ہو گیا، آپؐ نے فرمایا، تم اپنے عہد پر قائم رہو۔

و نستعین اللہ علیہم (الاصابہ ج۱ ص ۳۳۲ والاستیعاب ص ۳۳۴) ——— "اور ہم خدا تعالیٰ سے ان کے مقابلہ پر مدد چاہتے ہیں"

ابو جندل کا واقعہ:

دوسرا واقعہ ابو جندل کا ہے اور وہ یہ ہے کہ حدیبیہ کے میدان میں قریش اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان معاہدہ طے پا رہا تھا، قریش کی طرف سے سہیل نمائندگی کر رہے تھے، معاہدہ میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ جو قریش کا قیدی مکہ سے بھاگ کر مدینہ جائے گا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری ہوگی کہ اسے واپس کر دیں لیکن جو شخص مدینہ سے نکل کر مکہ پہنچ جائے گا قریش کے لئے اس کی واپسی

ضروری نہ ہو گی۔

یہ معاہدہ زبانی طور پر طے پا گیا تھا اور تحریر میں لانا باقی تھا کہ سہیل کا لڑکا ابو جندل پا بزنجیر مکہ سے بھاگ کر حدیبیہ میں مسلمانوں کے پاس آ گیا، مسلمانوں نے اپنے ایک مظلوم ساتھی کو اس حال میں دیکھا اور سب بے چین ہو گئے۔

سہیل نے کہا، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) معاہدہ کی پابندی کا یہ سب سے پہلا موقعہ ہے، میرے لڑکے ابو جندل کو واپس کرو، آپؐ نے ابو جندل کو بلایا، اور فرمایا:

یا ابا جندل واصبر واحتسب ——— "ابو جندل! صبر کرو اور خدا سے اجر و ثواب کی اُمید رکھو"

اس وقت عجیب و غریب صورتِ حال پیدا ہو گئی، ابو جندل صحابہ کرام رضؓ سے اپیل کر رہے تھے کہ قریش مجھ پر ظلم و ستم توڑتے ہیں، میں نے اسلام قبول کر لیا ہے پھر مجھے ان ظالموں کے حوالہ کیوں کیا جا رہا ہے"؟

لیکن جب ابو جندل سے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے ہیں کہ خدا تیرے لئے کوئی راہ نکالے گا، اس وقت واپس چلا جا، تو ابو جندل فوراً تیار ہو جاتے ہیں اور اپنے آقا کی بات رکھتے ہیں، اپنی جان کی پروا نہیں کرتے۔

ابو بصیر کا واقعہ:

حدیبیہ کے معاہدہ کے بعد ابو بصیر کا واقعہ پیش آیا، یہ مکہ والوں کی قید میں تھے، بھاگ کر مدینہ پہنچ گئے۔ قریش نے آدمی بھیجا کہ ہمارے قیدی معاہدہ کے مطابق واپس کرو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے واپس کر دیا اور ابو بصیر کو بلا کر کہا، ابو بصیر! تمھیں معلوم ہے کہ ہم نے قریش سے معاہدہ کر رکھا ہے ——— ولا یصلح لنا فی دیننا الغدر فاللّٰہ جاعل لک ولمن معک من المستضعفین فرجا و مخرجا ——— "ہمارے دین میں بدعہدی جائز نہیں خدا تعالےٰ تمہارے لئے اور تمام کمزور مسلمانوں کے لئے کوئی راہ نکالے گا ——— ابو بصیر حضور صلی اللہ

علیہ وسلم کی ہدایت پر واپس آ گئے "۔

خدا نے راہ نکالی:

خدا تعالیٰ نے ان دونوں کے لئے راستہ پیدا کیا، ابو بصیر نے کسی جھگڑے میں مرافقتہ القرشی کو قتل کر دیا اور مکہ سے بھاگ کر سمندر کے کنارے چلے آئے، اس کے بعد ابو جندل بھی ان کے پاس چلے گئے اور جو شخص اسلام قبول کرتا، مکہ سے بھاگ کر ان کے پاس چلا جاتا، اس طرح اس مقام پر مسلمانوں کی ایک بڑی جمعیت ہو گئی، یہ مقام حجاز سے شام کی طرف جانے والی شاہراہ پر واقع تھا ان مظلوموں نے یہاں جمع ہو کر اپنے اوپر ظلم وستم کرنے والے قریشی قافلوں کو پریشان کرنا شروع کر دیا، کیونکہ انہی لوگوں نے انہیں بے گھر اور بے سر و سامان کیا تھا، پھر یہ دشمنوں کے قافلوں کو سلامتی کے ساتھ کیسے گذرنے دیتے؟

اس پریشانی نے سنگ دل قریش کو بدحواس کر دیا اور انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آدمی بھیجا کہ آپؐ ابو جندل اور اس کے ساتھیوں کو مدینہ بلا لیں، قریش نے خدا اور رشتہ داری کا واسطہ دیا، آپؐ کو رحم آ گیا اور ان لوگوں کو مدینہ بُلا لیا (ابن ہشام ج ۲ ص ۳۲۲)

اس طرح ایک طرف اس بربار گروہ کو عافیت ملی اور دوسری طرف قریش کے قافلے امن وسلامتی کے ساتھ گذرنے لگے۔

آپؐ نے مرے ہوئے غیر مسلم کی مذمت کو ناپسند فرمایا:

محمد بن مسلمہ کا بیان ہے کہ ایک روز ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ آپؐ نے حضرت حسان بن ثابتؓ سے فرمایا، حسان! جاہلیت کے دور کا کوئی شعر سناؤ

ما عفا اللہ لنا فیہ ـــــــ خدا ان اشعار کی برائی سے درگذر فرمائے۔ ـــــــ

حضرت حسانؓ نے "اعشی" کا قصیدہ سنایا، جس میں علقمہ بن علاثہ کی ہجو تھی، قصیدہ کا مطلع یہ تھا

علقمۃ ما انتَ مِنْ عامرٍ ... اَلنَّاقِصُ الْاَوْتَارِ وَالْوَاتِرِ

اے علقمہ تو قبیلہ عامر میں سے نہیں ہے، تو تو ایسا ہے جو چنگ و رباب سے محروم ہے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شعر سُن کر فرمایا ——— یا حَسان لا تَنْشِدُنی مِثْلَ ھٰذا بَعْدَ الْیَوْم ——— "حسان رضؓ! اس قسم کا شعر تم مجھے آئندہ نہ سنانا" (کنز العمال ج ۲ ص ۱۵۲)

ابوبکر صدیق کو بھی منع فرمایا:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر عفیف، کریم اور پاکیزہ نفس تھے کہ نہ کوئی گھٹیا بات آپؐ کی زبانِ پاک سے نکلتی تھی اور نہ آپؐ کے کان بری باتوں کو سننا پسند کرتے تھے۔

فتح مکہ کے بعد کا واقعہ ہے کہ آپؐ طائف والوں کی سرکشی دُور کرنے کی غرض سے صحابہ کرام کیساتھ تشریف لے جا رہے تھے، ابوبکر صدیق رضؓ بھی آپؐ کے ساتھ تھے۔

راستہ طے کرتے ہوئے حضرت ابوبکر رضؓ ایک قبر سے گذرے اور پوچھا، لوگو! یہ قبر کس کی ہے لوگوں نے کہا یہ قبر سعید بن عاص کی ہے، ابوبکر رضؓ نے نام سُن کر کہا:

لعن اللہ صاحب ھذا القبر فانہ کان یُحَارِبُ اللہَ وَرَسُوْلَہٗ ——— "خدا اس قبر والے پر لعنت بھیجے، یہ خدا اور اس کے رسول سے جنگ کرتا رہا"

سعید کے دونوں لڑکے اس وقت موجود تھے، ان میں سے عمرو بن سعید نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی اور عرض کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم! یہ قبر اس شخص کی ہے جو غریبوں کو کھانا کھلانے اور دشمنوں کی گردن اڑانے میں ابوبکر رضؓ کے باپ ابوقحافہ سے آگے تھا۔

ھذا قبر رجل کان اطعم للطعام واضرب للھام من ابی قحافۃ ———

ابوبکر رضؓ، سعید کا مقابلہ اپنے باپ کے ساتھ کرنے سے خفا ہوئے اور کہا حضور! صلی اللہ علیہ وسلم دیکھئے! یہ مجھ سے کس طرح کی باتیں کر رہا ہے، آپؐ نے عمرو کو خاموش کر دیا:

عمرو چلے گئے، پھر آپؐ نے ابوبکر صدیق رضؓ کو نصیحت فرمائی:

یا ابا بکر! اذا ذکرتم الکفار فعمموا فانکم اذا خصصتم غضب الابناء لاٰباءھم فکف المسلمون عن ذٰلک (احیاء العلوم ج ۳ ص ۱۰۷) ——— "اے ابوبکر رضؓ جب تم منکروں کا ذکر کرو تو عام انداز سے ذکر کیا کرو، کیونکہ جب تم خصوصیت کے ساتھ نام لے کر کسی منکر کا ذکر

کرو گے تو اس کی اولاد کو ناگواری ہو گی کہ ان کے بزرگوں کے ساتھ یہ کیا جا رہا ہے:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نصیحت کے بعد مسلمان اس طرح کی باتوں سے رُک گئے۔

اسی طرح آپؐ نے بدر کے مقتولین کو بُرا کہنے سے روک دیا تھا اور صحابہ کرامؓ سے فرمایا تھا:

لَا تَسُبُّوْا هٰؤُلَاءِ فَاِنَّهٗ لَا يَخْلُصُ اِلَيْهِمْ شَيْءٌ مِّمَّا تَقُوْلُوْنَ وَتُؤْذُوْنَ الْاَحْيَاءَ اَلَا اِنَّ الْبَذَاءَ لُؤْمٌ (احیاء ج ۳ ص ۱۰۴) ——— "ان لوگوں کو بُرا نہ کہو، کیونکہ تمہاری کوئی بات ان تک تو پہنچتی نہیں، البتہ جو لوگ زندہ ہیں انہیں اذیت پہنچتی ہے، خبردار! فحش گوئی قابلِ ملامت ہے۔"

——— سعید بن عاص کی بُرائی کے واقعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لڑکے عمرو کو بھی سمجھا سکتے تھے کہ تمہارا باپ دشمنِ حق تھا، تم اس کی مذمت پر بُرا کیوں مان رہے ہو ——— اور یقیناً اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم عمرو سے یہ فرماتے تو وہ اپنی غلطی مان لیتے، مگر یہ بات فطرتِ انسانی کے خلاف ہوتی۔

باپ بیٹے کا فطری تعلق اور خون کا رشتہ کسی حالت میں نہیں ٹوٹتا، اسلام جو "دینِ فطرت" ہے اس نے ہر حال میں فطری تقاضوں کی رعایت کی ہے، عبد اللہ بن ابی رئیس المنافقین کے واقعہ میں بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مخلص لڑکے (عبد اللہ) کو اپنے باپ کے ساتھ باپ کی شدید فساد انگیزی کے بدلے میں سزا دینے اور اسے قتل کرنے سے روک دیا تھا۔

البتہ عین میدانِ جنگ میں اسلام اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ وہاں خونی رشتوں کی ہرگز پروا نہ کی جائے اور جو لوگ حق کے پیغام کو تلوار کے ذریعہ مٹانے آئیں، ان کی اچھی طرح سرکوبی کی جائے خواہ وہ باپ، بھائی ہوں، یا بیٹے اور بھتیجے۔

بدر کے موقعہ پر ابو بکر صدیقؓ کے والد ابو قحافہ دشمنوں کی صف میں شامل تھے، لڑائی کے بعد جب باپ بیٹوں کے درمیان بات ہوئی تو ابو قحافہ نے کہا، ابو بکرؓ! ایک موقعہ پر تم میرے نشانہ کی سیدھ میں آ ہی گئے تھے، مگر میں نے تمہیں چھوڑ دیا، ابو بکرؓ بولے: اباجان! اگر آپ میرے نشانہ کی سیدھ میں آجاتے تو خدا کی قسم! میں آپ کو نہ چھوڑتا۔

حضرت بلالؓ کی اذان پر اعتراض اور وحی الٰہی کا جواب:

فتح مکہ کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حضرت بلالؓ نے کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر اذان دی، قریش کے نزدیک یہ بہت اعزاز تھا جو ایک قریشی سردار ہی کو نصیب ہونا چاہئے تھا، مگر ایک آزاد شدہ غلام، کعبہ کی چھت پر چڑھا ہوا نظر آ رہا ہے، اسے کون برداشت کرتا، رسّی جل گئی تھی مگر رسّی کے بل باقی تھے، حارث بن ہشام، سہیل بن عمرو اور خالد بن اسید نے کہا ـــــ ھٰذَا الْعَبْدُ يُؤَذِّنُ؟ ـــــ یہ غلام اذان دے رہا ہے ـــــ اللہ تعالیٰ نے فوراً ان کے پندار پر ضرب کاری لگائی اور یہ آیات نازل ہوئیں ـــــ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ الخ (سورہ حجرات: ۱۳) ـــــ "لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے۔" الخ ـــــ

کیا رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بد دعا کی ہے؟

کیا رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کے لئے بد دعا کی ہے؟ ـــــــ یہ سوال بڑا اہم ہے، کیونکہ رحمۃ للعالمین اور صاحبِ خلقِ عظیم کی عام زندگی اخلاق کریمانہ اور رحمت و محبت سے بھری ہوئی نظر آتی ہے اور اس رحمت والی زندگی کے ساتھ اس بات کا بالکل جوڑ نہیں لگتا کہ آپؐ نے اپنے ذاتی دشمنوں کے لئے بد دعائیں کی ہیں۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالاتِ زندگی کا سرسری علم رکھنے والے بد دعا والے واقعات کو سرسری انداز سے بیان کر دیتے ہیں اور اس سے رحمت للعالمین کے حقیقی مقام اور اصلی مشن کے متعلق شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں۔

یہ بات اوپر واضح کی جا چکی ہے کہ قرآنِ حکیم نے آپؐ کا اصلی مقام اور حقیقی مرتبہ بیان کرتے ہوئے آپؐ کو رحمۃ للعالمین اور صاحبِ خلقِ عظیم قرار دیا ہے اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اپنے بارے میں یہی فرمایا ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ نے سورۂ انبیاء میں وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین کی جو اہم تشریح و تفسیر کی ہے اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ مسئلہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے لکھتے ہیں:

امام مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ بعض صحابہ کرامؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: ـــــــ یا رسول اللہ ادع علی المشرکین قال انی لم ابعث لعانا وانما بعثت رحمۃ ـــــــ "اے رسولِ محترم صلی اللہ علیہ وسلم! آپ مشرکین کے حق میں بد دعا کیجئے آپؐ نے فرمایا، بلاشبہ میں لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا مجھے تو رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔"

دوسرے طریقہ روایت میں اس طرح ہے:

انما انا رحمۃ مھداۃ ——— "میں خدا کی طرف سے ہدیہ کی ہوئی رحمت ہوں"

اس روایت کو بھی ابوہریرہؓ سے مرفوعاً نقل کیا گیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ روایت کئے ہیں:

ان اللہ بعثنی رحمۃ مھداۃ برفع قوم وخفض اٰخرین ——— "مجھے خدا تعالےٰ نے رحمۃ بنا کر بھیجا ہے، مجھے اطاعت گذاروں کو سربلند کرنے اور منکروں کو پست و مغلوب کرنے کیلئے۔"

اس کے بعد ابن کثیر نے طبرانی کی ایک صحیح حدیث نقل کی ہے کہ ابوجہل نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کرنے کے بعد اپنے ساتھیوں سے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں چین سے نہ بیٹھنے دو۔ اور جلد از جلد مسلمانوں پر چڑھائی کر دو، اس کے جواب میں مکہ کے مشہور دانشور مطعم بن عدی نے کہا:

یا ابا الحکم واللہ ما رأیتُ احداً اصدق لساناً ولا اصدق موعداً من اخیکم الذی طردتم ——— "اے ابوالحکم! قسم ہے خدا کی، میں نے اس شخص سے زیادہ کسی کو سچا اور وعدہ کا پکا نہیں دیکھا، جس کو تم لوگوں نے باہر نکال دیا ہے۔"

مکہ میں ہونے والی اس ساری بات چیت کی اطلاع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں پہنچی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں اپنے ساتھیوں کے حوصلے بلند کرنے کے لیے ارشاد فرمایا۔

والذی نفسی بیدہ لاقتلنھم ولاصلبنھم ولاھدینھم وھم کارھون انی رحمۃ بعثنی اللہ ولا یتوفنی حتی یظھر اللہ دینہ ——— "خدا کی قسم میں ان ظالموں کو سزا دوں گا اور انہیں راہِ راست پہ لے آؤں گا اور وہ اسے ناپسند کریں گے میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں، مجھے خدا تعالیٰ اس وقت تک نہیں اٹھائے گا، جب تک کہ سرزمینِ عرب پر دین کو غالب نہ کر دے گا۔

اِس ارشادِ نبوت کے بیان کرتے سے ابن کثیرؒ کا مقصد یہ ہے کہ لڑائی اور جنگ و فساد پر آمادہ لوگوں کے مقابلہ پر تلوار اٹھانا "رحمۃ للعالمینی" کے مرتبہ کے خلاف نہیں ہے، بلکہ رحمتِ عامّہ کا یہ عین تقاضا ہے کہ امن پسند عوام کی جان و مال کو مٹھی بھر فسادیوں کے ہاتھ سے بچانے کے لئے

تلوار اٹھائی جائے۔

اب رہا یہ سوال کہ رحمۃ للعالمین نے اگر کسی موقعہ پر بددعار کی ہے تو اس کا مقصد کیا ہے؟ ابن کثیرؒ نے امام احمدؒ کے حوالہ سے ایک حدیث حضرت سلمان فارسیؓ سے نقل کی ہے، اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بددعار کی مصلحت پر روشنی ڈالتے ہوئے ارشاد فرمایا:

ایما رجلٍ سببتہ فی غضبی او لعنتہ لعنۃ فانما انا رجل من ولد آدم اغضب کما تغضبون وانما بعثنی اللہ رحمۃ للعالمین فاجعلھا صلاۃ علیہ یوم القیامۃ ــــ میں جس شخص کو غصہ میں بُرا کہوں یا اس پر لعنت بھیجوں تو وہ جان لے کہ میں آدم کی اولاد ہی کا ایک فرد ہوں میں اسی طرح غصہ کرتا ہوں، جس طرح تم غصہ کرتے ہو۔ مجھے خدا نے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا ہے، پس میں درخواست کروں گا کہ خدا تعالیٰ میری اس ناراضگی کو بھی قیامت کے دن ان کے لئے رحمت بنا دے"ــــ اس کے بعد حافظ ابن کثیرؒ ایک سوال قائم کرتے ہیں:

فان قیل فای رحمۃ حصلت لمن کفر بہ؟ ــــ "اگر کہا جائے کہ منکرین کے حق میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت کی شکل کیا ہے؟"

تو اس کا جواب ابن عباسؓ کی اس حدیث میں ملتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من آمن باللہ والیوم الآخر کتب لہ الرحمۃ فی الدنیا والآخرۃ ومن لم یؤمن باللہ ورسولہ عوفی مما اصاب الامم من الخسف والقذف ــــ جو اللہ اور آخرت پر یقین رکھتا ہے اس کے لئے دنیا اور دین دونوں میں رحمت ہے اور جو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے محروم رہتا ہے اس کے حق میں رحمت کی شکل یہ ہے کہ وہ اگلی مجرم قوموں کی طرح دنیاوی ہلاکتوں، دھنسنے اور پتھراؤ کی سزا سے محفوظ رہتا ہے"۔

(تفسیر حافظ عماد الدین اسماعیل ابن کثیر قرشی متوفی ۷۷۴ھ ج ۳ مصری ص ۲۰۰)۔

بددعار کے دو ۲ موقعے اور پھر اس کی ممانعت:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں دشمنوں کے لئے بددعاء کرنے کے چند موقعے آئے جن میں

آپ نے دشمنوں کے ظلم وستم کی انتہائی شدت میں فطری تقاضے کے تحت ظالموں کے لئے بددعا کی لیکن قرآنِ کریم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کا مقام رحمت یاد دلایا اور بددعا کرنے سے روک دیا

امام بخاریؒ نے دشمنوں کے لئے بددعاء کے مسئلہ پر دو جگہ روشنی ڈالی ہے، مغازی کے باب میں غزوۂ احد کے سلسلہ میں مالک بن انسؓ کی یہ روایت پیش کی ہے۔

شج النبی یوم احد فقال کیف یفلح قوم شجوا نبیھم ؟ —— "اُحد کے دن رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ انور زخمی ہو گیا، اُس وقت آپ نے فرمایا، وہ قوم کس طرح فلاح پائے گی جس نے اپنے نبی کو زخمی کیا ہو ؟"

ان جملوں پر خدا کی طرف سے یہ آیت نازل ہوئی :

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ (سورہ آل عمران ۱۲۸)

"اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کو کوئی دخل نہیں، یہاں تک کہ خدا تعالیٰ ان پر یا تو متوجہ ہو جائے یا ان کو کوئی سزا دے، کیونکہ وہ ظالم ہیں"

ابن کثیرؒ نے مسند امام احمد سے بحوالہ سالم بن عبداللہؓ یہ حدیث نقل کی ہے کہ اُحد کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حارث بن ہشام، سہیل بن عمر، صفوان بن امیہ کا نام لے کر ان پر لعنت بھیجی کیونکہ ان لوگوں نے احد کے دن قتل وغارت گری میں نمایاں حصہ لیا تھا، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مذکورہ آیت نازل ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تنبیہ کر دی گئی کہ ان لوگوں کے حق میں بددعا مناسب نہیں ہے (ابن کثیر ج ا ص ۴۰۲)

علامہ محمود آلوسی نے روح المعانی میں اسی آیت کے تحت لکھا ہے کہ اُحد کے دن حضرت حمزہؓ کی صورت بگاڑنے اور دوسرے مسلمانوں کے ساتھ قریشِ مکہ کی وحشیانہ زیادتیوں سے متاثر ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے یہ نکل گیا :

لنفعلن بھم مثل ما فعلوا و لنمثلن بھم مثلۃ لم یمثلھا احد من العرب قط

"میں ان ظالموں کے ساتھ بھی ایسا ہی کروں گا، ان کا ایسا مثلہ کروں گا جیسا آج تک ——

عرب میں کسی کو نہیں کیا گیا۔"

اس غضبناک جملہ کے زبان پر آتے ہی قرآن کی وہ آیت نازل ہوئی جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے
(روح المعانی ج ۴ ص ۴۹)

ان تینوں روایتوں کا تعلق غزوۂ احد سے ہے اور ان سب کا مقصد یہ ہے کہ اُحد کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حالات کی بے حد شدت سے متاثر ہو کر غیض وغضب کے چند جملے زبانِ پاک سے نکال دیئے مگر خدا تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آپؐ کے اخلاقِ کریمانہ کے بلند مقام کی طرف توجہ دلائی اور اس غصّہ کو غیر مناسب قرار دیا۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس آیتِ پاک کا فوری اثر ہوا اور آپؐ نے اپنی اس نادان قوم کے لئے معافی اور بخشش کی یہ دُعا شروع کر دی۔

رب اغفر لقومی فانھم لا یعلمون (مسلم۔ عن ابن مسعودؓ ج ۲ ص ۱۰۸)

"خداوندا! میری قوم کو معاف کر دے یہ لوگ بے خبر ہیں۔"

اس حدیث پر پہلے وضاحت سے روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

بیر معونہ کے واقعہ پر بد دُعا:

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے جس موقعہ پر ظلم وستم کی شدت سے متاثر ہو کر بددُعا کی وہ موقعہ بیر معونہ کے حادثہ کا ہے، اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ستر بہترین حافظِ قرآن شہید کر دیئے گئے، یہ لوگ دھوکہ دے کر دعوتِ دین کے لئے بلائے گئے اور راستہ میں رعل و ذکوان قبائل نے حملہ کر کے نہایت سفاکی کے ساتھ ان بزرگوں کو قتل کر دیا۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ظلم پر بے حد افسوس ہوا، آپؐ نے اس حادثہ کے بعد ایک ماہ تک صبح کی نماز میں قنوت پڑھی اور ان ظالموں کے لئے بد دعا کی۔

یہ حادثہ اس قدر سنگین تھا کہ خدا تعالیٰ نے ایک ماہ تک آپؐ کو بد دعا کرنے کی مہلت دیدی اور پھر ایک ماہ کے بعد یہی آیت جبریل امین نے آپؐ کے سامنے دوبارہ پیش کی، گویا آپؐ کو پھر

توجہ دلائی کہ آپؐ کا اصل مقام یہ ہے کہ آپؐ عفو وکرم سے کام لیں۔

امام بخاریؒ نے آلِ عمران کی مذکورہ بالا آیت کے تحت باب التفسیر میں حضرت ابوہریرہؓ سے رعل وذکوان کے واقعہ میں اس آیت کا نازل ہونا بیان کیا ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ آیت پاک احد کے موقعہ پر نازل ہوئی اور بیر معونہ کے واقعہ پر خدا تعالیٰ نے اس آیت کی طرف توجہ دلائی ——— بیر معونہ کا واقعہ احد کے چار مہینہ بعد پیش آیا (فتح الباری ج ۹ ص ۱۸۳)

تیسرا واقعہ:

ایک واقعہ غیر مشہور قاضی ثناء اللہ پانی پتی رح نے تفسیر مظہری ج ۲ ص ۱۳۲ میں نقل کیا ہے لکھتے ہیں:

ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی سوال کیا، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پیٹھ کر کے جانے لگا اور اس گستاخ کی شرم گاہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھل گئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس گستاخانہ انداز پر سخت غصہ آیا اور آپؐ نے اس پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے اس کے لئے بددعائیہ جملے زبان سے نکال دیئے۔

اس پر آیتِ پاک اتری اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس غصہ کے غیر مناسب ہونے پر توجہ دلائی پھر یہ شخص مسلمان ہو گیا اور اچھا مسلمان بنا۔

یہ واقعہ قاضی صاحبؒ نے مرسل غریب کہہ کر نقل کیا ہے اور مشہور محدثین میں سے کسی محدث اور مفسر نے بیان نہیں کیا۔

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے بیان القرآن ج ۲ ص ۵۶ میں اس موقعہ پر ایک سوال قائم کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے جب احد کے موقعہ پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بددعا کرنے سے روک دیا تھا اور یہ بتا دیا تھا کہ بددعا کرنا آپؐ کی شانِ اقدس کے مناسب نہیں تو آپؐ نے بیر معونہ کے حادثہ پر رعل وذکوان کے قبیلوں کے خلاف بددعا کیوں کی؟

مولانا کا جواب ان کے اپنے الفاظ میں حسبِ ذیل ہے۔

"ممکن ہے آپؐ نے بقرینہ تخصیصِ ضمائر اس حکم کو اہلِ اُحد کے ساتھ خاص سمجھا ہو، یا بالخصوص یتوب علیہم سے اشارہ ان کے احتمال ایمان کا بھی معلوم ہوتا ہے رعل وذکوان میں یہ مواقع ظاہراً نہ تھے، اس لئے بددعا فرمادی ہو اور وہی آیت دوبارہ وحی سے یاد دلائی گئی ہو تاکہ آپؐ کو حکم کا عام ہونا معلوم ہو جاوے ——— اور جاننا چاہئے کہ آپؐ کا بددعا فرمانا اس کا قصد کرنا اجتہاداً تھا، نہ وحی سے اذن ثابت تھا، نہ ممانعت، پس عصمت کے متعلق کوئی اشکال لازم نہیں۔"

مؤلف عرض کرتا ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بددعا کرنے سے احد اور بیر معونہ کے موقعہ پر باقاعدہ روکا گیا، لیکن اس سے پہلے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم طائف جیسی سختیوں سے گذرے مگر آپؐ کی زبان اقدس پر کبھی دشمنوں کے لئے ہلاکت کی بددعا جاری نہیں ہوئی۔

اور غزوۂ احد اور بیر معونہ کے بعد تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کے اصرار پر جو کچھ فرمایا وہ حضرت ابوہریرہؓ کی زبانی اوپر امام مسلم کی حدیث میں گذر چکا ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ اور وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ جیسی آیات مکی زندگی ہی میں نازل ہو چکی تھیں اور آپؐ کو اپنے ابتدائی دور ہی میں اپنے رحمۃ عالم اور صاحب خلقِ عظیم ہونے کا پورا پورا احساس اور علم تھا، جب کہ آپؐ کی پوری عملی زندگی سے ظاہر ہوتا ہے۔

چور کے حق میں بددُعا کرنے سے روکا:

امام ابوداؤد نے حضرت عطاء سے نقل کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ کے ہاں چوری ہو گئی، حضرت عائشہ رضؓ نے غصہ میں چور کو بددعا دینی شروع کر دی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوا تو آپؐ نے حضرت عائشہ رضؓ سے فرمایا ——— لَا تُسَبِّخِي عَنْهُ "عائشہ رضؓ! اس کے بوجھ کو ہلکا نہ کرو"

(ابن کثیر سورۂ نساء ج ۱ ص ۵۰۱)

انسان کی عام فطرت یہ ہے کہ وہ تکلیف پہنچانے والے کو بددعاء کے ذریعہ تکلیف میں مبتلا کرنا چاہتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضؓ کو بددعاء سے روکنے کے لیے نفسیاتی انداز اختیار فرمایا اور ان سے کہا، عائشہ رضؓ! تم اس چور کے حق میں بددعاء کر کے اس سے بدلا لے رہی ہو اور اس کے جرم کے بوجھ کو ہلکا کر رہی ہو، اگر تم صبر کرو تو اس پر چوری کا گناہ مسلط رہے اور وہ خدا کی طرف سے اس کی سزا پائے۔

بددعا سے روکنے کا اس سے بہتر نفسیاتی طریقہ دوسرا نہیں ہو سکتا۔

امام ابن کثیر لکھتے ہیں کہ حضرت حسن بصریؒ فرمایا کرتے تھے کہ چور کے حق میں بددعاء کرنے کے بجائے یہ دعا کرنی چاہیئے۔

اَللّٰھُمَّ اَعِنِّیْ عَلَیْہِ وَاسْتَخْرِجْ حَقِّیْ مِنْہُ ——— "خداوندا! اس چور کے مقابل میں میری مدد فرما اور میرا مال اس سے دلوا دے۔" (ابن کثیر سورہ نساء ج ۱ ص ۵۷)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صبر پر آسمانی آفت کا نزول:

ایک روز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ شریف کا طواف کر رہے تھے کہ جبریل امین آپؐ کی خدمت میں آئے اور آپؐ کے پاس کھڑے ہو گئے۔

اس اثناء میں اسود بن یغوث حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرا، یہ شخص قریش کے ان پانچ مشہور سرداروں میں سے تھا جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیفیں پہنچانے اور آپ کا مذاق اڑانے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ اس کے علاوہ چار سردار یہ تھے۔

بنی مخزوم کا ولید بن مغیرہ، بنو سہم کا عاص بن وائل، بنی خزاعہ کا حارث بن طلالہ، اسود بن ابی رفع۔ خدا تعالیٰ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سرداروں کی ایذاء رسانی پر ہمیشہ صبر و تحمل اور ذکرِ الٰہی کی ہدایت فرماتا رہا، سورۂ حجر کی آخری آیت میں تلقین فرمائی۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّکَ یَضِیْقُ صَدْرُکَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَکُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ ——— "اے نبی! (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں خوب معلوم ہے کہ

ان لوگوں کی باتوں سے آپؐ دل میں تنگ ہوتے ہیں، تو آپؐ اپنے رب کی حمد کیجیے اور سجدہ کرنیوالوں میں رہیے اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہیے، یہاں تک کہ یقین کی بات (موت) آجائے"۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پروردگار کی اس ہدایت کو ہر موقعہ پر سامنے رکھا اور صبر و تحمل سے مخالفین کی ہر بات کو نظر انداز کیا، لیکن ایک دن خداوند عالم کو خود جلال آگیا اور اس نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی کا آپؐ کے دشمنوں کو مزا چکھایا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ حضرت جبریل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور حرم پاک میں کھڑے ہو گئے، آپؐ طواف کر رہے تھے، اس اثناء میں آپؐ کے ساتھ مذاق کرنے والوں میں سے اسود ادھر سے گذرا، جبریل امین نے اس کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا اس کے اثر سے اس کے پیٹ میں بیماری پیدا ہو گئی اور وہ اسی بیماری میں مرگیا۔ اس کے بعد ولید بن مغیرہ ادھر سے گذرا، حضرت جبریل نے اس کے پیر کی ایڑی کی طرف اشارہ کیا، اس کی ایڑی میں دو سال پہلے ایک خزاعی شخص کے تیر سے معمولی سی خراش آگئی تھی وہ خراش ایک بڑا زخم بن گئی، اور ولید اسی میں ہلاک ہوا۔

اس کے بعد عاص بن وائل ادھر سے گذرا، جبریل امینؑ نے اس کے تلوے کی طرف اشارہ کیا، اس کے بعد عاص اپنے گدھے پر طائف جا رہا تھا، اس کے اوپر سے نیچے گرا اور اس کے تلوے میں کیل چُبھ گئی اور اسی تکلیف میں یہ ہلاک ہوا۔

اس کے بعد حارث بن طلالہ ادھر آیا، جبریل امین نے اس کے سر کی طرف اشارہ کیا اس سے اسے خون کی قے آنے لگی اور وہ بھی اسی میں ہلاک ہوا۔

ابن عباس رضؓ فرمایا کرتے تھے کہ ان سب کا لیڈر ولید تھا، وہی ان سب کو جمع کیا کرتا تھا۔

(ابن کثیر ج ۲ سورہ حجر ص ۵۶۰)

شرعی سیاست کی بنیاد رحمت پر ہے:

جس طرح موجودہ مغربی سیاست کی بنیاد مکر و فریب، حیلہ سازی اور دھوکہ دہی پر ہے

اسی طرح اسلامی سیاست کی بنیاد رحمت اور شفقت پر قائم ہے، "احکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت" کے فاضل مصنف مولانا محمد تقی کا رمینی ناظم شعبۂ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے شرعی سیاست پر ایک مستقل باب قائم کیا ہے اور اس کے تحت بہت فاضلانہ اور ٹھوس بحث کی ہے۔

سیاستِ شرعیہ کیا ہے؟ مصنّف نے بتایا:

انها القانون الموضوع لرعاية الآداب والمصالح وانتظام الاحوال

"سیاست وہ قانون ہے جو آداب و مصالح کی رعایت کرتے اور حالات کا انتظام کرنے کے لئے بنایا گیا ہو۔" (بحوالہ جامع التعزیر الخاتمۃ فی لسیاسۃ ص ۱۰۰)

ان السياسة فعل يفشئ من الحاكم لمصلحة يراها وان لم يرد بذلك الفعل دليل خبری ــــــ "سیاست وہ فعل ہے جس کو حاکم وحکمراں مصلحت کے پیش نظر مناسب سمجھ کر کرتا ہے، اگرچہ اس فعل کی کوئی دلیل منقول نہ ہو۔" (بحوالہ جامع التعزیر الخاتمۃ السیاسۃ ص ۱۰۹)

آگے چل کر سیاست کی دو قسمیں ہیں، ایک سیاست عادلہ اور دوسری سیاست ظالمہ۔ سیاست ظالمہ کو شریعت حرام قرار دیتی ہے اور سیاست عادلہ اختیار کرنے کا شریعت میں حکم دیا گیا ہے اور یہ وہ سیاست ہے جس میں مظلوم کو ظالم سے حق دلوایا جاتا ہے۔

پھر لکھتے ہیں ــــــ یہ سیاست دین کا جزء ہے، بظاہر سیاستِ شرعیہ کے بعض فیصلے پچھلے منقول احکام کے مطابق نہیں معلوم ہوتے لیکن حقیقت میں وہ شریعت کے بنیادی مقاصد کے مطابق ہوتے ہیں اور اصطلاح کی رعایت کرتے ہوئے انھیں سیاست کا نام دیا جاتا ہے ورنہ

انما هی عدل الله ورسوله ــــــ "در حقیقت یہ وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عدل ہے۔" (الطرق الحکمیہ)

حاصل یہ کہ سیاست شرعیہ میں عوام کے دینی اور دنیوی مصالح کا لحاظ رکھا جاتا ہے اور انھیں نقصان سے بچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

سیاست شرعیہ کا معاملہ بہت نازک ہوتا ہے اور اس میں افراط اور تفریط

دونوں ہلاکت برپا کردیتی ہیں، اس میں بڑی سمجھ بوجھ، بڑی دانائی اور حکمت کی ضرورت پڑتی ہے اگر ضرورت سے زیادہ نرمی ہوجائے تو حق تلفی کا دور شروع ہوجائے اور اگر ضرورت سے زیادہ سختی ہوجائے تو ظلم و تشدد کا دور دورہ ہوجائے۔

اسی لئے حضرت عمر فاروق رضؓ نے قاضی ابو موسیٰ اشعری کو لکھا تھا۔

الفهم الفهم فيما ادلى اليك (الطرق الحكميه) ــــــ "جو معاملات پیش آئیں ان میں زیادہ سے زیادہ فہم اور دانش مندی سے کام لینا"

مطلب یہ ہے کہ سیاست شرعیہ کے منصب پر کام کرنے والے خلفاء اور حکام کے اندر جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے وہ علم شریعت کے بعد سمجھ بوجھ اور عقل و فہم کی ہے شرعی سیاست میں مخلوقِ خدا کو ہر قسم کی سہولت پہنچانے اور ہر قسم کے نقصان سے بچانے کا جو اصول رکھا گیا ہے، اس کی دلیل یہ آیت پاک ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (انبیاء رکوع ۷) ــــــ "اے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپؐ کو محض اس لئے بھیجا ہے تاکہ رحمتِ عامہ کا ظہور ہو"

آیت کی تشریح کرتے ہوئے علماء نے لکھا ہے:

ومن الرحمة الاذن لهم على لسانه صلى الله عليه وسلم فى جلب المصالح ودفع المفاسد عنهم ومعلوم ان للناس مفاتح تجدد بتجدد الايام فلو وقف الاعتبار على المنصوص فقط لوقع الناس فى الحرج الشديد وهو مناف للرحمة (حجة التعليل الاحكام ص ۲۸۸) ــــــ "رسول اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی زبانِ اقدس کے ذریعہ لوگوں کو زندگی کے فائدے حاصل کرنے کی اور نقصانات کو دُور کرنے کی اجازت دی ہے اور حالات کے بدلنے سے نئے نئے مصالح پیدا ہوتے ہیں ایسی حالت میں صرف منصوص (منقول) احکام ہی پر اکتفاء کیا جائے تو لوگ تنگی میں مبتلا ہوجائیں اور یہ بات رحمت کے خلاف ہے"

اسی لئے فقہاء اسلام نے یہ اصول مقرر کیا ہے:

الاصل فی الاشیاء الاباحۃ (بحوالہ اعلام الموقعین ج ۳ ص ۱۲۱) ـــــــ "اشیاء میں اصل اباحت ہے" ـــــــ یعنی اشیاء میں اصل اباحت ہے، البتہ جس چیز کو شریعت حرام قرار دیدے یا عقل اسے بُرا کہے، وہ ممنوع ہو جاتی ہے"

چند مثالیں:

اس کی مثالیں دیتے ہوئے علماء نے لکھا ہے۔

(۱) قرآن کریم نے مشرک قوموں کے معبودوں کو بُرا کہنے سے روکا ہے ـــــــ ولا تسبوا الذین ـــــــ یہ اس اس بات کی دلیل ہے کہ:

وھذا کالتنبیہ بل کالتصریح علی المنع من الجائز لئلا یکون سببا فی فعل مالا یجوز ـــــــ "جو باتیں جائز ہوتی ہیں شریعت ان سے صرف اس لئے روکدیتی ہے کہ ان کے ارتکاب سے ناجائز باتیں پیدا ہونے لگتی ہیں"

معبودانِ باطل کو بُرا کہنے سے معبود حقیقی کو بُرا کہنے کا راستہ کھلتا ہے اور شر و فساد کھڑا ہوتا ہے، اس لئے اس سے روکدیا گیا ہے۔

(۲) خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام کو فرعون کے ساتھ سخت کلامی کرنے سے روک دیا ـــــــ فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا ـــــــ کیونکہ سخت کلامی سے نفرت پیدا ہوتی ہے اور دعوت کے راستہ میں مشکلات پیدا ہوتی ہیں، حالانکہ خدا تعالیٰ نے موسیٰؑ وہارونؑ کو یقین دلایا تھا ـــــــ قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ـــــــ "اس یقین دہانی کے باوجود سخت کلامی سے روکا گیا۔

(۳) فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے سوال کیا ـــــــ قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى (طٰہٰ رکوع ۲) ـــــــ "اے موسیٰ! جو لوگ نئے عقیدہ "توحید" سے پہلے مر گئے، ان کا کیا حال ہوا

وہ اب کیسے ہیں؟ ـــــــ یہ مسئلہ بڑا جذباتی ہے عوام کو اپنے بڑوں کے ساتھ عقیدت ہوتی ہے، ان کے بارے میں وہ کوئی بُرا لفظ سننے کو تیار نہیں ہوتے، فرعون کا مقصد تھا کہ موسیٰؑ پچھلوں کے لئے کوئی بُرا لفظ کہیں اور عوام میں ان کے خلاف مخالفت کا جذبہ پیدا ہو لیکن حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو اپنے مقصد میں ناکام کر دیا اور جواب دیا ـــــــ علمہا عند ربی فی کتاب (طٰہٰ رکوع ۲) ـــــــ "ان لوگوں کا علم میرے خدا کو ہے جو کتاب میں محفوظ ہے"

یہ جواب حضرت موسیٰؑ نے شرعی سیاست کے تحت دیا جس میں عظیم دینی مصلحت پوشیدہ ہے، اگر آج لوگ اس کا لحاظ رکھیں تو مذہبی اور سیاسی جھگڑے کھڑے نہ ہوں۔

یہی وہ شرعی سیاست و مصلحت ہے جسے دین کا جز قرار دیا گیا ہے اور صحابہ کرامؓ نے اسی اصول پر عمل کیا ہے۔

ان الصحابۃ رضوان اللہ علیہم عملوا امورًا لمطلق المصلحۃ لا لتقدم شاھد یا لاعتبار (حالاتِ زمانہ کی رعایت ص ۱۲۴ بحوالہ تبصرہ الاحکام ص ۴۵) ـــــــ

"تمام صحابہ کرام بہت سے معاملات میں مصلحت کا لحاظ رکھتے تھے، جب کہ ان معاملات میں ان کے سامنے کوئی شاہد موجود نہیں ہوتا تھا"

(۵) اجتماعی زندگی میں شرعی سیاست پر عمل کرنے کی بہترین مثال "صلح حدیبیہ" کا معاہدہ ہے اس معاہدہ میں بعض دفعات ایسی تھیں جو کسی طرح قابل قبول نہ تھیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت دُور اندیشی کے ساتھ مستقبل پر نظر رکھی اور ان دفعات کو قبول فرمالیا، حالانکہ اس سے صحابہ کرام کے جذبات مجروح ہوئے۔

(۶) صلح حدیبیہ سے پہلے مکہ معظمہ میں قحط پڑا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دور میں دین کے برسرِ پیکار دشمنوں کی ہر ممکن مدد فرمائی تاکہ یہ لوگ قحط میں ہلاک نہ ہوں، اس میں بھی آپؐ نے شرعی سیاست کے تحت رحم و کرم سے کام لیا اور مستقبل کے مفاد پر نظر رکھی، وقتی غصہ اور انتقام کے جذبہ کو نظر انداز فرمایا۔

نہی عن المنکر میں احتیاط:

قرآنِ کریم نے امر بالمعروف کے ساتھ ہی نہی عن المنکر کا حکم دیا ہے، مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب کسی بُرائی پر روک ٹوک کرنے سے کسی دوسری بڑی بُرائی کے رونما ہونے کا اندیشہ ہو تو روک ٹوک کرنے سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا من رای من امیرہ ما یکرہ فلیصبر ــــــ "جو شخص اپنے امیر کی طرف سے ناپسندیدہ باتیں دیکھے تو اسے برداشت سے کام لینا چاہیئے۔" (مشکوٰۃ کتاب الامارۃ والقضاۃ)

اس باب میں جوش اور جلد بازی کی روش اختیار کرنے سے ملت کے اندر بڑے بڑے فتنے کھڑے ہو چکے ہیں، علامہ ابن قیمؒ نے لکھا ہے ــــــ "اسلام میں جس قدر چھوٹے بڑے فتنے ظاہر ہوئے ہیں، ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بُرائیوں کی روک تھام میں بے تدبیری اور جلد بازی کی روش کو بڑا دخل رہا ہے، لوگوں نے بُرائیوں کو دور کرنا چاہا، مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے بڑی بُرائیاں پیدا ہو گئیں۔" (اعلام الموقعین ج ۳ ص ۲۸)

ابن قیم نے اپنے استاد علامہ ابن تیمیہؒ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ وہ تاتاری فتنہ کے عہد میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ کچھ ایسے لوگوں پر گذرے جو شراب نوشی کا شغل کر رہے تھے امام کے ساتھیوں نے انھیں روکنا چاہا لیکن امام نے ان کو باز رکھا اور ان سے کہا

انما حرم اللہ الخمر لانھا تصد عن ذکر اللہ وعن الصلوٰۃ وھولاء یصدھم الخمر عن قتل النفوس وسبی الذریۃ واخذ الاموال فدعھم ــــــ "یعنی خدا تعالیٰ نے شراب سے روکا ہے اس لیے کہ وہ ذکر اللہ اور نماز سے باز رکھتی ہے لیکن یہ اس قسم کے لوگ ہیں کہ انھیں شراب نوشی کا مشغلہ قتل و غارت گری اور لوٹ مار سے روکتا ہے، لہٰذا انھیں اس مشغلہ میں لگا رہنے دو۔" (اعلام الموقعین ج ۳ ص ۲۹)

ایک حاکم وقت اور قاضی شریعت کو حالاتِ زمانہ اور انسان کی نفسیات اور اس کے مخصوص

مزاج کا کتنا لحاظ رکھنا چاہیے۔ اس کی مثال دیتے ہوئے مصنف نے یہ واقعہ پیش کیا ہے کہ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم! مجھ پر حد جاری کر دیجیے، آپؐ نے فرمایا ــــــ الیس قد صلیت معنا قال نعم قال فان اللہ قد غفر لک ذنبک او حدّک ــــــ "یعنی کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز پڑھی ہے، اس نے کہا، ہاں پڑھی ہے آپؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تمہارا قصور معاف کر دیا"۔ معاف کرنے کا اس شخص پر اتنا اثر ہوا کہ اس نے شراب نوشی سے توبہ کر لی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم! آپؐ کے کوڑوں کے خوف سے شراب چھوڑنے میں میں اپنی توہین سمجھتا تھا، لیکن جب آپؐ نے معاف کر دیا تو خدا کی قسم! میں اس ملعون شے کو کبھی ہاتھ نہ لگاؤں گا۔ (اعلام الموقعین فصل فی تغییر الفتویٰ)

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی طبیعت کا اندازہ لگایا کہ یہ شخص ایک خوددار اور شریف فطرت رکھتا ہے اور اس پر سزا جاری کرنے کے مقابلہ میں معاف کرنے کا فعل زیادہ اثر ڈالے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

مجرموں کے ساتھ عادلانہ اخلاق

قوت ، شجاعت ، جرأت ، عدالت

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں جس طرح رحم و کرم اور صبر و حلم کی صفات کمال درجہ موجود تھیں، اسی طرح شجاعت اور جرأت کی صفت بھی اپنی مکمل شان کے ساتھ آپؐ کے اندر جلوہ گر تھی۔

تاریخ نے ایسے بہادروں کے نام بتائے ہیں جو جنگ و پیکار میں شیروں کی طرح دشمن سے لڑے ہیں لیکن تاریخ نے رسول اعظم صلی اللہ علیہ وسلم جیسا شجاع اور بہادر شاید ہی دیکھا ہو۔

آپؐ میدانِ جنگ کے بھی بہادر تھے اور میدانِ امن کے بھی، اور یہ شجاعت کا وہ کمال ہے جو ایک ہی ذات میں بہت کم جمع ہوتا ہے، جنگ کے ماہر صلح میں فیل ہو جاتے ہیں اور صلح و امن کے علم بردار جنگ و پیکار کے وقت ناکام ہو جاتے ہیں۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بدر و احد اور حنین کے معرکوں میں ایک بہادر سپہ سالار تھے اور حدیبیہ کے میدان میں ایک امن پسند اور صلح جو رہنما، احد اور حنین کے معرکوں میں رفیقوں نے ساتھ چھوڑ دیا مگر رسولِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم تن تنہا دشمنوں کے مقابلہ میں ڈٹے رہے پھر حدیبیہ میں مخالفوں نے امن و صلح کا ہاتھ بڑھایا تب بھی تمام رفیق و جاں نثار بد دلی اور ناامیدی کا شکار ہو گئے اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمن کی ہر شرط کو تسلیم کر کے صلح کر لی اور امن کے موقعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دیا، جو تلوار لے کر آیا اسے پوری جرأت سے روکا اور جو صلح کے لئے آگے بڑھا، اسے اسی حوصلہ کے ساتھ سینہ سے لگا لیا۔

اسی شجاعت کی ایک قسم یہ ہے کہ اپنے ساتھیوں پر قانونِ انصاف نافذ کرنے میں ذرہ برابر ہچکچاہٹ نہ ہو، حق کے راستہ میں، نہ دشمنوں کا خوف رکاوٹ بنے اور نہ دوستوں کی محبت آڑے آئے اور شجاعت کی اسی قسم کا نام عدالت ہے۔

ذیل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بے لاگ عدل وانصاف کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

قانونی انصاف اپنی ذات سے بدلہ:

غزوۂ بدر میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم مجاہدین کی صفیں سیدھی کر رہے تھے، آپؐ کے ہاتھ میں ایک تیر تھا، آپؐ اس تیر کے اشارہ سے لائن سیدھی کرتے ہوئے تشریف لے جا رہے تھے کہ حضرت سواد بن غزیہ لائن سے باہر نکلے ہوئے ملے، آپؐ نے ان کے پیٹ میں نیزہ چبھو کر فرمایا:

اِسْتَوِ یَا سَوَادُ! ——— "سواد لائن میں ہو جاؤ۔"

سوادؓ نے کہا ——— اَوْجَعْتَنِیْ وَ قَدْ بَعَثَکَ اللّٰہُ بِالْحَقِّ فَاَقِدْنِیْ

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپؐ نے تکلیف پہنچا دی، خدا نے آپؐ کو حق کیساتھ بھیجا ہے ——— مجھے بدلہ دیجئے"۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً اپنا پیٹ کھول دیا اور فرمایا:

اِسْتَقِدْ یَا سَوَادُ! ——— "سواد بدلہ لے لو۔"

سواد اپنے آقا سے لپٹ گئے اور آپؐ کے پیٹ کو چوم لیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سواد یہ کیا کیا؟ سواد بولے:

یا رسول اللہ! حَضَرَ مَا تَرٰی فَلَمْ اٰمَنِ الْقَتْلَ فَاَرَدْتُّ اَنْ یَّکُوْنَ اٰخِرَ الْعَهْدِ بِکَ اَنْ یَمَسَّ جِلْدِیْ جِلْدَکَ فَدَعَا لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ بِخَیْرٍ ——— "حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ دیکھتے ہیں موت سامنے ہے، میں موت سے نہیں بچ سکتا، میں نے سوچا، کہ آخری وقت میں آپؐ کے جسم اقدس کو چھو لوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سواد کے لئے دعا فرمائی۔"

بظاہر یہ ایک معمولی واقعہ ہے، مگر ایک طرف انصاف حاصل کرنے کے لئے بے باکی اور دوسری طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انصاف پسندی اور خدا ترسی کی ایک سبق آموز داستان اس میں پوشیدہ ہے۔

مسلمان کے قاتل پر غصہ:

محلم بن جثامہ نے ایک لڑائی میں عامر کو قتل کر دیا، محلم جب عامر کی طرف حملہ کرنے آئے تو عامر نے اسلام کا سلام، السلام علیکم کیا، محلم اور عامر کے درمیان زمانۂ جاہلیت سے کچھ رنجش

چلی آرہی تھی، محلم نے موقع غنیمت جانا اور عامر کے السلام علیکم کہنے کے باوجود ان پر تیر چلا کر قتل کر دیا

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا محلم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس غلطی پر معافی چاہی، ایک بے قصور مسلمان کے قتل کا مسئلہ تھا جو حق کے لئے نہیں بلکہ اپنی ذاتی رنجش کی بناء پر قتل کیا گیا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محلم سے فرمایا:

لَا غَفَرَ اللّٰهُ لَكَ ——— "خدا تجھے اے محلم! معاف نہ کرے"، محلم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی دیکھ کر کھڑے ہو گئے، آنکھوں سے آنسو جاری تھے ——— وَهُوَ يَتَلَقَّى دُمُوْعَهٗ بِبُرْدَيْهِ ——— "چادر کے کونوں سے آنسو پونچھتے ہوئے چلے گئے" محلم پر سات دن نہیں گذرنے پائے کہ محلم کا انتقال ہو گیا، لوگوں نے اسلامی طریقہ کے مطابق محلم کو دفن کر دیا، لیکن ——— فَلَفَظَتْهُ الْاَرْضُ ——— "زمین نے محلم کی نعش کو باہر پھینک دیا،" صحابہ کرام سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ——— الْاَرْضُ تَقْبَلُ مَنْ هُوَ شَرٌّ مِّنْ صَاحِبِكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَرَادَ اَنْ يَّعِظَكُمْ ——— "زمین نے اس شخص سے زیادہ برے آدمی کو قبول کر لیا ہے، لیکن خدا تعالیٰ تم لوگوں کو نصیحت کرنا چاہتا ہے اس لئے محلم کی نعش کو زمین نے قبول نہیں کیا"

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محلم کی نعش کو پہاڑ کی وادی میں پھنکوا دیا اور اس پر پتھر ڈلوا دیئے (سورۂ نساء، ابن کثیر ج ا ص ۵۲۹، ۲۲۰)

ایک طرف اپنی اُمت پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت کا یہ حال کہ کسی صحابی رضی اللہ عنہ کا مغموم چہرہ آپ سے برداشت نہ ہوتا اور ہر اُمتی کی بے چینی آپ کو بے چین کر دیتی اور دوسری طرف سختی کا یہ عالم کہ ایک مجرم اُمتی کی درخواست معافی ٹھکرا دی جاتی ہے اور ایک غلام کی روتی ہوئی آنکھیں بھی آپ کے دل کو نرم نہیں کرتیں ——— یہ فرق تھا اجتماعی جرائم اور انفرادی گناہوں کا انفرادی گناہوں میں عفو و درگذر کی شان غالب تھی اور اجتماعی اور سماجی جرائم میں سخت گیری کا رویہ تھا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کے حاکموں اور حکمرانوں کو ہدایت کرتے ہوئے نصیحت فرمائی ـــــ اَقِيْمُوْا حُدُوْدَ اللّٰهِ عَلَى الْقَرِيْبِ وَالْبَعِيْدِ وَلَا تَاْخُذْكُمْ فِى اللّٰهِ لَوْمَةُ لَائِمٍ (ابن ماجہ کتاب الحدود) ـــــ "اے حکام وامراء! خدا کے مقرر کردہ قوانین کو دُور اور قریب، رشتہ دار اور اجنبی سب پر یکساں طور پر جاری کرو، اور خدا کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہ کرو۔"

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم ایک بگڑے ہوئے معاشرے کی اصلاح کے لئے تشریف لائے تھے، یہ آپؐ کی اصلاح اور کوششوں کی کرامت تھی کہ جو معاشرہ جرائم کا عادی تھا اور برائیاں اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھیں وہ بہت جلد برائیوں سے پاک ہو گیا۔

چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں چوری، بدکاری اور شراب خواری کے جو چند واقعات ہوئے وہ نہ ہونے کے برابر تھے اور ان واقعات سے بھی یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ آپؐ نے عرب کے معاشرہ میں خوفِ خدا اور خوفِ آخرت کا جذبہ اس قدر بھر دیا تھا کہ کوئی شخص اگر نفسانی خواہش سے مغلوب ہو کر بُرائی کر بیٹھتا تو وہ فوراً بے چین ہو جاتا اور اپنے آپ کو اس بُرائی کے اثر سے پاک کرنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو جاتا اور اپنے اوپر شرعی سزا جاری کرا لیتا۔

اسلام کے تعزیری قوانین کی سختی:

آج کا جدید انسان اسلام کے تعزیری قوانین کو معاذاللہ دورِ وحشت کی یادگار قرار دیتا ہے، چور کا ہاتھ کاٹنا، بدکار کو کوڑے لگانا یا سنگسار کر دینا، شرابی پر کوڑے برسانا وغیرہ یہ سزائیں ان لوگوں کے نزدیک جہالت کے دور میں تو مناسب تھیں، آج اس دورِ تہذیب میں کسی طرح موزوں نہیں ہیں، لیکن اسلام انسانی معاشرہ کو اخلاقی آوارگیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے سخت سے سخت تدابیر اختیار کرنے سے گریز نہیں کرتا، اور اس کا نتیجہ اسلام کا دورِ اوّل پیش کرتا ہے کہ عرب کے بگڑے ہوئے سماج میں چند سزائیں نافذ کر کے اسلام نے لاکھوں انسانوں

کو ہر قسم کی لاقانونیت اور آوارگی سے بچا لیا، اور انسانی معاشرہ چوری بدکاری جوے اور شراب کی لعنت سے محفوظ ہو گیا۔

آج کی مہذب دنیا نے جرائم کی سزاؤں میں تو تخفیف کر دی لیکن پورے معاشرہ کو جس طرح برائیوں کا گہوارہ بنا دیا وہ آنکھوں کے سامنے ہے اور انسانیت اس سے لرزہ براندام ہے۔

عدل و مساوات کے معاملہ میں آسمانی فہمائش قانون بنانے کا حق اسلام میں:

اسلام میں قانون بنانے کا حق صرف خدا تعالیٰ کو حاصل ہے، وہی حاکم حقیقی ہے وہی خالق و مالک ہے، وہی اس قابل ہے کہ اپنی مخلوق کو زندگی بسر کرنے کا صحیح راستہ بتائے۔ قرآنِ کریم نے کہا:

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (سورۂ اعراف رکوع ۷)

"سن لو اسی کا کام ہے پیدا کرنا، اور حکم فرمانا، بڑی برکت والا ہے جو رب ہے سارے جہان کا"

مولانا شبیر احمد عثمانی فرماتے ہیں ——— پیدا کرنا خلق ہے اور پیدا کرنے کے بعد تکوینی یا تشریعی احکام دینا یہ "اَمر" ہے اور دونوں اسی کے قبضۂ و اختیار میں ہیں، اس طرح وہی ساری خوبیوں اور برکتوں کا سرچشمہ ہوا (حمائل شریف ص ۲۰۴)

مولانا احمد سعید صاحب دہلویؒ فرماتے ہیں ——— تخلیق اور حکمرانی کا وہی سزاوار ہے پیدا کرنا اور حاکم ہونا اسی کے لئے خاص ہے اس نے عرش کو تمام امور کی تدبیر کا مرکز اور اجرائے احکام اور حکومت الٰہی کا مظہر مقرر کیا (کشف الرحمان ص ۲۵۰)

تکوینی احکام کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے ہر شئے کو پیدا کیا اور پھر اس کی فطرت میں اس بات کا علم و شعور رکھا کہ وہ کس طرح زندگی گزار سکتی ہے، مرغی کا بچہ انڈے سے نکلتے ہی دوست اور دشمن میں تمیز کرنے لگتا ہے ——— چیل، کوّے کو دیکھ کر ڈرتا ہے اور ——— اپنی ماں (مرغی) کو دیکھ کر اس کے پیچھے دوڑتا ہے، وہ پیدا ہوتے ہی زمین میں سے اپنی خوراک حاصل کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح ہر پرندے اور چرندے میں زندہ رہنے کا یہ فطری شعور دیکھا جا سکتا ہے۔

تشریعی احکام کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو زندگی بسر کرنے کے لئے شریعت کا قانون عطا فرمایا، اعتقاد و عمل کا ایک مکمل نظام دیا جس پر چلنا ہر انسان کے لئے ضروری قرار دیا۔

پس اگر تکوینی ہدایت (فطری شعور) خالقِ عالم کے سوا کسی کی طرف سے نہیں اور نہ یہ قدرت خدا کے سوا کسی کے اندر موجود ہے اور اس سے کسی انسان کو انکار نہیں تو پھر اسے بھی تسلیم کرنا چاہیئے کہ صاحب اختیار مخلوق (انسان) کو اس کی بے اختیار زندگی کے لئے قانون دینے کا حق بھی خدائے واحد کے سوا کسی کو حاصل نہیں اسی بات کا اعلان سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا اور کہا؛ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ (سورہ شعراء : ۷۷ تا ۸۲) ——— "یہ معبودانِ باطل میرے دشمن ہیں، مگر پروردگار سارے جہان کا، جس نے پیدا کیا مجھے اور وہ ہدایت دیتا ہے مجھے، جو کھلاتا ہے اور پلاتا ہے مجھے، اور جب میں بیمار پڑ جاتا ہوں تو وہ شفاء عطا کرتا ہے اور وہی مارتا اور جلاتا ہے اور اسی سے مجھے امید ہے کہ وہ بخشے گا، میری خطا قیامت کے روز۔"

یہی اعلان حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا یٰمُوْسٰی ۝ قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (سورہ طٰہٰ آیت ۵۰، ۵۱) ——— "فرعون نے کہا، اے موسیٰ اور ہارون! تمہارا پروردگار کون ہے، موسیٰؑ نے کہا، وہ ہے جو پیدا کرتا ہے پھر ہدایت دیتا ہے۔"

ان دونوں جلیل القدر رسولوں نے خداوندِ عالم کا تعارف خالقیت اور حاکمیت کی صفاتِ کمال سے کرایا یعنی خدا وہ ہے جو پیدا کرتا ہے اور پھر پیدا کر کے اپنی مخلوق کو یونہی بھٹکتا ہوا اور بے مہار نہیں چھوڑ دیتا بلکہ اسے زندگی کا طریقہ بھی سکھاتا ہے۔ اسی کا نام ہدایت ہے جس کی دو صورتیں ہیں (۱) بے اختیار مخلوق میں تکوینی اور فطری علم و شعور عطا کیا (۲) اور با اختیار مخلوق (انسان) کی زندگی کے با اختیار حصہ کے لئے شریعت کا قانون (وحی الٰہی) عطا فرمایا۔

قانونِ شریعت کی نگرانی خدا کی طرف سے:

پس جب یہ بات ثابت ہے کہ حکومت وفرماں روائی اور قانونِ شریعت بنانے کا حق صرف خدا تعالیٰ کو حاصل ہے تو یہ بات بھی مسلم ہے کہ اپنے قانون کی حفاظت اور قانون پہنچانے والے رسولوں کی کارگذاری پر نظر رکھنے کی ذمہ داری بھی خدا تعالیٰ کے اوپر ہے۔

یہ بات صحیح ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنے جن خاص بندوں (رسولوں) کو اپنے قانونِ شریعت کی تبلیغ و دعوت کے لئے منتخب کیا وہ سب کے سب معصوم اور فکر و عمل کی ہر خطا سے محفوظ تھے البتہ کبھی کبھی ان مقدس رسولوں سے معمولی لغزش سرزد ہو جاتی تھی اور یہ حضرات کسی دینی مصلحت کے پیشِ نظر "بہت اچھے" راستہ کو چھوڑ کر اچھا راستہ کر لیتے تھے اور ان حضرات کا یہی فعل ان کی شان ارفع کے مطابق ان کے حق میں لغزش بن جاتا تھا اور پھر خدا تعالیٰ کی طرف سے ان پر فہمائش نازل ہوتی تھی اور اس فہمائش اور انتباہ کے واقعات رسولوں کی زندگی میں اس لئے پیش آتے تھے تاکہ دُنیا کو یہ بات بتا دی جائے کہ خدا تعالیٰ نے اپنی وحی اور آسمانی قانون کی تبلیغ و حفاظت اور اسے عملی جامہ پہنانے میں کس قدر سخت نگرانی سے کام لیا ہے۔

اس سلسلہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ خطاب بڑا سبق آموز ہے ——— وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ۝ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ۝ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ (سورہ حاقہ رکوع ۲ آیت ۴۴ تا ۴۷)

——— "اور اگر وہ رسول ہماری طرف کوئی بات غلط طور پر منسوب کر دیتے تو ہم انھیں سیدھے ہاتھ (قوت) سے پکڑ لیتے پھر ہم ان کی شہ رگ قطع کر دیتے پس تم میں سے کوئی انھیں بچانیوالا نہ ہوتا۔"

سیاسی اور قانونی انصاف پر فہمائش

بشیر بن ابیرق کا واقعہ:

سورہ نساء رکوع ۱۵ میں بشیر بن ابیرق کی چوری کے واقعہ پر حضرتِ حق نے تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَاۗىِٕنِيْنَ خَصِيْمًا ۙ وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۚ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَھُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ۙ ——— "اے نبی! ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ جو راہِ راست اللہ نے تمہیں دکھائی ہے تم اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو، تم بددیانتی کرنے والوں کی حمایت میں جھگڑنے والے نہ بنو اور اللہ تعالیٰ سے درگذر کی درخواست کرو، وہ بڑا درگذر کرنے والا اور مہربان ہے، جو اپنے نفس کے ساتھ خیانت کرتے ہیں تم ان کی حمایت نہ کرو، اللہ تعالیٰ کو خیانت وال اور گناہ پیشہ انسان پسند نہیں"

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ انصار کے قبیلہ بنی ظفر میں ایک منافق طعمہ یا بشیر بن ابیرق نے رفاعہ بن زید انصاری کی زرہ چرالی اور اسے ایک یہودی کے پاس رکھوادیا، زرہ کے مالک نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس استغاثہ کیا اور بشیر پر اپنا شبہ ظاہر کیا، بشیر اور اس کے خاندان والوں نے چوری کے الزام سے اپنے آپ کو بری ظاہر کرکے اس یہودی کے سر پر الزام تھوپ دیا، یہودی سے معلوم کیا گیا تو اس نے اس چوری سے بے تعلقی ظاہر کی، بشیر کے خاندان والوں نے اپنے آدمی کی زبردست حمایت اور وکالت کرتے ہوئے کہا کہ یہ یہودی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن ہے۔ اس کی بات کا اعتبار نہیں کیا جانا چاہیئے، بلکہ ہم مسلمانوں کی بات کو صحیح سمجھنا چاہیئے۔ ——— سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقدمہ کی روداد کو دیکھ کر بشیر کے خاندان والوں کا اعتبار فرمایا اور اس یہودی کے خلاف فیصلہ کرنے کا ارادہ کرلیا۔

اس پر وحی الٰہی نازل ہوئی اور خدا تعالیٰ کی طرف سے جھوٹ اور سچ کی حقیقت ظاہر کردی گئی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ایک قاضی اور جج کی تھی، جس پر ظاہری واقعات کی بنیاد پر فیصلہ دینے کی ذمہ داری ہوتی ہے، نہ کہ حقیقتِ حال پر کیونکہ حقیقت حال علام الغیوب پروردگار کے سوا دوسرا کوئی نہیں جانتا، اس لئے سرکار اقدس اگر مقدمہ کی روداد پر فیصلہ فرمادیتے تو اس میں آپ کے لئے کوئی گناہ کی بات نہ ہوتی، آخرت کی ذمہ داری تو اس فریق پر عائد ہوتی

جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے غلط روداد پیش کر کے حقیقت کے خلاف فیصلہ حاصل کرتا۔
مگر اس وقت جب کہ حق و باطل کے درمیان زبردست کشمکش برپا تھی اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم رودادِ مقدمہ کے مطابق فیصلہ صادر فرما دیتے تو مخالفین کو اسلام کے خلاف اور ہادیٔ اسلام کے خلاف شور مچانے کا موقع مل جاتا اور وہ لوگ کہتے کہ ہادیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک بے لاگ عدل و انصاف کی کوئی قیمت نہیں، یہ تو طرف داری سے کام لیتے ہیں، اور حق و انصاف کے معاملہ میں بھی مسلمان اور غیر مسلمان کے درمیان تمیز کرتے ہیں۔

خدا تعالیٰ نے اسلام کے خلاف اس پروپیگنڈہ کا سدِ باب کرنے کے لئے بروقت مداخلت فرمائی اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ یہودی بالکل بے قصور ہے اور اصلی مجرم بشیر منافق ہے اور پھر اس کے حمایتی مسلمان ہیں۔

ان آیات میں خدا تعالیٰ نے ان مسلمانوں کی مذمت فرمائی ہے جو قبیلہ اور خاندان کی پیچ کر رہے تھے اور انصاف کے معاملہ میں اپنے اور پرائے کے درمیان تفریق کر رہے تھے۔

آیاتِ کریمہ میں براہِ راست خطاب چونکہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا گیا ہے جس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس مقدمہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجرموں کی حمایت اور بے قصور یہودی کی طرف سے بدگمانی کرنے میں انصاف کے تقاضوں کو نظر انداز کیا اس لئے خدا تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت فہمائش فرمائی۔

حالانکہ اصولی طور پر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جو رویہ اس معاملہ میں اختیار کیا گیا اس میں کسی قسم کی معصیت اور گناہ کا صدور نظر نہیں آتا، آپؐ نے بشیر کے خاندان کی نیک شہرت اور ان کے اسلام کو دیکھ کر ان پر الزام لگانے والوں سے صرف یہ فرمایا:

عمدت الی اهل بیت ذکر منهم اسلام وصلاح ترمیهم بالسرقة علیٰ غیر ثبت ولا بینة (ابن کثیر ج ۱ ص ۴۰۳) —— "تم لوگ ایسے گھرانے پر الزام لگاتے ہو جن کے اسلام اور نیکی کا ذکر کیا جاتا ہے حالانکہ تمہارے پاس نہ ثبوت ہے اور نہ گواہ"۔

اسلام میں کسی مسلمان کے بارے میں حسنِ ظن رکھنا خود ایک بہت بڑی نیکی ہے، آپ کے سامنے بنو ابیرق کے خاندان کی عام نیکیاں تھیں اور اصلی مجرم بشیر کے نفاق کا حال سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوشیدہ تھا، اس لئے چوری کے قانونی ثبوت کے بغیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خاندان والوں پر چوری کا الزام لگانے سے منع کیا۔

خدا تعالیٰ نے حقیقتِ حال کا انکشاف کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بنو ابیرق کی صفائی کرنے اور ان کی حمایت کرنے سے روک دیا اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی الٰہی کے بعد اپنے میلان اور حسنِ ظن کو ختم کر دیا۔

خدا تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو استغفار کرنے کا حکم صرف اتنی سی بات پر دیا کہ حضور کے دل میں اس واقعی مجرم خاندان کی طرف سے نیکی کا یہ میلان بھی کیوں آیا، یہ بات گناہ اور معصیت نہیں صرف مرتبۂ نبوت کے لحاظ سے خلافِ شان ہے۔

خلافِ شان ہونے پر اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دُعاءِ مغفرت کرنے کی ہدایت فرمائی گئی آیات میں خیانت کاروں کی طرفداری اور جھگڑا کرنے سے ممانعت کی گئی ہے، اس ممانعت اور نہی کا مطلب یہ نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اس کا ارتکاب ہوا، کسی فعل سے روکنے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس فعل کا ماضی میں صدور بھی ہوا، بلکہ اس کے معنیٰ یہ ہوتے ہیں کہ اس شخص کو آئندہ کے لئے اس فعل سے روکا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ یہ لوگ مجرم ہیں، اگر آپ اس انکشاف کے بعد بھی ان کی طرفداری کریں گے جیسا کہ آپ سے اس کی اُمید نہیں تو یہ بات غلط ہوگی۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نبی معصوم و محفوظ ہونے کی وجہ سے ہر قسم کے گناہ سے پاک اور بے خطر تھے، پھر آپ کو آئندہ کے لئے بے جا طرفداری کرنے سے حکماً کیوں روکا گیا؟ کیا اس گناہ کا آپ کی طرف سے امکان تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے آپ کی امت کو اس حکم سے آگاہ فرماتا ہے، براہِ راست خطاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوتا ہے اور سنانا مقصود ہوتا ہے

آپؐ کی اُمت کو قرآنِ کریم کا یہ عام اسلوب ہے، جو لوگ اس قرآنی اسلوب سے واقف نہیں وہ طرح طرح کی غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

معاشرتی مساوات کے معاملہ میں فہمائش:

سیاسی انصاف اور قانونی مساوات کے سلسلے میں وحی الٰہی کی نگرانی کا واقعہ آپ نے اوپر پڑھا، اسی طرح ایک واقعہ معاشرتی مساوات کے سلسلہ میں بھی سیرتِ پاک کے اندر موجود ہے۔

تفسیر اور حدیث کی مشہور کتابوں میں سورۂ کہف کی آیت ۲۸ کے شانِ نزول میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ عرب کے بڑے بڑے سردار، اقرع بن حابس تمیمی، علیینہ بن حصن فزاری، عباس بن مرداس سلمی وغیرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپؐ فقراء مہاجرین اور ہمارے درمیان ملاقات کا الگ الگ دن مقرر کر دیجئے، ایک دن ہم آپؐ کے پاس آئیں اور آپؐ کا پیغام سُنیں اور ایک دن وہ لوگ آئیں، کیونکہ بلال، صہیب، سلمان، ابوذر، خباب، عمار، ابوہریرہ (رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ) جیسے غریب اور مفلوک الحال لوگوں کے ساتھ ایک مجلس کے اندر بیٹھنے میں ہم اپنی توہین محسوس کرتے ہیں اور ہمیں ان کے کپڑوں میں سے بدبو آتی ہے۔

شکوا الی النبی التاذی برائحتھم (من اخلاق النبی ص ۱۰۱)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کی شدید خواہش رکھتے تھے کہ یہ مغرور سردار کسی طرح خدا کا پیغام سُنیں، اس شوق و رغبت کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں یہ خیال آیا کہ ان کا یہ مطالبہ منظور کر لیا جائے۔

فاجابھم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رغبۃً فی تقویۃ الاسلام بھم ———

پس آپؐ کے اس رجحان پر خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ آیات نازل ہوگئیں۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (کہف: ۲۸، ۲۹) ——— "اور آپ اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رکھئے

جو صبح و شام اپنے رب کو یاد کرتے ہیں، صرف اس کی خوشنودی کے لئے اور آپ اپنی نظریں ان کو چھوڑ کر اُن پر نہ لگائیے جو دنیا کی زیب و زینت کے طلبگار ہوں اور نہیں آپ ان کا کہنا نہ مانئے جن کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور وہ اپنی خواہش کے پیرو ہیں اور ان کا معاملہ حد سے نکلا ہوا ہے اور آپ کہہ دیں کہ حق خدا کی طرف سے ہے پس جو چاہے اس پر ایمان لائے اور جو چاہے اس کا انکار کرے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رؤسائے قریش کی طرف سے اس قسم کا مطالبہ دو مرتبہ کیا گیا، ایک مرتبہ سورۂ کہف کی مذکورہ آیات نازل ہوئیں اور ایک مرتبہ سورۂ انعام کی آیاتِ ذیل نازل کی گئیں۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (انعام: ۵۲) —— "اور آپؐ ان لوگوں کو دور نہ کیجئے جو رضائے الٰہی کی خاطر اپنے پروردگار کو صبح و شام یاد کرتے ہیں، آپؐ پر ان کے حساب میں سے کچھ نہیں اور ان پر آپؐ کے حساب میں سے کچھ نہیں کہ آپؐ انہیں دور کریں ورنہ آپ زیادتی کرنے والوں میں سے ہو جائیں گے"۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے اس آیت کی تفسیر میں تفسیر و حدیث کی مختلف کتابوں سے شانِ نزول کی روایات نقل کی ہیں، ایک روایت میں یہ ہے کہ رؤسائے مکہ نے حضرت ابو طالب کے ذریعہ یہ مطالبہ کیا تھا اور حضرت عمرؓ نے آپؐ کو مشورہ دیا تھا کہ آپؐ ان کا مطالبہ تسلیم کر کے دیکھ لیجئے کہ یہ لوگ آپؐ کے پاس آتے ہیں یا نہیں؟

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے یہ مطالبہ مان لیا تھا مگر عمل کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی، جب یہ آیات آئیں تو آپؐ نے اپنا ارادہ فسخ کر دیا اور حضرت عمرؓ نے حاضر ہو کر اپنی رائے پر اظہارِ افسوس کیا (بیان القرآن کلاں ج ۳ ص ۸۸ سورۂ انعام)

اسی آیت کے تحت حضرت تھانویؒ نے تبلیغ کی مصلحت پر لکھا ہے کہ —— ان آیات

میں آپؐ کو یہ بتلانا ہے کہ آپؐ کو جو اس درخواست کی منظوری کا خیال ہوا تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کو خاص اہتمام سے تبلیغ ہو جاوے گی سو ایسی خاص تبلیغ معاندین کے لئے بوجہ مفید نہ ہونے کے ضروری نہیں، صرف تبلیغ عام کہ اتمام حجت کے لئے لازم ثبوت ہے کافی ہے۔ (بیان القرآن، حوالۂ بالا)

قریشی سرداروں نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اوپر والا مطالبہ ایک تو اپنے پندار کی تسکین کے لئے کیا اور دوسرا یہ مقصد تھا کہ غریب مسلمانوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فیصلہ سے بددلی پیدا ہوگی اور وہ محسوس کریں گے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مساوات واخوت کا محض دعویٰ کرتے ہیں، آپؐ کا عمل (معاذ اللہ) اپنے خاندانِ قریش کے نسلی غرور کے مطابق ہے ——— لیکن وحی الٰہی نے حضورؐ کو فہمائش کر کے قریش کی سازش کو ناکام بنا دیا۔

کالے اور گورے کے امتیاز پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی:

ابو ذر غفاریؓ کا بیان ہے کہ ایک روز ایک سیاہ رنگ والے صحابیؓ آپؐ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، میں نے ان کو آواز دی ——— یا ابن السوداء ——— ؟ اے سیاہ رنگ والے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہو گئے اور فرمایا ——— طفّ الصاع، طفّ الصاع ——— "پیمانہ پورا بھر، پیمانہ پورا بھر ——— یہ عرب کا ایک محاورہ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو پیمانہ بھر کر دے، سب کو ایک پیمانہ سے دے، کسی کو کم اور کسی کو زیادہ نہ دے، انسان انسان کے درمیان امتیاز نہ کر ——— اور پھر فرمایا ——— لَيْسَ لِابْنِ الْبَيْضَاءِ عَلَى ابْنِ السَّوْدَاءِ فَضْلٌ ——— "کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت نہیں"۔

ابو ذرؓ کہتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تنبیہ سے میں اس قدر شرمندہ ہوا اور مجھ پر اتنا خوف طاری ہوا کہ میں زمین پر لیٹ گیا اور اس شخص سے کہا ——— قُمْ فَطَأْ فَطَأْ عَلَى خَدِّي کھڑا ہو جا اور میرے چہرے کو روند ڈال، میرے منہ کو اپنے قدموں اور پیروں سے مسل دے (احیاء ج ص ۳۰۲) اس منہ سے کیا نکل گیا۔

اس طرح ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مالدار مسلمان کو دیکھا کہ وہ اپنے پاس بیٹھے ہوئے ایک غریب مسلمان سے اپنے کپڑے سمیٹ رہا ہے اور دُور ہٹنے کی کوشش کر رہا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا:

اَخَشِیْتَ اَنْ یَّعْدُوْ اِلَیْكَ فَقْرُهٗ ؟ ——— "کیا تجھے ڈر ہے کہ اس کی غریبی تیرے لپٹ جائے گی ؟"

عبد اللہ ابن ام مکتوم کا واقعہ :

دوسرا واقعہ حضرت عبد اللہ بن ام مکتوم کا ہے ، یہ بزرگ صحابیؓ بھی نادار اور بے کس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے ، ان کا واقعہ یہ پیش آیا کہ جس دور میں قریش کے سردار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قسم کی بات چیت کر رہے تھے کہ ہمارے اور ان غلاموں کے درمیان اوقات کی تقسیم کر دیجیے اسی دوران ایک روز قریش کے یہ سردار آپؐ کی خدمت میں موجود تھے کہ اتفاق سے نابینا صحابی عبد اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے ، انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قریشی سرداروں کے ساتھ گفتگو میں مشغول ہیں ، انھوں نے آکر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آواز دینی شروع کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگوار ہوا کہ اس وقت عبد اللہ نہ آئے ہوتے تو اچھا تھا بس خدا تعالیٰ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بے التفاتی پسند نہ آئی اور سورۂ عبس کی یہ آیات نازل ہوئیں اور ان میں خدا تعالیٰ نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو فہمائش کی

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ؕ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۙ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ——— "اس نے تیوری چڑھائی اور منہ موڑ لیا ، اس بات سے کہ نابینا اس کے پاس آیا ، تمھیں کیا خبر کہ شاید وہ نابینا اپنا تزکیہ کر لیتا یا نصیحت حاصل کرتا اور نصیحت اسے فائدہ پہنچاتی ۔"

وحی الٰہی میں خداوند عالم کی لطیف ناراضگی کا اندازہ دیکھو، پہلے جملے میں غائب کے صیغہ سے خطاب فرمایا، اس نے منہ موڑا ——— کہا، تم نے منہ موڑا نہیں کہا، اس لطیف ناراضگی کے بعد فوراً خطاب کا صیغہ بولا ——— بس اتنی ہی ناراضگی تھی، زیادہ نہیں۔

ان آیات کے آنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم رضی کا بے حد احترام فرماتے، عبداللہ جب آپؐ کی خدمت میں آتے تو آپؐ فرماتے مرحبا بمن عاتبنی فیہ ربّی۔ "آئیے، اے عبداللہ! تمھاری وجہ سے میرے رب نے مجھ پر ناراضگی ظاہر فرمائی"۔

ان واقعات سے معلوم ہوا کہ پیغامِ الٰہی نے عدل وانصاف، مساوات اور غریبوں کی دلداری کے معاملہ میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار کی پوری پوری نگرانی فرمائی اور اسی نگرانی کی وجہ سے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا کردار، مساوات انسانی اور محبتِ خلق کا بے مثال کردار بن گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار میں زہد، قناعت اور ایثار

زہد کا مطلب یہ ہے کہ استعمال کی قوت رکھنے کے باوجود حلال اور مباح چیزوں سے اپنے آپ کو محروم رکھے اور مقصد اپنے نفس کا تزکیہ اور ساتھ ساتھ بندگانِ خدا کو فائدہ پہنچانا ہو۔ زہد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ حلال کو حلال اور مباح کو مباح جان کر اسے چھوڑے اور صرف اپنے نفس کو تکلیف اور اذیت میں مبتلا کرنے کا ارادہ نہ ہو، اگر ایسا ہو گا تو وہ رہبانیت ہوگی، زہد نہ ہوگا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص افلاس اور تنگ دستی کی وجہ سے یا کسی جسمانی عذر کی وجہ سے ترکِ مباح کرے گا تو وہ بھی زہد نہ ہوگا۔

اس وضاحت کے بعد اگر غور کیا جائے گا تو معلوم ہو گا کہ زہد ایک ایسی اخلاقی فضیلت ہے جس میں صبر، قناعت، ایثار، تواضع اور عفت جیسی اخلاقی صفتیں شامل ہوتی ہیں اور ان تمام صفتوں کے جمع ہونے کے بعد ہی "زہد" جیسی اخلاقی صفت انسان میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس میں کمال درجہ کا زہد موجود تھا، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زہد ایک صاحبِ قدرت واستطاعت کا زہد تھا، اس انسان کا زہد تھا جو مباح کے مباح ہونے پر ایمان واعتقاد رکھتا تھا، جو ضرورت مندوں کو اور امت کے اجتماعی مفاد کو اپنی ذات پر ترجیح دیتا تھا اور اسے مقدم رکھتا تھا۔

آپؐ کے زاہدانہ کردار نے سینکڑوں صحابہ کرامؓ کی تربیت فرمائی، آپؐ کے زاہدانہ اخلاق نے ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ وعلیؓ اور دوسرے رفقاء کو اعلیٰ درجہ کے زہد وایثار پر قائم کر دیا اور ایک ایسا معاشرہ پیدا کر دیا جو سادگی، صبر اور قناعت کا بہترین نمونہ پیش کرتا تھا۔

حضرت عمرؓ کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ نے ایک دن اپنے والد عمرؓ سے کہا: "ابا جان! سیاسی فتوحات حاصل ہو رہی ہیں، حکومتوں کے نمائندے اور وفد آپؓ کی خدمت میں حاضر ہوتے

ہیں، آپ نرم و نازک لباس پہنا کریں، اچھے کھانے تیار کرایا کریں، اس میں سے خود بھی کھایا کریں اور بیرونی مہمانوں کو بھی کھلایا کریں، حضرت عمر رضؓ نے فرمایا حفصہ رضؓ! گھر کے آدمی اس گھر کے حالات سے خوب واقف ہوتے ہیں، میں قسم دے کر تجھ سے پوچھتا ہوں کیا تو نہیں جانتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اتنے سال زندہ رہے، اس عرصہ میں آپؐ نے اور آپؐ کے اہلِ بیت نے صبح کا کھانا کھایا تو رات کو بھوکے سوئے اور رات کو کھایا تو صبح کو بھوکے رہے۔

اور کیا تو نہیں جانتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اتنے سال زندہ رہے اور آپؐ نے اور آپؐ کے گھر والوں نے کھجوریں بھی پیٹ بھر کر تناول نہ فرمائیں، یہاں تک کہ خیبر فتح ہو گیا۔

اور کیا تو نہیں جانتی کہ ایک روز تم گھر والوں نے ایک اونچے دستر خوان (میز قسم کی کسی چیز) پر کھانا رکھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگواری ہوئی اور آپؐ کے چہرہ کا رنگ بدل گیا، پھر آپؐ نے حکم دیا کہ کھانا نیچے زمین پر رکھ دیا جائے۔

اور کیا تو نہیں جانتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم چادر کو دوہرا بچھا کر اس پر سویا کرتے تھے اور ایک دن اس کی چار تہیں کر کے بچھا دیا گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس پر سو گئے، پھر جب صبح کو اُٹھے تو آپؐ نے فرمایا، تم گھر والوں نے اس بچھونے کے ذریعہ مجھے قیامِ شب سے روک دیا اسے دوہرا کر کے بچھایا کرو، جیسا اب تک بچھایا کرتی تھیں۔

حضرت عمر رضؓ یہ سوالات کرتے رہے، یہاں تک کہ حضرت حفصہ رضؓ بھی رونے لگیں اور حضرت عمر رضؓ بھی رونے لگے (احیاء العلوم ج ۳ ص ۱۹۲)

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی وہ زہد تھا جس نے اُمت کے غریبوں کو سہارا دیا اور ایک قلیل مدت میں اُمتِ مسلمہ تنگی کے دور سے نکل کر خوش حالی کے دور میں داخل ہو گئی۔

تمت بالخیر

منتخب 112 استنباطی مضامین قرآن (بحوالہ آیات، سورۃ)

میں سے چند اہم عنوانات کی جھلکیاں

اسلام کا نظامِ اعتقادات ☆ اسلام کا نظامِ عبادات ☆ اسلام کا نظامِ نظافت ☆ اسلام میں سنت رسول اللہ ﷺ کی تشریعی حیثیت وعظمت ☆ اسلام میں نظریہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا حقیقت آمیز تجزیہ ☆ اسلام کا نظامِ امن ☆ قرآنی حقائق کا تاریخ سے موازنہ چہ معنی دارد؟ ☆ اسلام، عقل اور سائنس ☆ اسلام میں نظریہ رؤیتِ ہلال اور سائنسی استدلالات ☆ وحی رسالت اور وحی بمعنی الہام والقاء کے متعلق شرعی حقیقت ☆ اسلام کا نظامِ محنت ☆ اسلام کا نظامِ معیشت اور طبقاتی نظام (موازنہ) ☆ نظریاتی وتہذیبی اختلاف کے فکری نتائج ☆ اسلام میں حقوق نسواں ☆ عالمی معاشی وباء (سودی نظام) ☆ معاملات کے لین دین کا قانونی نظام ☆ بین المذاہب مکالمہ ☆ فرقہ واریت کی اُصولی بحث ☆ اسلام کا نظامِ عفت وپاکدامنی ☆ اسلام کا نظامِ میراث ☆ اسلام کا نظامِ تجارت اور اس کے رہنما اُصول ☆ احکامِ دین کا عملی وقانونی نفاذ ☆ عزیمت اور رخصت کا حکیمانہ اُسلوب ☆ وکالتِ باطلہ وصیحہ ☆ اسلام میں نظامِ عدل وانصاف مع نظامِ شہادت ☆ حلال وحرام اور نظریہ شریعت ☆ مشروط امن معاہدے اور اسلام کی دفاعی وخارجہ پالیسی ☆ فلسفہ انقلابِ احوال ☆ جامعیت قرآن کی ہمہ جہتی حقیقت ☆ حکمت اور موعظہ حسنہ ☆ اسلام کا اخلاقی نظام ☆ اسلام کا نظامِ حکومت ☆ اختلاف رائے او رآزادی رائے ☆ نظریہ جہاد اور اس کی حکمت مع حدود وقیود ☆ عورت کی حکمرانی کے خلاف پہلی احتجاجی آواز ☆ قواعد واُصول وقتی نہیں ہوتے ☆ اسلام اور تربیت اولاد ☆ اسلام اور نظریہ تعلیم وفن ☆ ناموس رسالت ، آداب، محبّت وعشق رسول ﷺ ☆ اسلام کا نظامِ طلاق ☆ اسلام اور سماجی خدمات ☆ اسلام اور حقوق العباد ☆ بیعت ، تزکیہ نفس اور اصلاحی حقائق ☆ شریعت وطریقت ☆ کونسی جماعت برحق ہے؟ ☆ آدابِ معاشرہ کے اخلاقیاتی پہلو ☆ تحقیقِ حالات کا شرعی نظام ☆ تقلیدِ محمود کی آسان فہم حقیقت ☆ اسلام اور باقی مذاہب کا تقابلی جائزہ ☆ باطنی اعتبار سے عذابِ الٰہی کی بدترین قسم ☆ نظامِ حدود وتعزیرات ☆ نظامِ فطرت کے خدائی اُصول اور عقلیات کے بے لگام گھوڑے ☆ بحر وبر میں سبب فساد کا تجزیہ برحق ☆ فلسفہ عزت وذلت وغیرہ